

جولائی 2012

ماہنامہ  
دیرین

اس شمارے کے ساتھ  
کون کتاب

امید رمضان مبارک

PDFBOOKSFREE.PK





جولائی 2012

جلد 35 شمارہ 4

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ:

کرن

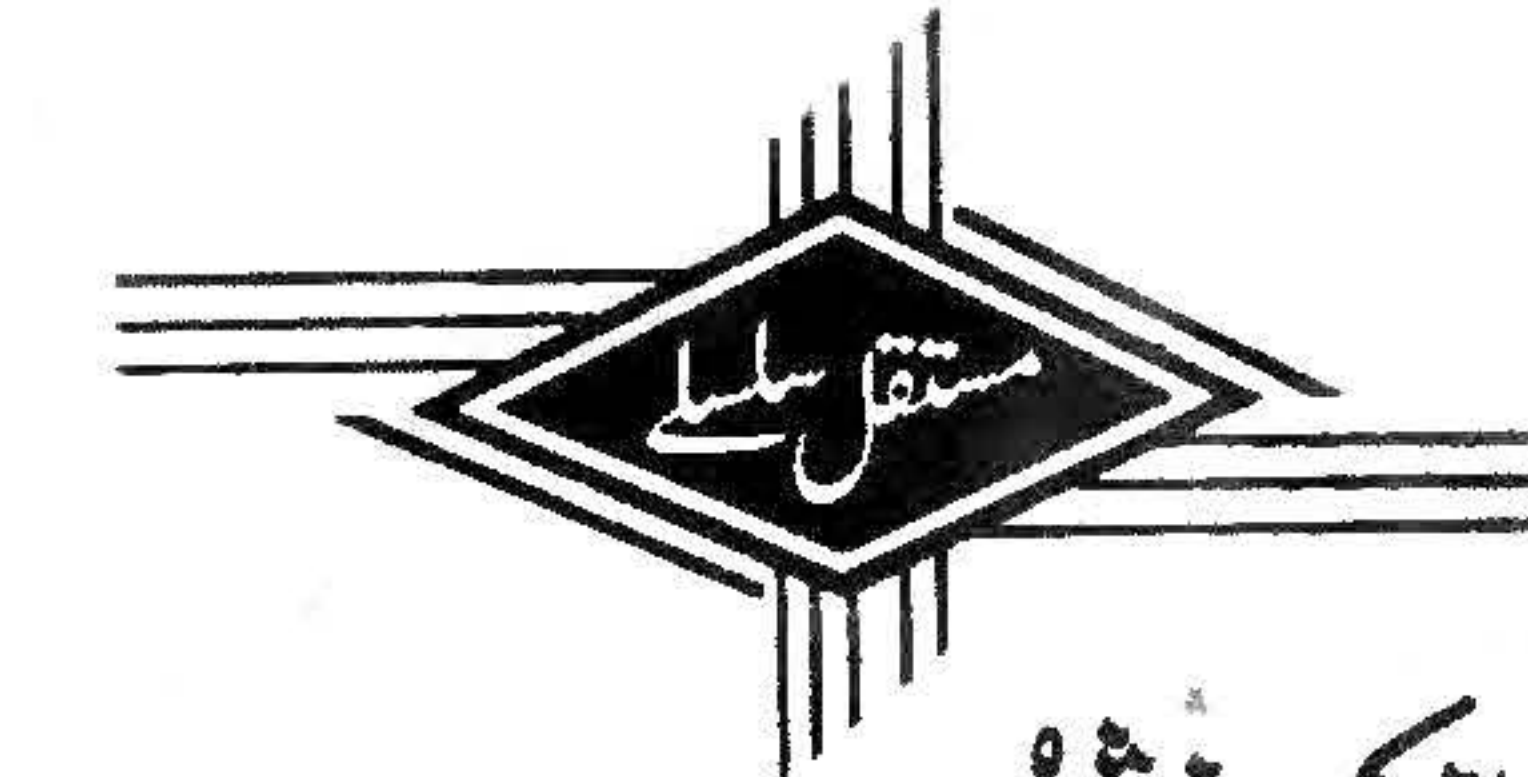
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



- کرن کرن خوشبو، شعاع عمیر 271  
یاد دل کے دیکھے سے بشری محمود 275  
مجھے شعر لکھ دینا شگفتہ سلیمان 277  
مُسکراتی کرتی ریحانہ امجد بخاری 279  
کرن کا دسترخوان خالد جیلانی 282  
حسن و صحت اداریہ 30  
نہلے پہ درہلا ذوالقورین 284  
نامے میسر نامہ مدیرہ کرن 286



- میں نیا تھم ساگر فرح بخاری 66  
اک پل قیصلے کا فرحین اظفر 144

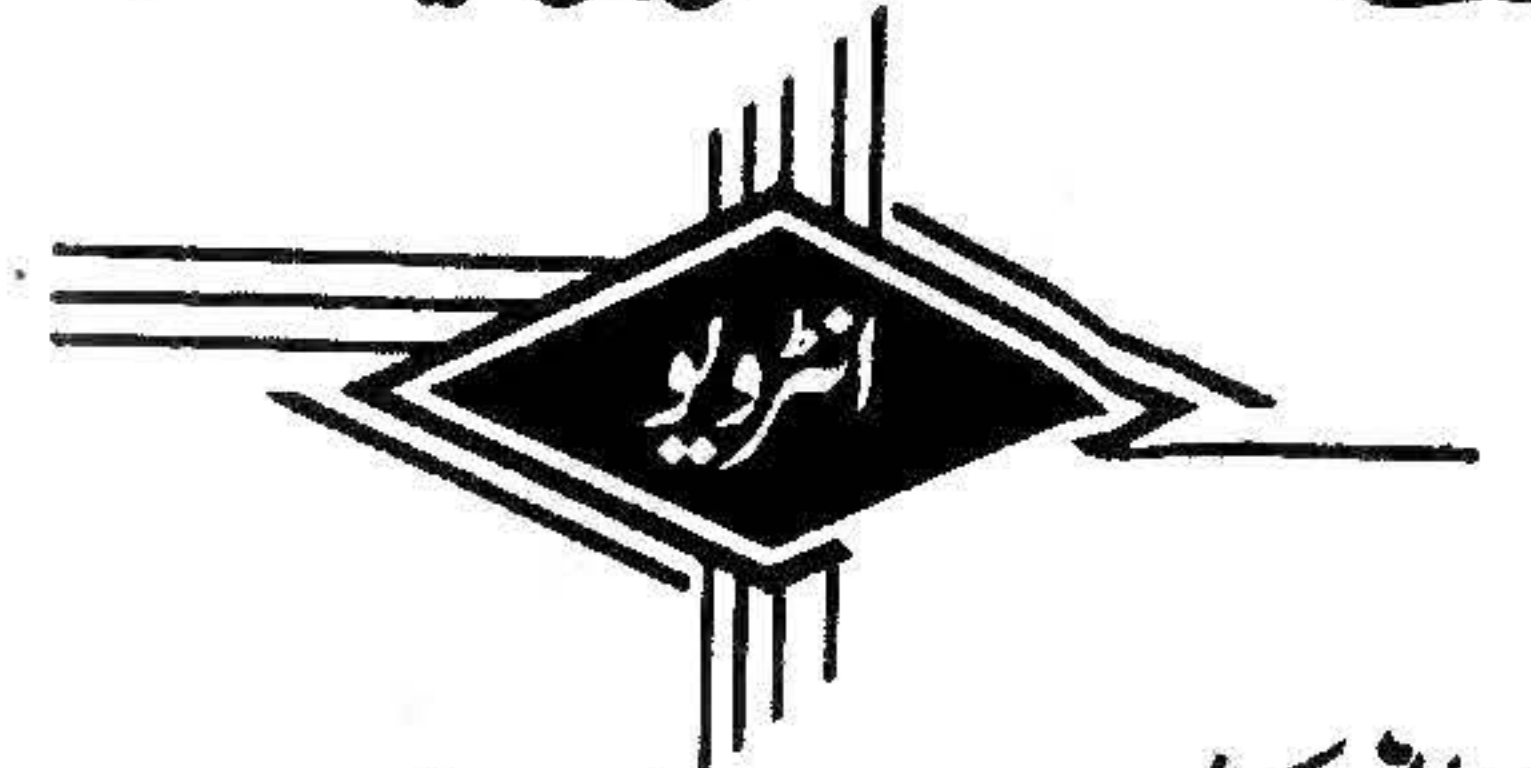


- وہ اک پری ہے ریحانہ امجد بخاری 110  
بھول ماہوش گل 182  
وقامیری ضد فرحت شوکت 212



- مڈثر کے بابا بشری احمد 58  
حسابِ عمر عبیدہ گل 138  
فسانہ محبت نمرہ انوار 127  
اعتبار ذات شازیہ جمال نیر 104  
کسک صائمہ خان 204

حمد  
نعت  
عبدالحمید ظہان 11  
رونق حیات 11



- خالد النعم شاین رشید 12  
دو کیا بہار سبرین ہسبانی 16  
آواز کی دنیا متہاج علی 20  
مجھ سے ملیے انیلا کرن 26



- دستِ کوزہ گر فوزیہ یاسمین 252  
درِ دل نبیدہ عزیز 32



ذرا سا لالہ بیکینے ریگسٹری

پاکستان (سالانہ) --- 600 روپے  
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 5000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

ماہنامہ خواتین و انجمن اور ادارہ خواتین و انجمن کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



جولائی کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ خالق کائنات نے ہر شے کو کسی نہ کسی مقصد سے تخلیق کیا ہے اور انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی کو صحیح گزارنا ہی کارنامہ نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ زندگی کو اپنے پسندیدہ انداز میں اس کامیابی اور خوبی کے ساتھ گزاریں کہ آپ کے بعد آنے والے آپ کے نعوش پا سے نشان منسل پائیں۔ اگر اپنی زندگی میں فتح و کامرانی کے آرزو مند ہیں اور ایک یا مقصد زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ آپ پر غم ہوں۔ ہمیشہ روشن پہلوؤں پر نظر رکھیں۔ کامیابی خندہ روی سے مشروط ہے۔ زندگی پیچھے کی طرف نہیں چلتی اور نہ ہی گزرتے ہوئے دن کے لیے رکتی ہے۔ سفر، مسلسل سفر، انتھک جدوجہد اور تخت زندگی کی راہ کے وہ سنگ میل ہیں۔ جن کے ذریعے آپ کامیاب زندگی تک پہنچ سکتے ہیں۔ زندگی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے غلصانہ کوشش کریں اور یاد رکھیں اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اور بامقصد زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

### اس شمارے میں،

- ، اداکار ”خالد انعم“ سے شایین رشیدی ملاقات،
  - ، اداکار ”سبرین اہسانی“ دو کے پہاڑے کے ساتھ،
  - ، آواز کی دنیا سے ”آر جے“ منہاج علی عسکری کی باتیں،
  - ، ”مجھ سے ملے“ میں مصنفہ ”انیلا کن“ سے ملاقات،
  - ، ”دست کوڑہ کر“ فوزیہ یاسین کا سلسلے وار ناول،
  - ، ”درد دل“ نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
  - ، ”میں ندیا تم ساگر“ فرح بخاری کا دلچسپ ناول،
  - ، ”اک پل فیصلے کا“ فرحین اظہر کا ناول،
  - ، ”وفا میری ضد“ فرحت شوکت کا ناول،
  - ، ”وہ اک پری ہے“ ریحانہ امجد بخاری کا دلچسپ ناول،
  - ، ”بھول“ ماہوش گل کا ناول،
  - ، بشری احمد، عبیرہ گل، نمرہ انوار، شانزیہ جمال فیر اور صائمہ خان کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- منقبت،  
کرن کتاب ”آمد رمضان المبارک“ ہر شمارے کے ساتھ منقبت موصول کریں۔

ہر وقت کس کی یاد ہے کس کا خیال ہے  
تجھ پر عیاں ہے سب جو مرے دل کا حال ہے

دیوانہ کوئی اس طرح محو جمال ہے  
دستِ طلب دداز نلب پر سوال ہے

عشرِ پانہ کر دے کہیں میرا شوق دید  
اب انتظارِ یومِ قیامت مجال ہے

نازاں ہوں تیری شانِ کریم ہی پہ اے کریم  
عذر گناہ پیش کر دوں کیا مجال ہے

دیتا ہے نیک و بد کو بلا امتیازِ رزق  
تیری طرح عطا بھی تری بے مثال ہے

یاد بگرے نہ آپ کی نظروں سے آدمی  
گر کہ بلند یوں سے سنبھلنا محال ہے

میں اس لیے حنیف پرستارِ حق ہوں  
ہر آئینے میں آئینہ گر کا جمال ہے

عبدالحنیف خان حنیف

جب ان کے روضے کے دیوار و در کو دیکھتے ہیں  
تو عکس و آئینہ، آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

سفر کو جب بھی نکلتے ہیں ہم، مدینے کے  
تو خوشبوؤں میں بسی رہ گزر کو دیکھتے ہیں

قدم قدم پہ ہم اس جلوہ گاہِ رحمت میں  
نظر کو، نور کو، دل کو، جسگر کو دیکھتے ہیں

زمین و آسماں، آقا، خدا، شبِ معراج  
رفاقوں کے ستارے سفر کو دیکھتے ہیں

وہ ایک نور ہے ایسا کہ جس کے آگے ہم  
بجھے بجھے شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

حضورِ گھر میں ہمارے کچھ اس طرح آئے  
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

فراقِ طیبہ میں یہ حال ہے کہ ہم رونق  
شکستہ دل تو کبھی چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

رواقِ حیات



# خالد النعم سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ زندگی میں کتنی ہی کامیابیاں حاصل کر لیں ان کی پہچان ان کا وہ پہلا کام ہی ہوتا ہے جس نے انہیں شہرت دی ہوئی ہے تو خالد النعم ایک کامیاب اداکار، گلوکار اور آر جے ہیں مگر ان کو دیکھتے ہی ان کا گانا ”پیرا ہو“ کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔ ان سے ہوئی گفتگو نذر قارئین ہے۔

★ ”کیسے ہیں خالد النعم صاحب؟“

★ ”الحمد للہ۔“

★ ”آپ کو مختلف پروگراموں میں ڈراموں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ مگر کبھی آپ کو سُر میں دیکھا نہیں کیا میوزک سے ناراضی ہے آپ کی؟“

★ ”اسے آپ میری برائی کہہ لیں یا اچھائی۔ میں

یکسانیت سے گھبرا جاتا ہوں۔ میوزک کے لیے میں نے کافی کام کیا۔ خود بھی گایا۔ مگر پھر ایک وقت آیا کہ دل چاہا کہ کچھ اور کرنا چاہیے۔ بس تو پھر کچھ اور کرنے کو دل چاہا تو اسے کم کر دیا مکمل طور پر چھوڑا نہیں۔“

★ ”میوزک چھوڑنے کی چیز کہاں ہے یہ تو روح میں اتر جانے والی چیز ہے؟“

★ ”بالکل ٹھیک کہا آپ نے“ اسی لیے تو میں اپنا یہ شوق ریڈیو کے پروگرام میں اپنے سامعین کو خوب صورت میوزک سنوا کر پورا کر لیتا ہوں۔“

★ ”آپ کے سننے والے عموماً“ کس قسم کی میوزک پسند کرتے ہیں یا پھر آپ اپنی مرضی سے میوزک کا انتخاب کرتے ہیں؟“



★ ”میوزک تو وہ ہی اچھا ہوتا ہے جو کانوں میں رس گھول دے خواہ وہ آج کے زمانے کا ہو یا گزرے زمانے کا۔ ویسے مجھے تو گزرے زمانے کی موسیقی زیادہ متاثر کرتی ہے اور میں اپنے پروگرام میں اس موسیقی کا پورا بیک گراؤنڈ بھی بتاتا ہوں۔“

★ ”لوگ کیا رسپانس دیتے ہیں؟“

★ ”بہت اچھا۔۔۔ فون کالز کے ذریعے جو کہ عموماً“ لائیو ہی ہوتی ہیں۔ پھر ای میلز، ٹیکسٹ بک۔۔۔ تعریف کرنے والے اور پسند کرنے والے اپنا رسپانس کسی نہ کسی طریقے سے دے ہی دیتے ہیں۔“

★ ”آپ کو لوگ ٹی وی کے حوالے سے زیادہ جانتے ہیں۔ تو پہلے اس پر بات کرتے ہیں کہ آپ ٹی وی پر یا شووز میں کیسے آئے؟“

★ ”میں نے اپنے فنی سفر کا آغاز تھیٹر سے کیا اور وہ بھی اس زمانے کی معصوف فنکارہ یاسمین اسماعیل کی وجہ سے اور یاسمین اسماعیل (مرحومہ) سے ملاقات گوئے انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی تھی جہاں میں اپنے دوستوں کے ساتھ کسی کام سے گیا تھا۔ تو انہوں نے مجھے ایک انگریزی ڈرامے میں اداکاری کی پیشکش کی جو کہ میں نے قبول کر لی۔“

★ ”تو کیا وہ آپ کو جانتی تھیں؟“

★ ”جانتی اس طرح تھیں کہ میں اس زمانے میں جنگل وغیرہ گایا کرتا تھا تو اس حوالے سے وہ مجھے جانتی تھیں لیکن جب ملاقات ہوئی تو نا صرف میں نے ان کے ڈراموں میں کام کیا بلکہ ان کے اسٹیج کے لیے بہت سے گانے گائے۔ اور کمپوز بھی کیے اور انہی کی حوصلہ افزائی سے پھر مزید کام کرنے کو بھی دل چاہتا تھا۔“

★ ”کیسے انکشاف ہوا اپنی صلاحیتوں کا؟“

★ ”اپنی صلاحیتوں کا خود کہاں انکشاف ہوتا ہے یہ احساس تو دوسرے ہی دلاتے ہیں۔ میرے اساتذہ اور میرے دوست بتاتے رہتے تھے کہ تم یہ بھی کر سکتے ہو۔ وہ بھی کر سکتے ہو تو بس پھر کرتا چلا گیا اور راہیں کھلتی چلی



گئیں۔ میری تربیت میں اگر میرے والدین کا ہاتھ ہے تو میرے اساتذہ کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔“

★ ”مگر اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب اساتذہ میں پہلے جیسی محبت کہاں رہی ہے؟“

★ ”اگر اساتذہ پہلے جیسے نہیں ہیں تو طالب علم بھی تو پہلے جیسے نہیں رہے۔ پہلے تو طالب علم اساتذہ کی آواز سے ڈرتے تھے ان کا احترام کرتے تھے، مگر اب ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“

★ ”آپ کے ہم عصر میں کون کون ہیں جنہوں نے بہت شہرت پائی ہو؟“

★ ”میرے ہم عصر میں تقریباً“ سارے ہی لوگوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ جب میں نے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں تو وہاں مصباح الحق، ساجد حسن، مظہر عباس، عامر محمود اور شازیہ سکندر بھی زیر تعلیم تھے اور سب سے ہماری کافی اچھی پہلو ہائے ہو گئی تھی۔ آج آپ دیکھیں کہ سب لوگ کتنے اعلیٰ مقام پر ہیں اور پاکستان کے حوالے سے پوری دنیا میں کتنی شہرت ہے سب کی۔“

★ ”اس فیلڈ میں آپ پلاننگ کے ساتھ آئے کیا؟“

★ ”نہیں۔۔۔ میں نے پلاننگ تو کچھ اور کی تھی۔ مگر ملتا ہی ہے جو قسمت میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مجھے نیوی میں جانے کا شوق تھا اور میٹرک کے بعد میں نے کیڈٹ کالج پٹارو سے انٹر کیا اور نیوی میں جانے کے لیے ISSB کا امتحان بھی پاس کر لیا اور بس منزل



قریب ہی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ میری زندگی کا ایک ایسا حادثہ تھا کہ میرا زندگی سے ہی دل اجاٹ ہو گیا تھا۔ بس پھر میں نے نیوی میں جانے کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال ہی دیا اور گریجویشن کے بعد جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔

★ ”نیوی میں جانا چاہتے تھے مگر جرنلزم میں ماسٹرز کرنا پڑا“ قسمت پر یقین تو سو فیصد ہو گیا ہو گا؟

★ ”بالکل سو فیصد قسمت پر یقین ہے لیکن چونکہ ہمیں نہیں پتا کہ ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اس لیے ہمیں تو محنت کرنی ہے اور اس چیز کو پانا ہے جو اللہ نے ہمارے نصیب میں لکھ دی ہے۔“

★ ”بات ادھوری رہ گئی تھی صلاحیتوں کے حوالے سے پھر آگے۔“ بڑھنے کے مواقع آپ کو کیسے ملے؟

★ ”بڑھنے کے مواقع کچھ اس طرح ملے کہ جب تھپڑ میں کام کرنا شروع کیا تو بیوی کے کچھ اور لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ٹینا ثانی، ساحرہ کاظمی اور علی حیدر وغیرہ شامل تھے تو بس پھر تعلقات بنتے گئے اور ہم آگے بڑھتے رہے۔“

★ ”ڈراموں میں بھی انہی کے حوالے سے آئے؟“

★ ”حوالہ آپ اس طرح کہہ سکتی ہیں کہ سب سے بہت اچھی ہیلو ہائے ہو گئی تھی۔ شہزاد خلیل کا اس زمانے میں بہت نام تھا ان کے ڈراموں میں کام کرنا بڑے اعزاز کی بات ہوتی تھی اور جب انہوں نے مجھے اپنے ڈرامہ سیریل ”حساس“ میں کام کرنے کے لیے کہا تو میں بہت خوش ہوا تھا۔ انہی کے ڈرامے میں میں نے گانا بھی گایا۔ ساحرہ کاظمی، سلطانہ صدیقی کے لیے بہت کام کیا گانے گائے بھی اور کمپوز بھی کیے اس زمانے میں جاوید اللہ دتہ بہت کام کر رہے تھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔“

★ ”بچوں کے لیے بھی تو آپ نے بہت کام کیا؟“

★ ”بے شک بچوں کے لیے بھی کافی کام کیا ان کے لیے گانے گائے بھی اور کمپوز بھی کیے۔ تو اس فیلڈ میں میں شروع سے ہی بہت اکیٹو ہوں۔“

★ ”جس دور لی آپ بات کر رہے ہیں اس زمانے میں میڈیا آمدنی کا اتنا اچھا ذریعہ نہیں تھا۔ آپ کے ساتھ کیا سلسلہ تھا؟“

★ ”ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے ہمیشہ اچھا ہی بے کیا ہے۔ میں نے کالج لائف میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لیے کام شروع کر دیا تھا تو مجھے یاد ہے کہ جب میں نے پہلا جنکل گایا تو مجھے 800 روپے ملے اور یہ بات ہے غالباً 1977ء کی یا 78ء کی اور میرے خیال میں اس دور کے حساب سے بہت مناسب معاوضہ تھا اور مجھے یاد ہے کہ جب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو تقریباً 25 ہزار کمالیتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے مالی طور پر کبھی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔“

★ ”آپ نے شووز کے ہر شعبے میں قسمت آزمائی کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی دی۔ آپ کو خود کہاں اچھا لگا کام کر کے؟“

★ ”مجھے؟ مجھے ہر جگہ کام کر کے اچھا لگا کیونکہ میں اسی جگہ پر کام کرتا ہوں جہاں مجھے مزا آتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر میں موازنہ کروں تو چچ کہوں گا کہ مجھے تھپڑ میں کام کر کے بہت مزا آیا اور آتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں ہم اپنی بات براہ راست کہہ سکتے ہیں اور براہ راست رسپانس حاصل کر لیتے ہیں۔“

★ ”کیا تھپڑ آج بھی مقبول ہے؟“

★ ”بالکل ہے۔۔۔ اچھا تھپڑ آج بھی مقبول ہے۔ لوگوں کو ہمیشہ اچھی چیز چاہیے ہوتی ہے اور انہیں جہاں چیز ملتی ہے وہ اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ تھپڑ کو جاننے اور سمجھنے والے ہمیشہ اچھے تھپڑ کے خواہش مند رہتے ہیں اور جب ہم انہیں اچھا تھپڑ مہیا کرتے ہیں تو وہ شوق سے دیکھتے ہیں۔“

★ ”ریڈیو بھی آپ کے شوق کا حصہ رہا اور ہے۔ اس طرف کیسے آئے؟“

★ ”میرے دوستوں نے مجھے ایف ایم 107 جوائن کرنے کو کہا اور میں نے ایف ایم جوائن کر لیا۔ میوزک ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ سو مجھے

ایف ایم جوائن کرے بہت مزا آیا۔“

★ ”آپ تو بیوی اور تھپڑ سے وابستہ رہے اور ہیں۔ آپ کو ریڈیو میں مشکل تو پیش نہیں آئی ہوگی؟“

★ ”ایسی بات نہیں۔ جو بھی شعبہ پہلی مرتبہ جوائن کیا جائے وہ مشکل لگتا ہے اور پھر ریڈیو تو ایسا میڈیا ہے کہ سارا اکیل ہی آواز کا ہے۔ آواز سے متاثر کرنا اور تاثرات قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کامیابی دی۔۔۔ اور ریڈیو آر جے بننے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ کے پاس ہر طرح کی معلومات ہوں تاکہ آپ اسے اپنے سامعین کے ساتھ شیئر کر سکیں۔“

★ ”ہمارے اپنے ملک کی میوزک بہت عمدہ ہے اور ہمارا پڑوسی ملک بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایف ایم پہ اپنے میوزک کی بجائے انڈین میوزک کو ترجیح دیتے ہیں؟“

★ ”جس قدر انہیں تسلیم کرنا چاہیے ہماری میوزک کو ہمارے شعراء کو وہ نہیں کرتے اور ہر چیز میں ہماری نقل کرتے ہیں۔ ہماری میوزک میں تو انہوں نے مادام نور جہاں اور مہدی حسن کے گانوں کی بہت کاپی کی۔ اور جہاں تک ہماری بات ہے تو میں تو اپنے پروگرام میں یہی کوشش کرتا ہوں کہ اپنی ہی میوزک کو ترجیح دوں اور دیتا بھی ہوں اور سب کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

★ ”کچھ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے؟“

★ ”میں 29 مئی 1960ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا تعلق مدرا سے جبکہ میری والدہ کا تعلق سیالکوٹ کی کشمیری فیملی سے تھا۔ قیام پاکستان سے قبل والد صاحب انگریز آرمی میں انجینئری پوسٹ میں تھے اور قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاک آرمی کو جوائن کر لیا تھا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بھائی اور تین بہنیں اور میں اپنے بہن بھائیوں میں آخری نمبر پر ہوں۔ میرے والد جن کا نام محمد عبدالانعم تھا انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان کشمیر میں جاب کر لی تھی۔“

★ ”آخری اولاد تو والدین کو سب سے زیادہ پیاری

ہوتی ہے۔ آپ ہی لاڈلے رہے ہوں گے؟“

★ ”بالکل لاڈلا رہا اور ابھی تک اپنے بہن بھائیوں کا لاڈلا ہوں۔ والدین کے انتقال کے میرے بڑے بھائی نے بالکل اس طرح میرا خیال رکھا جس طرح کوئی اپنی اولاد کا رکھتا ہے۔“

★ ”تربیت میں والدین کا کتنا ہاتھ رہا؟“

★ ”والدین ہی کا تو ہاتھ ہوتا ہے جب تک وہ حیات ہوتے ہیں اور میرے والدین نے بھی میری بہت اچھے انداز میں تربیت کی۔ مجھے پڑھنے کا شوق اور مذہب سے لگاؤ اپنے والدین سے ہی ملا۔ میری والدہ قرآن پاک کی تلاوت بہت خوب صورت انداز میں کرتی تھیں تو جب ان کی تلاوت کانوں تک پہنچتی تھی تو بہت اچھا لگتا تھا۔ پھر میں نے بھی کم عمری میں ترجمے کے ساتھ قرآن پاک پڑھا۔ اور والدین کی وفات کے بعد بھائی نے بہت ساتھ دیا بلکہ سب بہنوں اور بھائیوں نے بہت پیار محبت دیا۔“

★ ”آج کل میڈیا پہ بہت تنقید ہو رہی ہے کہ یہ اپنا کام ٹھیک طور پر نہیں کر رہا آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟“

★ ”مجھے نیوز میڈیا سے کچھ گلے شکوے ہیں کہ یہ اپنا کام ٹھیک طور پر نہیں کر رہا۔ پاکستان کن شعبوں میں کم ہے۔ کیا برائیاں ہیں انہیں تو بہت نمایاں کیا جاتا ہے اور یہ اچھی بات بھی ہے لیکن کن شعبوں میں وہ ترقی کر رہا ہے یا اس میں کیا اچھائیاں ہیں اس کو کوئی نہیں بتاتا۔ تو اچھائی برائی دونوں کے بارے میں بتانا چاہیے۔ بہت سے لوگ بہت اچھا کام بھی کر رہے ہیں۔“

★ ”زندگی میں کیا کھویا کیا پایا؟“

★ ”اللہ کا شکر ہے کہ میں نے زندگی میں بہت کچھ پایا ہے اور زندگی میں لوگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور آج تک سیکھ رہا ہوں۔ مجھے ہمیشہ بہت اچھے لوگوں کا ساتھ ملا سب سے پہلے میرے والدین، میرے اساتذہ، میری بیوی، میرے دوست احباب، میرے ادبی دوست میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔



## سب سے ہسبانی

### شاہین کشید

جیلس میں اس لیے نہیں ہوتی کہ سب کو اللہ تعالیٰ اس کی قسمت کے مطابق ہی عطا کرتا ہے۔

4 ”دو تاریخی ادوار جس میں آپ جانا چاہتی ہیں؟“

○ ”میں جانا چاہتی ہوں مرزا غالب کے زمانے میں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میرے جسم میں پرانی روح ہے اور میں اس زمانے میں تھوڑی سی ان فٹ ہوں اس لیے مجھے پرانے دور میں ہونا چاہیے اور مجھے انگریزوں کا بھی پرانا دور بہت اچھا لگتا ہے ان کی پرانی موزیز مجھے بہت متاثر کرتی ہیں ان کے لباس ان کا رہن سہن اور ان کا فیملی سسٹم جو کہ اب میرے خیال میں ان کے یہاں نہیں رہا۔ بہت اچھا لگتا ہے۔“

5 ”کوئی دو افراد جن کے ایس ایم ایس کے جواب آپ فوراً دیتی ہیں؟“

○ ”ایس ایم ایس بہت کم کرتی ہوں اور گھر سے کسی کا بھی ایس ایم ایس آئے فوراً جواب دیتی ہوں۔“

6 ”کوئی دو بری عادتیں جن سے آپ نجات چاہتی ہیں؟“

○ ”مجھ میں فیصلہ کی قوت بہت کم ہے اس سے نجات چاہتی ہوں اور کوئی بھی کام مسلسل نہیں کر سکتی۔“

7 ”دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتی ہیں؟“

○ ”جھوٹ نہیں بولتی۔ یہ میری اچھی عادت ہے۔“

8 ”اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر آپ کو غصہ آتا ہے؟“

○ ”اکثر میری امی مجھے کہتی ہیں کہ کاش تم میری بڑی بیٹی ہوتی تو شاید میری پوزیشن کچھ اور ہوتی مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے اور دو سری یہ کہ گھر میں کوئی اونچ نیچ ہو جائے کوئی لڑائی



1 ”اگر آپ کو خود اپنا نام رکھنے کا اختیار ہوتا تو کون سے دو نام رکھیں؟“

○ ”جو میرے والدین نے رکھا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔“ سب سے ”نام مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور تک نیم ہے ”صبا“ اور ”صبا“ بھی مجھے بہت پسند ہے۔“

2 ”آپ کے دو لکھی نمبر؟“

○ ”10 اور 9۔ دس ستمبر میری ڈیٹ آف برتھ ہے اور چونکہ یہ نواں مہینہ ہے اس لیے مجھے 10 اور 9 پسند ہیں۔“

3 ”دو باتیں جو آپ کو دوسروں میں ممتاز کرتی ہیں؟“

○ ”سافٹ اسپونگن ہوں اور جیلس نہیں ہوتی کسی سے مجھے نرم لہجے میں بات کرنا اچھا لگتا ہے اور

جھگڑا ہو جائے تو میں خاموش بیٹھی رہتی ہوں اور گھر والے کہتے ہیں کہ یہ تو ”دیوار“ ہے اس کو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔“

9 ”حالات حاضرہ کے دو اینکوز جو سفارش سے آئے ہیں آپ کے خیال میں؟“

○ فقہہ ”مسئلہ یہ ہے کہ مجھے نام نہیں آتے۔ شکلیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس لیے آپ کو کیسے بتاؤں کہ کون ہیں۔“

10 ”مارنگ شو کے دو بہترین اینکوز؟“

○ ”ہمیشہ سے ”نادیہ خان“ پسند ہیں اور فرح حسین جو اسے لی وی پہ آتی ہیں۔“

11 ”دو شخصیات جن پر آپ بھروسہ کر سکتی ہیں؟“

○ ”صنم بلوچ میری بہن۔۔۔ اور میری امی۔“

12 ”دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ ونیا گھومنا چاہتی ہیں؟“

○ ”صنم بلوچ کے ساتھ اور اپنی امی کے ساتھ۔“

13 ”دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر آپ کو رشک آتا ہے؟“

○ ”شاہ رخ خان۔ اتنا نام پیدا کرنا بغیر کسی کی سپورٹ کے اتنا آگے تک جانا بڑی بات ہے اور ایسا بھ بچن۔“

14 ”دو تہوار جو اہتمام سے مناتی ہیں؟“

○ ”عید اور گھر میں کسی کی برتھ ڈے ہو تو۔“

15 ”دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟“

○ ”صبح تو اٹھتی نہیں اس لیے بھول ہی گئی ہوں کہ صبح کیسی ہوتی ہے شام کا ٹائم اچھا لگتا ہے اور پھر رات کا۔“

16 ”پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتی ہیں؟“

○ ”السلام علیکم کیسی/کیسے ہیں آپ۔“

17 ”دو کھانے جن کو کھا کر کبھی بور نہیں ہوتیں؟“

○ ”دال چاول اور چاول۔“

18 ”دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس



نہیں کرتیں؟“

○ ”اپنے فرینڈز سے اور گھر کے افراد سے۔“

19 ”دو خواہشات جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں؟“

○ ”گھر بنانے کی خواہش وہ بھی اپنے پیسوں سے اور گاڑی چلائی نہیں آتی۔“

20 ”دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے کرکٹ دیکھتی ہیں؟“

○ ”میں کرکٹ میچ دیکھتی ہی نہیں اس لیے نام بھی نہیں پتا۔“

21 ”دو چیزیں جنہیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟“

○ ”فون اور اسے لی ایم کارڈ۔“

22 ”دو الفاظ جو بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟“

○ ”Seriously اور ارے واہ۔“

23 ”دو پسندیدہ صحافی؟“

○ ”کوئی نہیں۔“

24 ”سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟“

○ ”اتوار جو کہ چھٹی کا دن ہوتا ہے اور پیر کیونکہ کام نہ جانا ہوتا ہے۔“

25 ”بارہ مہینوں میں سے کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟“



○ ”فروری۔۔۔ دسمبر۔“  
 26 ”اپنے گھر میں دوپسندیدہ جگہیں؟“  
 ”میرا اپنا کمرہ اور بس اپنا ہی کمرہ کبھی کبھی ڈرائیونگ روم بھی اچھا لگتا ہے۔“  
 27 ”گھر کے دو کام جن کو نہ کرنے سے گھر والوں سے ڈانٹ پڑتی ہے؟“  
 ○ ”گھر کے کام نہیں کرتی۔ نوکروں کو لک آفر نہ کروں تو امی سے ڈانٹ پڑتی ہے۔“  
 28 ”دو ایسی شخصیات جن پر کسی قسم کا شک نہیں کر سکتیں؟“  
 ○ ”صنم بلوچ اور اپنی امی۔“  
 29 ”دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟“  
 ○ ”سارے بوجھ ہیں۔ آپ دو کی بات نہ کریں۔“  
 30 ”کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟“  
 ○ ”ملائیشیا اور اندونیشیا جو کہ ہم سے بہت آگے ہیں۔“  
 31 ”کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟“  
 ○ ”کالا اور سفید۔“  
 32 ”اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟“  
 ○ ”اسلام آباد اور کراچی۔“  
 33 ”اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو آپ کیا دو چیزیں لیں گی؟“  
 ○ ”مطلب چوری کرنا چاہوں گی۔۔۔ نہیں کچھ نہیں بلکہ میں بھی سو جاؤں گی۔“  
 34 ”کن دو تاریخی شخصیات سے ملنے کی خواہش ہے؟“  
 ○ ”مدرثریسا اور نیلسن منڈیلا۔“  
 35 ”لوگوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟“  
 ○ ”ٹائم ضائع نہ کریں لڑکیوں کے پیچھے اور پردھائی میں دھیان دیں۔“  
 36 ”سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟“  
 ○ ”بہار اور بارش۔“  
 37 ”لوگوں کی دو نا پسندیدہ باتیں یا عادتیں؟“  
 ○ ”زیادہ تر لڑکے لڑکیوں کو بلیک میل کرتے ہیں

اور وہ لڑکے برے لگتے ہیں جو لڑکیوں کی کمائی پر چلتے ہیں اور جب کوئی بوائے فرینڈ اپنی گرل فرینڈ کو کھانے لے جائے اور بل لڑکی پے کرے تو بہت ہی غلط حرکت ہے۔ میری فرینڈ کے ساتھ ایسا ہوا اور میں نے اس کو کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ جو تار کماروں اسے شرم نہ آئی تم سے بل پے کراتے ہوئے۔“  
 38 ”صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتی ہیں؟“  
 ○ ”پانی پیتی ہوں اور سیل فون چیک کرتی ہوں۔“  
 39 ”دو مرد جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟“  
 ○ ”کوئی بھی نہیں کہوں گی تو غلط ہو گا۔ میرے دونوں بھائیوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ اگر وہ منع کرتے یا حوصلہ افزائی نہ کرتے تو ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔“  
 40 ”آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت ترین مرد؟“  
 ○ ”اس پر کبھی غور سے سوچا نہیں نہ کسی کو غور سے دیکھا ہے۔“  
 41 ”دو پسندیدہ پروفیشن؟“  
 ○ ”لیجننگ اگر میں ٹیچر ہوتی تو بہت اچھی ٹیچر ہوتی اور ایکٹنگ، مطلب شو بزنس فیلڈ۔“  
 42 ”دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟“  
 ○ ”نیلسن منڈیلا اور ملائیشیا کے مہاتیر محمد۔“  
 43 ”دو چیزیں جن پر آپ بہت خرچ کرتی ہیں؟“  
 ○ ”پرفیومز اور جوتے ٹیگز۔“  
 44 ”اپنے دو ڈرامے جن کو فراموش نہیں کر سکتیں؟“  
 ○ ”میری ادھوری محبت اور ”بالی“ جو کہ سندھی تھا اور پہلا تھا جس نے شہرت دی۔“  
 45 ”دو کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟“  
 ○ ”تھر کی عورت کا کردار میں کرنا چاہتی تھی اور ”سجھا“ میں مجھے موقع ملا۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔“  
 46 ”دو قیمتی چیزیں جو آپ خریدنا چاہتی ہیں؟“  
 ○ ”گھر اور بس گھر۔“  
 47 ”دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟“

○ ”سارے ہی غلط ثابت ہوئے ہیں۔“ تقبہ  
 48 ”کن دو باتوں سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں؟“  
 ○ ”اسکیڈ لائز ہونے سے اور کوشش کرتی ہوں کہ کسی کو مجھ سے کوئی پریشانی نہ ہو۔“  
 49 ”پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتی ہیں؟“  
 ○ ”مغرب اور عصر کو شش کر رہی ہوں کہ پانچوں وقت کی پڑھوں۔“  
 50 ”دو افراد جن پر بہت خرچ کرتی ہیں؟“  
 ○ ”امی پر اور چھوٹی بہن اور اپنے بھانجے پر۔“  
 51 ”دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟“  
 ○ ”نہیں کوئی نہیں۔“  
 52 ”کن دو لوگوں کی تعریف میں کبھو سے کام نہیں لیتیں؟“  
 ○ ”میں سب کی تعریف کرتی ہوں اور جن کی بات نہیں پسند آتی ان کی تعریف نہیں کرتی۔“  
 53 ”دو پسندیدہ مشروب؟“  
 ○ ”پانی جب میں پانی پیتی ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ پتا نہیں تم کون سا لذیذ مشروب پی رہی ہو اس وقت ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم بھی پانی اور صرف پانی۔“  
 54 ”دھنک کے سات رنگوں میں آپ کے دو پسندیدہ رنگ؟“  
 ○ ”رنگ سارے ہی اچھے ہوتے ہیں۔“  
 55 ”آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟“  
 ○ ”راحت فتح علی اور سنیڈی چوہان۔“  
 56 ”دو باتیں جن سے آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے؟“  
 ○ ”ٹائم پے کھانا نہ بنا ہوا ہو اور جب وقت پر کام شروع نہ ہو اور بہت زیادہ انتظار کرنا پڑے۔“  
 57 ”شادی کی دو رسمیں جو انجوائے کرتی ہیں؟“  
 ○ ”سندھ کی حماری رسمیں پسند ہیں اور سب انجوائے کرتی ہوں۔“  
 58 ”افسروں کی میں کن دو لوگوں کے ساتھ دیکھ بائنا

اچھا لگتا ہے؟“  
 ○ ”کسی کے ساتھ نہیں کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔“  
 59 ”اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟“  
 ○ ”دھلا ہوا اور برابر استری کیا ہوا۔“  
 60 ”کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتی ہیں؟“  
 ○ ”گھر والوں کے ساتھ۔“  
 61 ”کن دو کپڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“  
 ○ ”سارے کپڑوں سے ڈر لگتا ہے۔“  
 62 ”دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟“  
 ○ ”باربی کیو ٹوائیٹ اور کوئل۔“  
 63 ”اپنے ملک کے دو پسندیدہ شاپنگ مال؟“  
 ○ ”پارک ٹاور اور فورم۔“  
 64 ”دو چیزیں جو آپ شوق سے دیکھتی ہیں؟“  
 ○ ”ڈرامہ اور سماء سما اس لیے دیکھتی ہوں کہ صنم بلوچ مارننگ شو کر رہی ہے۔“  
 65 ”دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتی ہیں؟“  
 ○ ”کہ میں فیصلے کر سکوں اور مزید ڈراموں میں کام کروں۔“  
 66 ”کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟“  
 ○ ”کھانے پینے کی بہت زیادہ شوقین نہیں ہوں۔ بس برابر سالن روٹی ہونی چاہیے۔“  
 67 ”کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟“  
 ○ ”میرا بس چلے تو سب سیاست دانوں کو اغوا کر کے سب سے پیسے وصول کر کے قومی خزانے کو بھروں۔“  
 ☆ ☆



## منہاج علی عسکری

شاہین رشید



آواز کی دنیا ایک بہت ہی وسیع دنیا ہے اور جو بھی اس دنیا سے وابستہ ہوتا ہے وہ وہاں وہاں سنا جاتا ہے جہاں جہاں اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ FM کے آرجے اب اسی طرح مقبول ہیں جس طرح ٹی وی کے لوگ اور پھر آواز کی دنیا سے وابستہ لوگ اب صرف ریڈیو تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ٹی وی میں بھی اپنا ٹیلنٹ دکھا رہے ہیں۔

منہاج علی عسکری جو کہ ایف ایم 105 سے وابستہ ہیں تا صرف آواز کا جادو جگا رہے ہیں بلکہ آپ انہیں مختلف ڈراموں میں بھی پر فارم کرتا ہوا دیکھ رہے ہوں گے۔ ان سے کچھ گفتگو ہوئی۔ جو یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔

★ ”کیسے ہیں منہاج علی عسکری صاحب؟“

★ ”جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“

★ ”کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟“

★ ”میرے والد صاحب کا تعلق لکھنؤ سے اور والدہ کا تعلق امرتسار سے ہے جبکہ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق ہندوستان سے ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے کیونکہ میں کراچی میں پیدا ہوا 4 ستمبر 1984ء میری دو بہنیں ہیں اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ میرے والد صاحب حیات نہیں ہیں 2001ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور 2001ء سے لے کر اپنے آپ کو بنانے میں مقام حاصل کرنے میں دن رات ایک کیا ہے اور اللہ کا ساتھ اور والدہ کی دعاؤں سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔“

★ ”2001ء میں والد کا انتقال ہوا اور آپ 1984ء کی پیدائش ہیں تو آپ تو اس وقت کافی چھوٹے ہوں گے تو کافی جدوجہد میں وقت گزرا ہو گا؟“

★ ”جی میں سترہ سال کا تھا جب والد صاحب کا انتقال ہوا۔ دوھیال میں میرا کوئی تھا نہیں۔ میرے ایک تایا تھے جن کا والد سے پہلے انتقال ہو گیا تھا اور ثانی اسلام آباد میں تھیں۔ دادا دادی بھی وفات پا چکے تھے۔ جبکہ میرا ننھیال کافی بڑا ہے۔ میری نو خالائیں ہیں۔ ایک ماموں اور نانائیں بھی حیات تھے۔ ننھیال میں سب نے بہت سپورٹ کیا لیکن میں زیادہ تر اپنے نانائوں کے ساتھ ہی رہا۔ والدہ اگرچہ ہاؤس وائف تھیں لیکن میری تعلیم و تربیت میں ان کا بہت ہاتھ رہا۔“

★ ”اور شادی کب ہوئی؟ پسند سے ہوئی؟“

★ ”میری شادی کو تقریباً تین سال ہو گئے ہیں اور میری پسند سے ہوئی ہماری لومیرج ہے 2002ء میں

شنا سے میری ملاقات ہوئی۔ پھر ملتے ہوئی اور پھر شادی اور الحمد للہ ہم بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔“

★ ”کہتے ہیں کہ لومیرج کامیاب نہیں ہوتی؟“

★ ”الحمد للہ ہماری تو کامیاب ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کافی عرصے سے جانتے ہیں اور ہر ایک کا زندگی گزارنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایک یا دو لومیرج ناکام ہو میں تو ضروری نہیں کہ سب ہی ناکام ہوں۔ میں بہت سی ایسی فیملیز کو بھی جانتا ہوں جن کی ارج میرج بھی مگر ناکام ہو گئی۔“

★ ”ریڈیو ایف ایم میں کب سے ہیں اور کیسے شوق ہوا آپ کو؟“

★ ”کب سے ہوں یہ تو مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے۔ لیکن شوق اس طرح ہوا کہ میرے ایک جاننے والے تھے جو ایک طرح سے ہمارے فیملی فرینڈ تھے وہ ریڈیو پہ کام کرتے تھے۔ ایک دن ان سے میری ملاقات ہوئی اور ان سے میں نے ریڈیو کے حوالے سے اپنے آئیڈیاز شیئر کیے تو کہنے لگے کہ تم ریڈیو آجاؤ اور پروگرام میجر سے اپنے آئیڈیاز شیئر کرو اگر انہیں تمہارے آئیڈیاز پسند آگئے تو تمہیں پروگرام ملنا شروع ہو جائیں گے۔“

مجھے ایف ایم 103 کے پروگرام میجر سے ملنا تھا۔ مگر پھر بات آئی گئی ہو گئی اور میں بھی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ دو ڈھائی مہینے کے بعد مجھے اچانک یہ بات یاد آئی تو میں نے سوچا کہ چلو چلتے ہیں پروگرام میجر کے پاس۔ اس وقت ایف ایم 103 کے پروگرام میجر شہزاد صاحب تھے میں نے ان کو آئیڈیاز دیا ورلڈ میوزک کا اور ورلڈ میوزک میں بھی وہ میوزک جو ہمارے کراچی کی سڑکوں کا میوزک ہے جیسے کوئی بانسری بجا رہا ہے۔ کوئی تان پورہ بجاتا ہوا نظر آتا ہے یا کوئی اک تارہ بجاتا ہوا نظر آتا ہے تو انہیں ریڈیو پہ لے کر آئیں اور ان کا ٹیلنٹ سب کے سامنے لے کر آئیں۔ انہیں یہ آئیڈیاز بہت پسند آیا اور اس کے لیے انہوں نے گوہنڈ دے دیا اور اس میں مجھے خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔



اور مجھے مزید پروگرام ملنے لگے۔“

★ ”اسٹریٹ ٹیلنٹ میں لوگ خود بھی تو آپ کے پاس آنا شروع ہو گئے ہوں گے؟“

★ ”نہیں۔ ایسا نہیں تھا بلکہ ٹیلنٹ میں خود ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ جیسے اگر میں بہادر آباد میں ہوں اور وہاں مجھے کوئی بانسری بجاتا ہوا نظر آتا تھا تو میں اس کو کہہ دیتا تھا کہ بھائی آپ ریڈیو پہ آجا میں۔ تو اس طرح میں ٹیلنٹ کو خود ڈھونڈتا تھا۔ پھر جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ مجھے مزید پروگرام ملنے لگے۔ مگر چھ آٹھ مہینے کے بعد کچھ اختلافات کی وجہ سے میں نے ریڈیو چھوڑ دیا۔ اور نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹ (N.A.P.A) جوائن کر لیا۔ میں اپنے خاندان کا واحد فرد تھا کہ جس نے نپا میں داخلہ لیا کیونکہ ہماری فیملی میں کوئی بھی میڈیا سے وابستہ نہیں تھا اور جب کوئی میڈیا میں نہیں ہوتا تو پھر سب لوگ میڈیا کو برا ہی سمجھتے ہیں۔“

★ ”اچھا۔ پھر تو آپ کو سب نے روکا ہو گا؟“

★ ”بالکل۔ لیکن میری خوبی کہہ لیں یا خامی میں کبھی کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ اسے آپ میری خود غرضی بھی کہہ سکتی ہیں اور میری عقلمندی بھی۔ کہ جو میں کرنا چاہتا ہوں میں وہی کرتا ہوں خواہ وہ غلط ہو یا





ہوتی تھی کہ ہم کسی گراؤنڈ میں جا کر پورا لگاتے تھے یا کہیں جا کر صفائی کرتے تھے یا کہیں جا کر کسی کی مدد کرتے تھے۔ لیکن اب اسکولوں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے بچے واقف نہیں ان باتوں سے اور نہ ہی والدین ایسا کچھ سکھاتے ہیں۔۔۔ ایک طرف تو والد صاحب بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا روڈ پر گندگی نہیں کرنی چاہیے اور دوسری طرف اس کو نصیحت کرتے ہی گاڑی کا شیشہ کھولیں گے اور چیونٹم کا پر پھینک دیں گے۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم بولتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔“

☆ ”ریڈیو کے علاوہ کیا کرتے ہیں“ میرا مطلب ہے کہ ذریعہ معاش کیا ہے اب کا؟“

\* ”میں ایک پروفیشنل آئیڈل ہوں میں نے اداکاری سیکھی ہوئی ہے اور میں اداکاری کرتا ہوں میرے پانچ چھ ڈرامے آن ایئر آچکے ہیں۔ اور آج کل ایک سسٹم کام چل رہا ہے ”لائٹ آن ہے“ اس میں نہ کوئی اسکریپٹ ہوتا ہے نہ ہی ڈائلاگ ہوتے ہیں نہ ہی میں پتا ہوتا ہے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں سب کچھ

فی البدیہہ ہوتا ہے یکم شوال پ کا ہوتا ہے اور ہم اس میں  
یکم کہتے ہیں سب کچھ حاضرین کے سامنے ہو رہا ہوتا  
ہے۔

یہ ہم نے شروع کیا تھا ”پی اے سی سی“ میں اور

وہاں پاکستانی گانے چل رہے ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟  
 — ایسا ممکن نہیں ہے۔ تو جب ریڈیو پاکستان سے  
 انڈین گانے چل رہے ہوں اور پی لی وی سے انڈین  
 موسیقی آرہی ہو تو کتنا عجیب لگے گا۔

اس میں ہمارے اوارے کی بھی غلطی ہے اور ہمارے سننے والوں کی بھی غلطی ہے۔۔۔ ہمارے سننے والے بھی انڈین گانوں کی ہی فرمائش کرتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انڈین میوزک پہ پابندی ہو لیکن ہماری پہلی ترجیح ہماری اپنی میوزک ہونی چاہیے اور خاص طور پر ریڈیو پاکستان سے تو پاکستانی میوزک ہی چلنا چاہیے۔

☆ ”مؤویز تو چلیں ان کی اچھی ہوتی ہی ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میوزک ہماری زیادہ اچھی ہے۔ پھر کیوں ہم انڈین میوزک کو اتنا پسند کرتے ہیں؟“

\* ”پتا ہے مسئلہ کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم سب سپورٹس ہیں ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ ”شیلہ کی جوانی“ کا زبردست گانا ہے اور دوسری طرف ہم کہتے ہیں کہ ویٹا ملک یہ کیا کر رہی ہے۔ یہ بہت بڑی بحث ہے جو بہت سالوں سے چلی آ رہی ہے۔ اور اس طرح کی بحث ساری دنیا میں ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اے لیول کر رہا تھا شی اسکول سے تو ہمارے اسکول میں ہر ہفتے ایک ایکٹیویٹی

میں مختلف ایف ایم کے براڈ کاسٹرز کو مدعو کرنا ہوں۔  
دو پروگرام نیچرے جمعرات اور بدھ کو ہوتے ہیں  
اس میں ہم سامعین کو معلومات دیتے ہیں کہ دنیا میں  
کیا ہو رہا ہے اور ایک شو ہے جو رات کو ایک بجے ہوتا  
ہے ہفتہ کے دن جس کا نام ہے ”لیٹ نائٹ ہو رر شو“  
Late night Horror show اس میں  
لوگ اپنے واقعات سناتے ہیں اور جنات کے بارے  
میں پوری دنیا کے مذاہب میں ذکر ہے اس کے بارے  
میں بتاتے ہیں اور یوٹیوب پہ جو میٹرل ہوتا ہے۔  
جنات پہ جو ریسرچ ہو رہی ہیں اس کے بارے میں  
بتاتے ہیں اور دو گھنٹے کے اس پروگرام میں میوزک بھی  
نہیں ہوتا ہے۔ صرف باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں۔“

☆ ”تو اس کو سننے والے لوگوں کی تعداد ہے؟“  
 \* ”اس کے سننے والے ماشاء اللہ پوری دنیا میں  
 ہیں۔ 50 ملکوں میں یہ سنا جاتا ہے اور کراچی کا تقریباً  
 ہر بندہ یہ پروگرام سنتا ہے۔“

☆ ”ایف ایم کا جب ٹرینڈ چلا تو سب سے پہلا چینل ایف ایم 100 تھا۔ پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ آج کل آپ کے خیال میں سب سے اچھا ایف ایم کون سا ہے؟“

”کوئی بھی اچھا نہیں ہے۔ سب بے کار ہیں۔۔۔“  
وجہ یہ ہے کہ 80 فیصد چینل انڈین گانے چلاتے ہیں  
اور 20 فیصد انگریزی گانے چلاتے ہیں۔ پاکستانی  
ثقافت، پاکستانی گانے اور پاکستان سے متعلق کچھ بھی  
نہیں ہو مائل چینلز پر۔“

☆ ”یعنی آپ کے خیال میں خالصتاً پاکستانی چینل کوئی بھی نہیں ہے۔ تو پھر آپ نے کچھ کیا اس سلسلے میں اور غلطی یہ کون ہے؟“

میں اور ریپہ وں ہے! \* ”جی ہاں خالصتا“ پاکستانی چینل کوئی بھی نہیں ہے۔ بد قسمتی سے ایف ایم 101 جو کہ ریڈیو پاکستان کا چینل ہے وہ بھی نہیں ہے۔ وہاں بھی انڈین گانے چل رہے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی انڈین براؤ کاسٹنگ چینل ہو اور وہاں پاکستانی گانے چل رہے ہوں تو کتنا عجیب لگے گا۔ اس طرح امریکن ریڈیو اسٹیشن ہو اور

صحیح۔ اگر وہ صحیح ہے تو میرے لیے اچھا ہو گا اور اگر غلط ہو گا تو میرے لیے تجربہ ہو گا۔ تو میں اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی ہوں۔۔۔ چونکہ میں بہت کم عمری میں یتیم ہو گیا تھا اس لیے ہمیشہ سے اپنے فیصلے خود کرتا ہوں۔۔۔ لیکن جب میں نے ”نپا“ میں داخلہ لینا تھا تو میں نے اپنے نانا سے جو کہ ریٹائرڈ ایس ایس پی ہیں اور وہ ہندوستان میں بھی پولیس میں تھے اور انہیں اس فیلڈ سے خاصی دلچسپی تھی تو جب میں نے ان کو ایڈمیشن کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بالکل تم اپنا شوق پورا کرو اور تمہیں اپنا ہر شوق پورا کرنا چاہیے۔

پھر میں نے اپنی والدہ کو بتایا انہوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور مجھے پوری طرح سپورٹ کیا۔۔۔  
تین سال بڑھائی کی اور ٹیوشن بڑھا کر اپنا خرچ خود اٹھایا۔۔۔ پھر 105 ایف ایم نے مجھے آفر دی کہ آپ ہمارے یہاں سے پروگرام کریں۔۔۔ اس وقت مجھ پر کچھ پابندیاں تھیں، ادارے والوں نے بھی منع کیا ہوا تھا کہ آپ کو کہیں کام نہیں کرنا۔ لیکن جب ایف ایم 105 سے آفر آئی تو میں نے اپنے ادارے والوں سے اجازت لی اور ایف ایم 105 کو جوائن کر لیا اور آج تک میں ایف ایم 105 میں ہی ہوں اور تپا سے میں نے گریجویشن کی۔“

☆ ”ایف ایم 105 سے آپ کے پروگرام کب کب ہوتے ہیں اور ان کے فارمیٹ کیا ہیں؟“

✽ ”میرا ایک پروگرام رات کو دس بجے سے بارہ بجے تک ہوتا ہے اور یہ شو ریڈیو براؤ کاسٹرز سے ملاقات کا ہوتا ہے اور یہ پیر کے دن ہوتا ہے اس میں ہم مختلف چینلز کے براؤ کاسٹرز کو مدعو کرتے ہیں۔ یہ ہمارے یہاں بڑی بد قسمتی ہے۔ کہ نہ ٹی وی چینل یہ نہ کسی ریڈیو ایف ایم پہ کسی دوسرے چینل کے لوگوں کو نہیں بلا سکتے اور نہ ہی ان کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے یہ بات کبھی بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔ اور اسی یاؤنڈریز کو میں نے اپنے چینل پہ توڑنے کی کوشش کی ہے اور اس میں ادارے کے لوگوں نے میرا ساتھ دیا۔۔۔ اور میں اپنے اس پروگرام



ایک برانڈ کے ساتھ پانچ مختلف چینلز کے لیے کیا  
”لائٹ آن ہے“ کے نام سے اور اب یہ ”جیو“ سے آ رہا  
ہے اور ریڈیو تو چل ہی رہا ہے تو یہ فیلڈ ہی میرا ذریعہ  
معاش ہے۔“

★ ”ریڈیو یہ لائیو پروگرام ہی ہوتے ہیں۔ تو کبھی لائیو  
پروگرام میں کوئی گڑبڑ ہوئی۔ کچھ غلط بول گئے ہوں؟“  
\* ”لائو شو میں دو باتیں ہوتی ہیں Respect کا  
اہلیمنٹ بھی ہوتا ہے اور ایک Funny اہلیمنٹ  
۔۔۔ تو لائیو پروگرام میں کھانسی بھی آجائے تو بہت  
سارے لوگوں کے لیے فنی مومنٹ ہو جاتا ہے۔ لائیو  
شو بہت مزے دار ہوتا ہے اور جو لائیو شو کرے پھر اس  
کو ریکارڈ پروگرام کا مزا نہیں آتا۔۔۔ میرے لیے ریڈیو  
شو کوئی شو نہیں ہے۔ بلکہ ریڈیو میرے لیے ایک ایسی  
جگہ ہے جہاں بیٹھ کر میں اپنے ہزاروں دوستوں سے  
فیملی ممبرز سے باتیں کر رہا ہوں اور ان سے آئیڈیاز  
شیر کر رہا ہوں۔۔۔ ایسے ہی جیسے ڈرائینگ روم میں  
بیٹھ کر ہم آپس میں بات کرتے ہیں۔“

★ ”کم عمری میں والد کے سائے سے محروم ہوئے۔  
جدوجہد بھی کی مزاج یہ اثر پڑا؟“

\* ”مزاج اللہ کا شکر ہے ہمیشہ اچھا ہی رہا۔ کسی کو کبھی  
تکلیف نہیں دی۔ گھر میں فیملی کے ساتھ وقت  
گزارنے کا موقع ذرا کم ہی ملتا ہے کیونکہ مصروفیات  
بہت زیادہ ہوتی ہیں۔۔۔ اور گھر میں میں عموماً خاموش  
رہتا ہوں اور میرے گھر والوں کو مجھ سے شکایت ہے  
کہ میں اتنا خاموش کیوں رہتا ہوں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ  
میں دن میں تقریباً اٹھارہ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ میں صبح  
نوب بجے گھر سے نکلتا ہوں اور میری واپسی رات کے تین  
سے چار بجے تک ہوتی ہے۔۔۔ تو زیادہ وقت تو میرا باہر  
ہی گزرتا ہے۔“

★ ”غصے کے تیز ہیں؟“

\* ”میں بہت فرینڈلی انسان ہوں۔ مجھے غصہ نہیں  
آتا۔۔۔ کوئی ایسا واقعہ ہو جائے کہ جو میری مرضی  
کے خلاف ہو تو پھر غصہ آ جاتا ہے ورنہ نہیں آتا۔“

★ ”زندگی کو کس انداز میں دیکھتے ہیں؟“

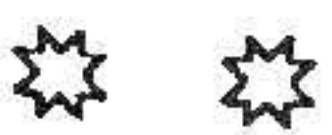
\* ”میری زندگی کے کچھ رولز ہیں نہ میں کسی کو جج  
کرتا ہوں اور نہ ہی میں کسی کو اس بات کی اجازت دیتا  
ہوں کہ وہ مجھے جج کرے۔ ہمارے ہاں بہت آسانی سے  
بول دیا جاتا ہے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس کے پاس  
بہت پیسہ آگیا ہے۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔۔  
اور ہم بہت اچھے ہیں۔ تو میں اپنی بیوی شائلا اپنی والدہ اور  
اپنے بھائی سے یہی کہتا ہوں کہ جو آج کا دن ہے وہ ہمارا  
ہے۔ جو کل تھا وہ بھی ہمارا ہے اور آنے والا کل بھی  
ہمارا ہی ہو گا۔ لیکن اس کے لیے ندیدے ہونے کی  
ضرورت نہیں ہے کہ سب کچھ آج ہی مل جائے اور  
جو کوئی ہمارے لیے بیمار کس دیتا ہے دینے دیں۔  
کیونکہ ہم جو ہیں وہ ہمیں زیادہ بہتر طریقے سے پتا  
ہے۔“

★ ”یہ مقام حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کی یا  
کچھ محنت کی؟“

\* ”آج میں اور میری بیگم شاجس مقام پر ہیں یہ  
ہمیں اس فیلڈ میں آتے ہی نہیں ملا ہم دونوں نے  
محنت کی اور میں نے تو بہت ہی زیادہ محنت اور جدوجہد  
کی ہے اور شائلا نے لڑکی ہونے کے حساب سے محنت کی  
ہے اور میں فخر سے کہوں گا کہ میری بیوی بہت ٹیلنٹڈ  
ہے۔۔۔ تو زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی بہت سہل  
ہے۔ ہم اسے مشکل بنانا چاہیں گے تو یہ مشکل بن  
جائے گی۔“

★ ”اور کچھ کہنا چاہیں گے اس انٹرویو کے حوالے  
سے؟“

\* ”نہیں کچھ نہیں“ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے  
انٹرویو کے قابل سمجھا اور میرا تفصیلی انٹرویو کیا۔  
اس کے ساتھ ہی ہم نے ————— منہاج علی  
عسکری سے اجازت چاہی۔





# محبوب سہیلے

## انیل لکرن

(10) ”بہترین تحفہ میری نظر میں؟“

○ ”کچھ بھی ہو مگر خلوص اور محبت سے دیا گیا ہو۔“

(11) ”ایسی تاریخی شخصیت جس سے میں ملنا

چاہوں؟“

○ ”ممتاز محل اور شاہ جہاں۔“

(12) ”پسندیدہ ساتھی؟“

○ ”زندگی کے ساتھی میرے شوہر علی اشرف۔“

(13) ”پسندیدہ ہستی؟“

○ ”میرے ابو، وہ بلاشبہ دنیا کے بہترین باپ ہیں۔

جنہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کے لیے ہمارے حق

اور اپنے فرض سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ وہ اتنے اچھے

ہیں کہ ان سے زیادہ اچھا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔“

(14) ”پسندیدہ پروفیشن؟“

○ ”مجھے ایڈمنسٹریشن کا کام پسند ہے۔ شعبہ کوئی بھی

ہو۔“

(15) ”بہترین کاوش؟“

○ ”کبھی روشنی، کبھی تیرگی اور اک چراغ ابھی بجھا

نہیں۔“

(16) ”پسندیدہ ملکیت؟“

○ ”میرے سارے اپنے لوگ۔“

(17) ”زندگی کی خواہش؟“

○ ”اپنی ساری خامیوں کو دور کر کے ایک اچھی

انسان اور اچھی مسلمان بن جاؤں۔“

(18) ”پریشان کن لمحہ؟“

○ ”میرے لیے وہ لمحہ پریشان کن ہوتا ہے جب

میں اپنے سے چھوٹوں میں سے کسی کو پریشان دیکھ لوں۔

تب میں خود ان سے بڑھ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔“

(1) تاریخ پیدائش / اشار؟

○ ”23 جنوری / دلو۔“

(2) ”خدا سے تعلق؟“

○ ”بہت قریبی اور دوستانہ۔“

(3) ”فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟“

○ ”باہر گھومنے جانا کوئی اچھی فلم یا ڈرامہ دیکھنا۔“

(4) ”کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟“

○ ”نفاست۔“

(5) ”وہ چیز جو موڈ خراب کر دے؟“

○ ”بلاوجہ کی تنقید اور ایسی گفتگو جو بالکل بے مقصد

ہو۔“

(6) ”مشکل ترین لمحہ؟“

○ ”جب میں نے اپنی پیاری بہن نبیلہ کی وفات کی

خبر سنی۔ اس لمحے کا تصور کر کے آج کئی سال بعد بھی

خوف سے میرے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرے لیے یہ ایسا نقصان تھا۔ جس کی کبھی بھی تلافی

نہیں ہوئی اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔“

(7) ”بہترین تعریف جو وصول کی؟“

○ ”بے شمار ہیں۔ علی کا کہنا کہ تم ایک نعمت ہو اور

پارو کا کہنا کہ تمہارا کاٹا پانی نہیں مانگتا اور تم لاحق ہو

جانے والی چیز ہو۔“

(8) ”وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟“

○ ”فیس بک اور موبائل پر بلا ضرورت میسجنگ۔“

(9) ”زندگی کا خوفناک واقعہ؟“

○ ”جب ٹرین ایکسیڈنٹ میں میری والدہ کی

وفات ہوئی اور میری پھوپھو نے مجھے سوتے سے جگا کر

یہ بتایا کہ میری امی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔“

(19) ”جب موڈ آف ہوتا ہے تو کیا کرتی ہوں؟“

○ ”بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جاتی ہوں۔ کسی سے

بھی بات نہیں کرتی۔“

(20) ”کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ

سکوں؟“

○ ”میرا لالہ وسیم رضا اس کے پاس علم اور زور بیان

دونوں کی بہتات ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی معاملے میں

مجھے لحوں میں قائل کر لیتا ہے۔“

(21) ”فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟“

○ ”جب اچانک سے تبدیل ہو جاتا ہے اور ڈھیروں

نئے لباس بے کار ہو جاتے ہیں۔“

(22) ”انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟“

○ ”جب کسی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی

جائیں اور وہ پوری نہ ہوں۔“

(23) ”کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟“

○ ”مجھے آپ آسانی سے ملکہ جذبات کہہ سکتے

ہیں۔ کیونکہ مجھے ہر دوسری چیز جذباتی کر دیتی ہے۔“

(24) ”زندگی کا یاد گار دن؟“

○ ”میری شادی کا دن (3 مارچ 2012)“

(25) ”موسیقی میرے نزدیک؟“

○ ”روح کی غذا۔“

(26) ”پسندیدہ گانا؟“

○ ”گانوں میں دقت کے ساتھ پسند بدلتی رہتی

ہے۔“

(27) ”پسندیدہ فقرہ؟“

○ ”اگر تم حالات کو تبدیل نہیں کر سکتے تو بہتر ہے کہ

انہیں قبول کر لو۔“

(28) ”پسندیدہ کردار؟“

○ ”میرے خواب ریزہ ریزہ“ کا احسن ایاز اور

”سفال گر“ کا عمر۔“

(29) ”سب سے عزیز اور قیمتی اثاثہ؟“

○ ”میرے جیون ساتھی کی محبت اور توجہ۔“

(30) ”اچھا اور خوب صورت موسم؟“

○ ”بارش کا موسم میری کمزور جگہ ہے۔ سردیوں کی ہویا

گرمیوں کی۔“

(31) ”نا قابل فراموش واقعہ؟“

○ ”ڈیڑھ سال پہلے ہمارے ہمسائے کا اکلوتا اٹھارہ

سال کا بیٹا گھر سے فٹ بال کھیلنے گیا۔ اور گراؤنڈ میں ہی

ہارٹ اٹیک سے اس کی ڈھتھ ہو گئی۔ اس کے بارے

میں جب بھی سوچتی ہوں دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اور اس کے گھر والوں کو صبر

اور سکون دے۔ اکلوتے بیٹے کی یوں اچانک وفات کے

بعد اس کی ماں اور بہنوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی

تھی۔“

(32) ”پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟“

○ ”نا قابل بیان خوشی ہوئی تھی۔“

(33) ”وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟“

## فصل غم کا گوشوارہ

روحانیہ جمیل

قیمت 300/-



○ ”انیس اور بیس ستمبر 2003ء کی درمیانی رات جب میری بہن کی ڈنڈ باڈی گھر میں تھی اور میں اس کے پیروں کے پاس بیٹھی بہت بے بسی سے کہہ رہی تھی ”گرنیا پلینز اٹھ جاؤ تا اس رات کی بے بسی آج پونے نو سال کے بعد بھی میری آنکھوں میں آنسو کے آتی ہے۔“

(34) ”میرا خواب؟“

○ ”بہت سارا اور بہت اچھا لکھ سکوں۔“

(35) ”پسندیدہ مزاج“  
○ ”جس میں گہرائی اور وقار ہو۔ پھلڑپن سے مجھے شدید چڑ ہے۔“

(36) ”خسد محسوس کرتی ہوں؟“  
○ ”بالکل بھی نہیں البتہ نیک اور اچھے لوگوں پر رشک بہت آتا ہے۔“

(37) ”خوشبو پسند ہے تو کیوں؟“  
○ ”بہت پسند ہے اور اس لیے پسند ہے کہ موڈ پر برا خوشگوار اثر مرتب کرتی ہے۔“

(38) ”پسندیدہ خوشبو؟“  
○ ”Estee Lauder Sensuous“  
اور ”White Linen“

(39) ”آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو؟“  
○ ”ہما کوکب بخاری کا ناول ”ماہی ماہی کوک وی میں۔“

(40) ”پسندیدہ جگہ؟“  
○ ”میری زندگی کے پندرہ سال کینٹ ایریا میں گزرے ہیں اس لیے مجھے شہروں سے زیادہ کینٹ کا ماحول پسند ہے۔“

(41) ”وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟“  
○ ”زیادہ چھٹیاں ہوں تو مری یا شمالی علاقہ جات اور اگر ایک ہی ہو تو بس اتنا ہو جائے کہ ڈنر کہیں باہر کیا جائے۔“

(42) ”میری قوت ارادی؟“  
○ ”کافی اچھی ہے۔ جس کام کو کرنے کی ٹھان لوں اسے کر کے ہی چھوڑتی ہوں۔“

(43) ”گھر کا پسندیدہ کمرہ؟“

○ ”میرا بیڈ روم۔“

(44) ”کیا پسند کرنا پسند کرتی ہوں لباس میں؟“

○ ”شلوار قمیص مگر جدید اسٹائل کی ہو اس کے علاوہ فراک ایئر لائن اور ٹراؤزر۔“

(45) ”پسندیدہ رنگ؟“

○ ”سفید گلابی کالا۔“

(46) ”پسندیدہ مصنف؟“

○ ”نسیم حجازی، شکیل عادل زادہ، کاشف زبیر، مریم کے خان اور بشری سعید۔“

(47) ”پسندیدہ شاعر؟“

○ ”فیض احمد فیض، ابن انشاء، احمد فراز اور جون ایلیا۔“

(48) ”ویران سنسان جزیرے پر پہلا کام کیا کروں گی؟“

○ ”میں اتنی بہادر نہیں ہوں کہ ویران سنسان جزیرے پر اکیلی پہنچ کر بھی اپنے حواسوں میں ہی رہوں میرا تو خیال ہے کہ اگر ایسا ہوا تو یا تو میں فوت ہو جاؤں گی یا مجھے سکتہ ہو جائے گا اور دونوں صورتوں میں مجھے کرنا تو کچھ بھی نہیں پڑے گا۔“

(49) ”خود اپنی بری عادت؟“  
○ ”کئی ہیں۔ غصہ زیادہ آتا ہے، جلد باز ہوں اور ناراض بہت جلد ہو جاتی ہوں۔“

(50) ”کھانے کی پسندیدہ جگہ؟“  
○ ”Exotica سلور اسپون اور حمید پلس۔“

(51) ”مگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟“  
○ ”لکھنا میرا شوق ہے۔ اگر میں مصنفہ نہ بھی ہوتی تو بھی کسی نہ کسی تخلیقی کام سے ضرور وابستہ ہوتی۔ شاید شاعرہ ہوتی یا مصورہ۔“

(52) ”ایک لفظ جو مجھے واضح کر دے؟“  
○ ”پر خلوص۔“

(53) ”جنس مخالف کے بارے میں رائے؟“  
○ ”بیشتر خواتین کی طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں اپنی توانائیاں ضائع نہیں کرتے اور غیبتیں

کرنے کے شوقین نہیں ہوتے۔“

(54) ”محبت کے بارے میں خیال؟“

○ ”کائنات کی سب سے خوب صورت چیز ہے۔“  
(55) ”پسندیدہ رشتہ؟“

○ ”میاں بیوی کا۔ کیونکہ سب سے قریبی رشتہ یہی ہوتا ہے جس میں ایک دوسرے سے سب کچھ شیئر کیا جاسکتا ہے۔“

(56) ”اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟“

○ ”اگر کی سے کیا مراد ہے۔ میں اپنے سے وابستہ سبھی لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں اور نتیجہ ہمیشہ اچھا ہی نکلتا ہے جب آپ کسی کو محبت دیتے ہیں تو جواب میں آپ کو بھی محبت ملتی ہے۔ جو زندگی کو خوشگوار بناتی ہے۔“

(57) ”پسندیدہ لواستوری؟“

○ ”ہر وہ لواستوری جس کا انجام اچھا ہو۔“

(58) ”کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟“

○ ”تھری ایڈیش، کبھی خوشی کبھی غم اور دل غ۔“  
(59) ”پھرے کچھ بتاتے ہیں؟“

○ ”بہت کچھ بس چروں کو پڑھنے والی نظر ہونی چاہیے۔“  
(60) ”شاعری کے بارے میں خیال؟“

○ ”دل سے نکلے ہوئے لفظ جو سیدھے دل پر اثر کرتے ہیں۔“  
(61) ”میری جستجو، میری کھوج؟“

○ ”کوئی ایسا اسم اعظم مل جائے جو دنیا سے نفرت اور بے گانگی کو مٹا دے اور ہر طرف محبت کا بول بالا کر دے۔“

(62) ”بہترین کامیابی؟“

○ ”ہر لحاظ سے بہترین چون ساتھی کا ساتھ اور گزٹڈ آفیسر کی جاب۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ دونوں چیزیں مجھے میری خواہش سے بھی بڑھ کر ملی ہیں۔“

(63) ”وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟“  
○ ”دعا کر کے یا صدقہ دے کر۔“

(64) ”سائنس کی بہترین ایجاد؟“

○ ”کمپیوٹر اور موبائل فون۔“

(65) ”بدترین ایجاد؟“

○ ”ہرجان لیوا، ہتھیار۔“

(66) ”ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟“

○ ”میری بہن نبیلہ شریف۔ میں نے زندگی میں اس کی اتنی کمی محسوس کی ہے کہ بیان کرنے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔“

(67) ”بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟“  
○ ”قرآنی آیات کی تلاوت کرتی ہوں اور پانی پیتی ہوں۔“

(68) ”ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟“

○ ”کانٹے بو کر کبھی پھول نہیں کھلتے۔“

(69) ”زندگی کا خوب صورت ترین دن؟“

○ ”بہت سارے ہیں۔ میری شادی کا دن، وہ دن جب لالہ سوڈن سے واپس آیا اور جس دن میری بھتیجی عائشہ پیدا ہوئی۔“

(70) ”قارئین کے لیے پیغام؟“

○ ”آپ لوگوں کی محبت ایک قیمتی سرمایے کی طرح ہے۔ آپ کی گئی تعریف جہاں سیروں خون بر بھاتی ہے۔ وہیں مثبت انداز سے کی گئی تنقید ہمیں بطور لکھاری اپنی خامیوں کو دور کرنے میں مدد دیتی ہے مگر پلیز تنقید برائے تنقید نہ کیا کریں، کیونکہ لکھاری بھی انسان ہوتا ہے اور اس کا بھی دل دکھ سکتا ہے۔“

(71) ”کرن کے بارے میں رائے؟“  
○ ”بہترین ڈائجسٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ کرن کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ ☆



# حسن و صحت

ادارہ



لیکن صرف اس وجہ سے کہ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور دن گرم سے گرم تر ہوتے جا رہے ہیں (یا گرمی روز بروز بڑھ رہی ہے) آپ کو تمام وقت گھریا دفتر میں بند ہو کے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ یہاں آپ کو چند مشورے دیے جا رہے ہیں کہ آپ کس طرح اس موسم گرما سے چرنے کے بجائے لطف اندوز ہو سکتی ہیں اور موسم گرما کے مزے اڑا سکتی ہیں۔

لبوں کے ادویاتی بام : ہونٹوں کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے اور اس کے نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لیے آب مزاجم لب بام (پانی روک لب بام) بہترین تریاق ہے۔ اس کی وجہ سے ہونٹ نم رہتے ہیں اور

دھوپ کی شدت اور تمازت سے طویل عرصے تک محفوظ رکھنے کے لیے سودمند بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں — ایسے سکون و تسکین بخش اجزاء شامل ہوتے ہیں کہ جو ہونٹوں کو نرم، ملائم اور چمک دار بنائے رکھنے میں معاونت کرتے ہیں۔

گرمی دانوں اور چھالوں کا علاج : دھوپ میں زیادہ وقت گزارنے اور اس کی شدت حدت اور تمازت کی وجہ سے چہرے اور جسم کے دیگر حصوں پر گرمی دانے اور چھالے نکل آتے ہیں۔ اس لیے یہ بہت ضروری بلکہ لازمی ہے کہ آپ کے پاس ایسی کریمیں اور ادویات دستیاب ہوں جو اس طرح کے غیر متوقع حملوں کا مقابلہ کر سکیں۔ کوئی ایسی دوا منتخب کیجیے کہ جس کا استعمال سہل اور آسان ہو اور وہ چھالوں اور گرمی دانوں کو پھیلنے سے روکتی ہو۔

اور اگر خدا نخواستہ دھوپ میں گھومنے پھرنے سے اور شانے کھلے رکھنے سے (یا غسل آفتابی کی وجہ سے)

آپ خود ”دھوپ جلن“ (Sun Burn) کی شکار ہو گئی ہیں تو ذیل میں چند آزمودہ نسخے اور ٹونکے دیے جا رہے ہیں کہ جن کی مدد سے آپ اس تکلیف دہ اور پریشان کن صورت حال اور بے چینی و بے قراری سے نبت سکتی ہیں اور ان عارضوں کا بہادری سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔

چند ایسے لوشن ہوتے ہیں جو آپ کے مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ خاص طور سے وہ لوشن جن میں ایلویرا کے عریقات (نباتی عرق) شامل ہوتے ہیں۔ ایلویرا پودے میں موجود یہ عریقات معمولی اور ہلکی خارش اور جلن کو مٹاتے ہیں اور جسم کو سکون بخشتے ہیں۔ اس لیے اس لوشن کو دل کھول کے استعمال کیجیے۔ جب آپ کی جلد خشک ہونے لگے تو اس کو دوبارہ لگائیں۔ اس لوشن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے اسے پہلے فریق میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں اور پھر اسے لگائیں۔ اس سے آپ کی جلد کو عارضی طور پر ہی ٹھنڈک، راحت اور سکون ملے گا۔

○ ڈبے میں بند دودھ کی بالائی کو ٹھنڈا کر کے اس میں تھوڑی سی چینی ملا کے جلد پر ملیے۔

○ کچے انڈے کی سفیدی بھی راحت و سکون بخشتی ہے۔

○ اگر کسی بھی وجہ سے آپ کو ”دھوپ جلن“ (Sun Burn) ہو جائے تو گوشش کیجیے کہ آپ سائے میں ہی رہیں اور دھوپ سے جس قدر بھی اجتناب برت سکتی ہوں برتیں۔

○ آپ کا لباس ڈھیلا ڈھالا اور نرم و ملائم ہونا چاہیے کیونکہ اگر آپ کا لباس اس دھوپ جلن یا زخم سے رگڑ کھائے گا تو آپ کی تکلیف میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

آپ کس طرح کا میک اپ کرتی ہیں میک اپ جتنا ہلکا ہو، اتنا ہی بہتر ہے۔ تمام ماہرین آرائش و زیبائش حسن یہی مشورہ دیتے ہیں کہ موسم گرما کا میک اپ ہمیشہ بہت ہلکا ہونا چاہیے۔ ہمیشہ ایک

اچھی لب اسٹک استعمال کیجیے۔ دن کے اوقات میں کوئی فاؤنڈیشن کریم مت استعمال کیجیے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے پسینہ آپ کے چہرے کو داغ دار کر دے گا۔ آنکھوں میں آئی لائنز کے معمولی سے پھرے سے آپ کے چہرے کو عام سا رخ مل جائے گا لیکن یہ بڑا بھرپور دل آویز اور پروقار ہو گا اور میک اپ اتارنے وقت یا صاف کرتے وقت ہمیشہ عمدہ قسم کا، فیس واش استعمال کیجیے۔

مشروبات : موسم گرما میں آپ کا مزاج گرم و سرد ہو سکتا ہے لیکن موسم گرما کے مشروبات کے بارے میں صرف یہ جان لیجیے کہ جب اور جہاں موقع ملے، کسی مشروب کا ایک گھونٹ بھر لیجیے۔ یوں تو بازار میں اعلیٰ قسم کے ٹھنڈے مشروبات اور سوٹ ڈرنکس کی بھی کوئی کمی نہیں ہے کہ جن کی بدولت آپ گرمی کو بھگا سکتی ہیں لیکن گرمی کو بھگانے کے لیے روایتی مشروبات کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ خواہ وہ ستوکا شربت ہو یا ہلکا میٹھا ڈاب (ناریل کا پانی) ہو یا نمکین و میٹھی لسی کا گلاس ہو۔

کیونکہ یہ روایتی اور قدرتی مشروبات صرف پلک جھپکنے میں تیار ہو سکتے ہیں اور ان کی بے شمار اقسام اور ذائقوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے یہ مشروبات عوام الناس میں بے حد مقبول ہیں۔ نیز ان کے نوش کرنے کے لیے دن یا رات یا کسی خاص وقت کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں مصنوعی مشروبات کو عموماً ”شام کو یا رات کو خاص طریقوں اور انداز سے نوش کیا جاتا ہے جبکہ فطری مشروبات کسی خاص طریقے کے پابند نہیں ہیں۔ قدرتی مشروبات میں خوشبو بھی بہت ہلکی ہوتی ہے اس لیے اگر آپ ان کو تیز خوشبودار بنانا چاہیں تو دیگر خوشبوئیں شامل کر سکتی ہیں مثلاً ”سونف“، ”الہچھی“، ”پودینہ“ یا ”اورک“ کی ہوائیاں بھی آپ کے ”ڈاب“ (ناریل کے پانی) یا لسی یا فالسے کے شربت یا تریوز کے شربت کو مزید خوشبودار بنا سکتی ہیں۔



کبھی بار بار نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۲  
بائیسویں باب



نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلنڈ کی رنگینیوں میں مکمل حوریہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنب رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آڈمی ہے، اس نے





یہ کیا مقام تھا اس کی زندگی میں۔  
اس کے ایک طرف بتول شاہ کھڑی تھیں اور ایک طرف علیزے آندی۔  
ایک کی طرف دیکھتا تو مرجاتا ایک کی طرف دیکھتا تو مارتا۔

گویا اذیت اس کے دونوں طرف تھی؟ وہ کچھ کہنے اور کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ فی الحال۔ البتہ ان دونوں کی کیفیات اور تاثرات اس سے بالکل مختلف تھے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے علیزے اجنبی، نا سمجھ اور خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ علیزے کو دیکھتے ہوئے بتول شاہ کی آنکھیں پتھر کی ہو گئی تھیں۔

ان کے چہرے پہ بائیس سال رقم تھے اور ان بائیس سالوں میں ایسا کچھ تھا جس کا کرب ناک احساس زہری طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ علیزے کی دلکش سی صورت ان کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھی اور ان کی پتھر کی سپاٹ آنکھیں جلنے لگی تھیں اور اس جلن سے ان کی آنکھیں — سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ نمکین پانیوں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بچنے، مضبوط قدموں پہ کھڑی وہ صبر و ضبط کے کن مراحل سے گزر رہی تھیں یہ ان کا اللہ جانتا تھا یا پھر دل آور شاہ۔

لیکن اس سے پہلے کہ ان کے صبر کا پیالہ چھلکا اور وہ یہاں بائیس سالوں کی اذیت بچھا دیتیں، انہوں نے ایک بار پھر اپنے اندر کے غضب کو کچلا اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔ یہاں ٹھہرنا ان کے اختیار سے باہر بھی ہو سکتا تھا، جبکہ وہ اپنے اختیار سے باہر نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اس لیے ان کا مڑ جانا ہی بہتر تھا۔ لیکن وہ وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لڑکھڑاسی گئیں۔ وہ کرنے کو تھیں، لیکن بروقت دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

”اماں۔۔۔ دل آور شاہ نے بے ساختہ تڑپ کے پکارا اور یک دم علیزے کا بازو جھٹک کر ان کے پیچھے لپکا۔“  
”اماں۔۔۔ پلیز رکیں۔“ لیکن وہ علیزے آندی کی صورت دیکھنے کا عذاب دل پہ لیے بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں اور دل آور کے پیچھے تک وہ اپنے بیڈ روم میں بند ہو چکی تھیں اور وہ ان کے بیڈ روم تک اگر بھی بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت بتول شاہ پہ کیا گزر رہی تھی وہ سب جانتا تھا۔ اسی لیے وہ دروازے پہ دستک دے کر انہیں مزید تکلیف سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا اور یوں ہی عجیب جھکے جھکے قدموں سے آگراؤنچ کے صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ وہ بند دروازے کے پار بتول شاہ کے گرنے والے آنسو اپنی روح پہ گرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا اور اس کی روح پہ بتول شاہ کے آنسوؤں سے آبلے پڑتے تھے، جن کی تکلیف دل آور شاہ کا رواں رواں تڑپا رہی تھی۔

”گلاب خان۔۔۔ گلاب خان۔“ وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے دھاڑا۔

”جی صاحب! حاضر ہوں۔“ وہ فوراً سامنے آکھڑا ہوا۔

”بند کرو بیسمنٹ کا دروازہ۔ اور تالا ڈال کے چابی کہیں دور پھینک دو۔“ وہ شدت غضب سے کہہ رہا تھا اور گلاب خان کی آنکھیں تیر سے پھیل گئی تھیں۔ لیکن وہ اس کے غصے اور غضب کے پیش نظر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ چابی کہاں پھینکے؟

لیکن پھر بھی گلاب خان دل میں افسوس لیے بیسمنٹ کا دروازہ بند کرنے چلا آیا تھا اور علیزے کے قید خانے کو ایک بار پھر تالا ڈال دیا گیا تھا۔

\*\*\*

”منصور حسین کے ساتھ اس کا چکر آج سے نہیں بہت پہلے سے چل رہا تھا۔“ کومل کے زہر خند لہجے پہ آذر

نے اک جھٹکے سے سراٹھا کر دیکھا تھا اور کومل کا دل ٹھنڈک سے بھر گیا تھا۔

”کومل۔۔۔! شمر ویکم نے بیٹی کو سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھا۔

”منصوری مئی۔۔۔! یہ صرف میرے منہ کی بات نہیں ہے۔ اس کا ایک منظر تو عائشہ پھوپھو بھی دیکھ چکی ہیں۔“  
کومل نے سب کے چونکنے اور دیکھنے پہ بڑے سکون سے عائشہ آندی کی سمت دیکھا جو بڑی جوتی کی بربادی پہ ماتم کناں سی بیٹھی تھیں اور وقار آندی کو ملنے والے دکھ اور اذیت پر رو رو کر آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔

”بھائیے نا پھوپھو۔۔۔! وہ منظر جب مری میں ایک روز فجر کے وقت محترمہ علیزے بی بی کو اپنے ڈرامیور منصور حسین کے بیڈ روم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ علیزے نے وہ رات منصور حسین کے بیڈ روم میں ہی گزاری تھی۔ کیونکہ ہمیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔“ کومل نے جیسے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن عائشہ آندی کا ذہن پے در پے ملنے والے جھٹکوں کی وجہ سے ٹھکانے پہ نہیں تھا کہ وہ کومل کی اتنی سنگین اور گھٹیا بات کا مفہوم سمجھتیں یا پھر علیزے کے دفاع میں کچھ بولتیں۔ بلکہ انہوں نے تو شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے چپ کی چپ بیٹھی رہیں اور ان کی چپ پہ آذر کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ کسی بھی غیرت مند مروجے کے لیے ایسی بات سن کر ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ احمد، حماد اور زین وغیرہ کی گردنیں اور نظریں جھک گئی تھیں۔ لیکن ان سب کے درمیان ایک فرد ایسا بھی تھا جس کا دل یہ سب ماننے سے انکاری تھا۔

”علیزے! ایسی نہیں تھی۔“ یہ مضبوط لہجہ اور دعوا دانیال کا تھا۔ جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی بیک وقت دانیال کی سمت دیکھا تھا۔

”کوئی کچھ بھی کہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علیزے ایسی نہیں تھی۔ وہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے علیزے کی پاکیزگی پہ اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنے اللہ کے ہونے پہ یقین ہے۔“ دانیال مضبوط لب و لہجے میں بولتے ہوئے ان سب کی سوچوں کو ڈانوا ڈول کر گیا تھا۔

”یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں یا پھر علیزے نے الزام لگا رہی ہوں۔“ کومل نے ناگواری سے کہا۔

”کبھی کبھی انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں جو الزام نہ ہوتے ہوئے بھی الزام بن جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو؟ ورنہ میری نظر میں تو وہ اب بھی پاک اور صاف ہے، ہر غلطی اور گناہ سے دھلی ہوئی۔“ دانیال اب بھی علیزے کے خلاف نہیں اس کے حق میں تھا۔ اس کا یقین دیکھ کر آذر ہونٹ بھیچ کے رخ پھیر گیا۔

”میں علیزے پہ الزام لگا سکتی ہوں، لیکن آپ کی ماں تو علیزے پہ الزام نہیں لگا سکتی نا؟“  
”جس روز میری ماں نے علیزے پہ الزام لگایا اس روز سمجھ لیجیے گا کہ انہوں نے انوشہ پہ الزام لگادیا، کیونکہ ایک ماں اپنی بیٹی پہ کبھی الزام نہیں لگا سکتی۔“ کومل کی باتیں دانیال پہ اثر نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ علیزے کے حوالے سے اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔

”کیا اس طرح کرنے سے حقیقت چھپ جائے گی؟“ وہ طنز بولی تھی۔

”تو کیا آپ اس طرح کر کے افسانہ بنالیں گی؟“ جواب دو بدو تھا۔

”آپ اسے غلط کہنے کی بجائے الٹا مجھے غلط کہہ رہے ہیں؟“ کومل کے چہرے سے ہلکا غصہ جھلک رہا تھا۔

”کیونکہ وہ غلط ہے یا نہیں ہے، لیکن آپ اسے غلط ثابت کرنے پہ تلی ہوئی ہیں۔ اس لیے میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ آپ یہ سب ثابت کر کے کیا ظاہر کرنا چاہتی ہیں؟“ دانیال کے سوال پہ کومل سٹپٹا گئی۔ لیکن اپنے محاذ سے



”کچھ نہیں۔! آپ تیار ہیں تو آئیے چلتے ہیں کافی ٹائم ہو رہا ہے۔“ وہ بات ٹال گیا تھا۔  
 ”آؤ! گھر پہ رہے گا؟“ انہوں نے صوفیہ سر جھکا کر بیٹھے آؤر کی سمت دیکھا۔  
 ”نہیں! میں بھی چلوں گا۔“ بالا خروہ بھی گھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اسپتال جانا تھا۔ وہ لوگ گھر پہ کپڑے چنچ کرنے آئے تھے اور اسپتال میں مبارک خان، اظہار آفندی اور جودت کو چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے اب واپس اسپتال جا رہے تھے۔ اس وقت رات کے ایک بجے کا وقت تھا جب وہ گھر سے نکل آئے تھے۔



صبح ناشتے کی ٹیبل پہ ان دونوں ماں بیٹے کے درمیان مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔  
 بتول شاہ نے ساری رات بیڈ روم میں بند جلتے ہوئے گزار دی تھی تو سکون میں دل اور شاہ بھی نہیں رہا تھا۔  
 رات اس کی بھی کانٹوں پہ بسر ہوئی تھی۔ ساری رات ڈرائنگ روم میں ادھر ادھر ہلکتے ہوئے اس کے پاؤں کے تلوے بھی جلنے لگے تھے اور لگا تار پھیننے والے سگریٹوں کے دھوئیں کے ساتھ وہ خود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں کی کڑواہٹ اس کی آنکھوں میں زہر بن کے اتر رہی تھی اور چہرے پہ شدت کرب کا عالم تھا۔

رات تھی کہ عذاب تھا؟ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس رات کو بیٹنے میں ایک مدت لگ گئی تھی۔ تب جا کے سویرے کا کنارہ نظر آیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش شروع کی تھی اور اس کوشش میں پہلا کام اس نے نماز پڑھنے کا کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کے اندر بھڑکتے شعلے وضو کے پانی سے ہی سرو ہوں گے ورنہ اس کے اندر کا دھماکا لاؤ اتنی آسانی سے ٹھنڈا پڑ جاتا یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں حشر پا کرتی نفرت زمین پہ پیشانی ٹکا کر اللہ کو کیے جانے والے سجدے سے ہی معدوم ہو گئی تھی اور نماز کے آخری سجدے تک وہ سر سے لے کر پاؤں تک قدرے شانت ہو چکا تھا۔ اشتعال دھیمہ پڑ گیا تھا اور رگوں میں پھرے ہوئے لہو میں ہمواری آگئی تھی اور مسجد سے واپس گھر آتے ہوئے وہ رات کے مقابلے میں خاصا سکون لگ رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو قدموں میں ایک توازن تھا اور ایسا ہی ایک توازن بتول شاہ کے مزاج میں بھی آچکا تھا۔ وہ رات کی اذیت رات کے ساتھ گزار آئی تھیں۔ اس لیے ان کا چہرہ بھی اس وقت ہر احساس اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ وہ نماز پڑھ کے نیچے آئیں تو اتنے میں گل بھی آچکی تھی اور ان کے کہنے پہ فوراً ہی ناشتا بنانے چلی گئی اور جب دل اور گھر آیا تب تک ناشتا تیار ہو چکا تھا۔ جس پہ اسے تھوڑی حیرانی بھی ہوئی، لیکن ڈائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھتی بتول شاہ کو دیکھ کر اسے سمجھ آ گیا تھا کہ یہ جلدی بتول شاہ کے حکم پہ ہو رہی ہے۔ وہ متوازن قدموں سے چلتا وہیں آ گیا۔

”السلام علیکم اماں جان۔!“ اس کی بھاری آواز پہ انہوں نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیونکہ ان کی توجہ اخبار پہ تھی۔

”وعلیکم السلام۔! جیتے رہو۔“ اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے نظریں دوبارہ اخبار کے صفحے پہ مرکوز کر دی تھیں اور نہ جانے کیوں دل اور مزید کچھ بول ہی نہیں سکا اور گل اتنے میں ناشتا لگا گئی۔ سوناٹے کے دوران بھی ان میں خاموشی حائل رہی تھی۔

اور جب وہ ناشتا ختم کر چکا تو بتول شاہ فوراً ہی کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی تھیں۔  
 ”ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔“ بات مختصر تھی، لیکن دل اور چونک گیا تھا۔  
 ”کیوں۔؟“

ہی نہیں۔

”میں یہ ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا دھرا عیلازے کا ہے۔ اس کا چکر بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ منصور حسین کا یہاں آنا ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ انہوں نے ہم سب کو بے وقوف بنایا تھا۔ آپ کی نظر میں وہ جتنی پاکیزہ اور شفاف ہے، حقیقت میں وہ اتنی پاکیزہ اور شفاف نہیں ہے۔ اس کی پہلے سے ہی منصور حسین کے ساتھ کھٹ منٹ تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم لوگ جب مری میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے تھے تو علیزے تھکن کا بہانا بنا کر بنگلے پہ ہی رک جاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے نام نہاد ڈرائیور منصور حسین کو بھی بنگلے پہ ہی رکنا پڑتا تھا۔ اب ہمارے پیچھے بنگلے پہ کیا ہوتا تھا؟ ہمیں کب پتا تھا؟ لیکن سچ کہتے ہیں ایسی باتیں چھپی ہوئی نہیں رہتیں۔ اک نہ اک دن سامنے آ جاتی ہیں اور دیکھ دیجئے اب تو سب کے سامنے آ گیا ہے سب کچھ۔ اب تو کوئی شک اور شبہ بھی نہیں رہا۔؟ آپ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے منصور حسین کا ہاتھ پکڑ کے چلی گئی ہے۔ کیا یہ بھی میرا الزام ہے؟ ہونہ! یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج بڑی حویلی کی بریادی اور رسوائی علیزے بی بی کی بے جالا ڈ اور پیار کا نتیجہ ہے۔ اب اس اکیلی کے کے کا بھگتان پوری حویلی کو بھگتنا پڑے گا، لوگوں کی باتوں اور انگلیوں کا نشانہ سب کو بننا پڑے گا۔ سب کی نظر جھکے گی، سب کا سر نیچا ہو گا، کیونکہ اس نے سب کی غیرت کا جنازہ نکالا ہے۔ اس لیے ماتم بھی تو سب نے کرنا ہے؟

اپنے آپ کو اور بانی گھر والوں کو محض جھوٹی تسلیاں دینے اور قیافے لگانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ منہ کالا کر گئی ہے منصور حسین کے ساتھ جو نہ جانے کب سے اس کا عاشق تھا اور اس کے عشق میں بھیس بدل کر بھی آ گیا۔“ ماحول لوہے کی طرح گرم تھا۔ اس لیے کومل کے الفاظ کی ضربیں سب کے ذہنوں کے کس بل نکال سکتی تھیں۔ سو اس نے یہ ضربیں لگانے میں دل کھول کے نشتر نما الفاظ کا استعمال کیا تھا اور کافی حد تک کامیاب بھی ٹھہری تھی۔

وہاں موجود سینے والے افراد کے ذہن کسی نہ کسی حد تک پر آگندہ ہو ہی چکے تھے اور وہ ان سب کو اس حد تک متنفر کر دینا چاہتی تھی کہ وہ سب مل کر ہمیشہ ہمیش کے لیے علیزے پہ بڑی حویلی کے دروازے بند کر دیتے، اگر کبھی خدا نا خواستہ وہ بھولی بھٹکی آ بھی جاتی تو اسے یہاں کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ بلکہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جاتا اور اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ سب کے سامنے برہہ چڑھ کے بول رہی تھی اور اسے اب کسی کا کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔ جن کا ڈر تھا وہ اسپتال کے بستر پہ بے ہوش اور لاچار پڑے تھے اور یہ لاچاری اب ڈاکٹر ز نے ان کی آئندہ زندگی کا حصہ قرار دے دی تھی۔ وہ اگر ٹھیک ہو بھی جاتے تو بستر سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ بڑی حویلی کو قائم رکھنے والا ایک اہم ستون تھے اور یہ ستون گر چکا تھا۔ زمین بوس ہو چکا تھا اور بڑی حویلی کا شیرازہ بکھرا شروع ہو گیا تھا۔ مضبوط دیواروں کی اینٹیں اکھڑ رہی تھیں اور بنیادیں زمین میں دھسنے کے امکان صاف دکھائی دے رہے تھے اور یہی غم تو آسیہ آفندی کو کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں ندھال اور بے جان سی پڑی روئے جا رہی تھیں۔ عون اور عدید اپنے باپ اور اپنی ماں کی حالت دیکھ کر بے حال ہو چکے تھے۔ ان کے معصوم ذہنوں پہ برا اثر ہوا تھا۔ لیکن یہاں بھلا کس کو پروا تھی کہ کس پہ کیا اثر ہوا ہے؟ حالات کی گروٹ بہت نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بھی۔۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ اسرار آفندی نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ کیونکہ وہاں سب کے چہروں پہ سوچ کے جال بچھے ہوئے تھے۔

”جو بھی ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔“ دانیال گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفیہ سے کھڑا ہو گیا۔  
 ”کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے؟“ وہ پہلے ہی پریشان تھے۔ دانیال کی سنجیدگی پہ تشویش ہونے لگی۔



”کیا پوچھنے کی ضرورت ہے؟“ ان کے لہجے میں نامحسوس سی تلخی تھی۔  
”لیکن اماں۔۔۔“

”نی الحال مجھے جانے دو“ میں پھر آؤں گی۔ اپنی زری سے ملنے۔ اس کی خاطر تو میں نے آنا ہی ہے؟“ ان کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ انہیں دوبارہ رکھنے پر اصرار نہیں کر سکا تھا چاہے وہ کیا۔  
اس نے ڈرائیور سے گاڑی تیار کروائی اور انہیں رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک آیا۔ گلاب خان، زلفی اور گل ان کی اتنی جلدی واپسی پہ اداس ہوئے تھے۔ لیکن وہ انہیں دوبارہ آنے کا وعدہ دے کر رخصت ہوئی تھیں اور جاتے جاتے گل کی مٹھی میں چند ہزار ہزار کے نیلے نوٹ بھی تھما دیے تھے اور خود اپنی ذات پہ کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور دکھ کی چادر اوڑھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں اور دل اور خود پہ ضبط کیے اندر چلا آیا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کے منشی قادر کا فون آگیا۔ وہ بے چارہ کام سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اس لیے دل اور کو خود آفس جانا پڑا۔



آج اس کا موڈ بہت فریش تھا۔

شاید اس لیے کہ آج وہ اپنے بستر سے ایک ارادہ لے کر اٹھی تھی اور یہ ارادہ کچھ ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے سرشاری سی پھوٹ رہی تھی۔ دل، دماغ میں اک تازگی آن بسی تھی۔ جس کے ہمراہ اس نے شاور لیا تھا۔ نئے کپڑے پہنے تھے۔ پرفیوم اسپرے کیا تھا۔ بال سنوارے تھے۔ کلائیوں میں برسلسٹ اور پاؤں میں ہائی ہیل سینڈل پہننے کے بعد اپنے آپ کو ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے میں تنقیدی نگاہ سے دیکھا تھا۔ کمی بیشی کہیں بھی نہیں تھی۔ اسی لیے مطمئن ہو کر گلے میں مفلر ڈالتی ہوئی اپنا بیگ اور سیل فون لے کر بیڈ روم سے نکل آئی اور یوں ہی سیڑھیوں کی سمت بڑھتے اس کا دھیان اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے بیڈ روم کی طرف چلا گیا اور بے ساختہ ہی وہ اس بیڈ روم کی طرف آگئی تھی۔ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی بیڈ پہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی مومنہ بی بی نظر آئی۔

”ہیلو! گڈ مارننگ۔۔۔“ مدیحہ کافی فریش انداز سے کہتی ہوئی اندر چلی آئی اور مومنہ بی بی نے چونک کر دیکھا۔  
”مدیحہ باجی۔۔۔؟“ وہ اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”ارے یار! میں نے کل بھی تمہیں کہا تھا کہ میرے نام کے ساتھ ”باجی“ وغیرہ کا دم چھلا لگا کر میرے نام کو دونی مت کرو، جیسے تم نے اچھی خاصی خوب صورت اور رنگ سی مومنہ کو ”بی بی“ بنا کے رکھ دیا ہے۔ ویسے ہی مجھے ”باجی“ بنانا چاہتی ہو؟“ مدیحہ نے اسے مصنوعی خفگی سے ٹوکا تھا اور مومنہ بی بی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”دیکھو یار! ظاہر سی بات ہے۔ کیا تمہاری اور میری عمر ہے؟“ ”یا جی یا بی بی“ والی؟“ اب کے مدیحہ نے ذرا فریڈنی سا انداز اپنایا اور مومنہ بی بی نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ بات تو اس کی بھی سچ تھی؟ لیکن وہ بے چاری کیا کہہ سکتی تھی؟ ان پڑھ، سیدھے سادھے دیہاتی ماں باپ نے اسے بی بی بنا دیا تھا اور وہ سن گئی تھی۔ اس کے تو شناختی کارڈ پہ بھی مومنہ بی بی ہی لکھا ہوا تھا۔ نوے فیصد دیہاتی عورتوں کی طرح وہ بھی بی بی کے زمرے میں آتی تھی اور یہ بی بی اب اس کی پہچان بن چکا تھا۔

”اس میں میرا کیا قصور ہے مدیحہ باجی؟ یہ تو ماں باپ کے سوچنے کی بات تھی۔ وہ مومنہ بی بی کی بجائے میرا پورا نام مومنہ محمد بخش بھی لکھ سکتے تھے۔ جیسے آپ کا نام مدیحہ حیات ہے۔ لیکن یہ عقل پڑھے لکھے ماں باپ کو ہوئی ہے۔ ان پڑھ ماں باپ کو نہیں جو کسی قسم کا بھی کوئی فارم لکھواتے ہیں تو اس میں خاوند یا باپ کے نام سے زیادہ

بی بی کو اہم بنا دیتے ہیں۔ اس لیے بی بی ہمارے مومنہ جاتی ہے۔“ مومنہ بی بی کے جواب پہ مدیحہ نے کافی دلچسپی اور خیرانی سے دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی مدیحہ کے تمام ڈاکو منٹس میں اس کا نام مدیحہ حیات ولد ممتاز حیات لکھا ہوا تھا۔ بی بی کا لفظ تو کہیں بھی نہیں تھا؟

”یعنی گاؤں میں سب لڑکیوں کے ناموں کے ساتھ بی بی ہوتا ہے؟“ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔  
”جی ہاں بالکل۔۔۔ باپ کا نام ہونہ ہو بی بی ضرور ہوتا ہے۔ آپ کو گاؤں میں کئی بی بیاں ملیں گی، سیکنہ بی بی، گوثر بی بی، رسولہ بی بی، مومنہ بی بی یا پھر صرف بی بی۔“ مومنہ بی بی نے مدیحہ کو حیرت اور دلچسپی میں ڈال دیا۔  
”ہوں۔۔۔ امیزنگ۔۔۔ گویا یہ بی بی والے جراثیم بہت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے ختم کرنے سے ختم نہیں ہوں گے۔“ اس نے پرسوج سے انداز میں کہا۔

”جی بالکل! بہت مشکل کام ہے۔“ مومنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”خیر! اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ گاؤں کی تمام عورتوں کو نہ سہی، تمہیں تو صرف مومنہ کہا ہی جاسکتا ہے؟“  
”ہوں! جیسے آپ کی مرضی باجی۔“ مومنہ بی بی نے ہائی بھری تھی۔  
”اف! پھر باجی۔۔۔؟“ مدیحہ جھنجھلا گئی تھی۔

”دیکھو! آج سے تم مومنہ اور میں مدیحہ۔۔۔ نو بی بی۔۔۔ نو باجی۔۔۔ اوکے۔۔۔؟“ مدیحہ نے انگلی اٹھا کر جس انداز سے کہا تھا اس پہ مومنہ بی بی بے ساختہ مسکرائی تھی۔  
”جی! اوکے۔۔۔“ اس نے سر ہلایا۔  
”ہوں! گڈ گرل۔۔۔“ مدیحہ بھی جواباً ”مسکرائی تھی۔

”اور اب یہ بتاؤ کہ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دو واپسی پہ لے آؤں گی؟“ مدیحہ نے کافی نرمی اور خلوص سے پوچھا تھا اور مومنہ بی بی ان دونوں بہن بھائی کی اتنی ہمدردی، خدا ترسی، اپنائیت اور وسیع ظرف پہ کل سے کئی مرتبہ انہیں حیران نظروں سے دیکھ چکی تھی۔ اسے ان کے ماتھے پہ شکن تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بلا مبالغہ کھلے دل اور کھلے ظرف کے حامل تھ۔

”کیا سوچ رہی ہو مومنہ۔۔۔؟“ مدیحہ نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر ٹھوکا دیا۔  
”کچھ نہیں۔۔۔! میں تو بس یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے بھلا؟“ مومنہ بی بی کے لہجے میں اپنی ذات کے لیے ہی تسخر تھا جو مدیحہ کو اچھا نہیں لگا۔

”کیوں نہیں ہو سکتی بھلا؟ کیا تم لڑکی نہیں ہو؟ کیا تمہاری ضرورتیں نہیں ہیں؟ کیا پہننا اور ڈھنسا جرم ہے؟ یا پھر تم نے ایک ہی لباس میں عمر گزارنے کا عہد کر رکھا ہے۔“ مدیحہ نے خفگی سے کھورتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن مدیحہ باجی۔۔۔! آپ جانتی ہیں کہ اس وقت میری ضرورت یہ چھت ہے۔ یہ چار دیواری ہے اور اس سے برہہ کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے مجھے، تن پہ کپڑا بھی ہے اور معدے میں غذا بھی۔ اس لیے گزارہ ہو ہی جائے گا۔ میں خواہ مخواہ آپ کے اخراجات برہاؤں یہ ضروری نہیں ہے۔“ مومنہ بی بی کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی تھی۔

”ہم نے اپنے اخراجات اور اپنے وسائل دیکھ کر ہی تمہاری ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اگر اتنی حیثیت نہ ہوتی تو شاید ہم تمہاری ذمہ داری بھی نہ اٹھاتے؟ اللہ نے کسی کی ذمہ داری اٹھانے کی توفیق دی ہے تو پھر گریز کیسا؟ شاید تمہارے صدقے اللہ ہماری بے سکون زندگی کو سکون بخش دے۔ شاید کسی کے گناہ کو دھوئے دھوئے ہمارے گناہ دھل جائیں؟“ مدیحہ کے لہجے میں بولتے بولتے کرب سا اتر آیا تھا۔  
”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ مومنہ بی بی کو حیرت اور الجھن ہوئی تھی۔



”ہاں! ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ گناہ سے پاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن گناہ سے پاک ہونے کی اور گناہ کو دھونے کی کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟“ مدحیہ کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی سر جھٹک دیا۔

”بی بی! تمہیں اخراجات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے بہت نوازا ہے۔ تمہارے استعمال کر لینے سے سب ختم نہیں ہو جائے گا اور ویسے بھی تمہاری ذمہ داری نبیل بھائی نے اٹھائی ہے اور تمہارے اخراجات تمہاری ضرورتیں بھی وہی پوری کریں گے۔ کون سا میں اپنی جیب سے خرچ کروں گی؟ میں نے تو بس ان کو بتانا ہے اور ان سے کیش وصول کرنا ہے۔“ اس نے لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور مومنہ بی بی کے چہرے نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیونکہ مدحیہ کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

”پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”بی بی! حال کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ مومنہ بی بی نے بے چارگی سے کہا تھا۔

”اوکے! ایز یوش۔ جب سمجھ میں آجائے تب بتا دینا۔“ مدحیہ کہہ کے پلٹ گئی۔

”مدحیہ باجی!۔“ اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا اور مدحیہ نے یک دم پلٹ کر اسے جن نظروں سے دیکھا تھا۔ مومنہ بی بی نے فوراً اپنی زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔ وہ پھر باجی کہنے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے بھی اس نے بات کے دوران اسے باجی کہا تھا۔ لیکن مدحیہ نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب۔۔۔

”میں معافی چاہتی ہوں مدحیہ باجی! لیکن سیانے کہتے ہیں کہ امیر اور غریب اتنی جلدی کھل مل نہیں سکتے۔ تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔ میں اتنی جلدی نہ تو آپ کے برابر آسکتی ہوں اور نہ ہی آپ کو اپنے برابر لاسکتی ہوں۔ اس لیے تھوڑا برداشت کیجیے رفته رفته باجی کہنا چھوڑ دوں گی۔“ مومنہ بی بی نے کافی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا۔ جس پہ مدحیہ نے مزید بحث میں الجھنے کی بجائے سر جھٹک دیا تھا۔

”اوکے! تم یہ بتاؤ تم نے مجھے آواز کیوں دی ہے؟“ مدحیہ نے اس کے روکنے کی وجہ پوچھی تھی۔

”وہ میں نے پوچھنا تھا کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

مومنہ بی بی کے اس سوال پہ نہ جانے کیوں مدحیہ پل بھر کے لیے جھک سی گئی۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے؟ کیا کہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

”کیوں تمہیں کوئی کام ہے؟“ وہ اس کے سوال کا جواب گول کر گئی تھی۔

”نہیں! بس یہ کہنا تھا کہ جہاں بھی جا رہی ہیں ذرا جلدی واپس آجائیے گا۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں یہاں ڈر لگ رہا ہے؟“

”نہیں مدحیہ باجی! ڈر کیسا؟ ڈر تو ان کو ہوتا ہے جن کے پاس کچھ ہو؟ میرے پاس کیا ہے بھلا؟ سب کچھ تو پہلے ہی گنوا چکی ہوں؟ بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ تنہا بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگتا ہے۔ آپ ہوتی ہیں تو دل کو ڈھارس رہتی ہے۔“ اس کی بات مدحیہ چند ثانیے کے لیے چپ ہوئی پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

”اوکے! جلدی آجاؤں گی، لیکن اگر زیادہ گھبراہٹ ہو تو تم بیڈ روم سے باہر بھی آسکتی ہو۔“ مام کے ساتھ بیٹھ کر باتیں بھی کر سکتی ہو۔ گھر کی چار دیواری کے اندر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آزاد ہو یہاں۔“ مدحیہ نے اسے ریلیکس کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور مومنہ بی بی نے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

”شکریہ بہت بہت شکریہ مدحیہ باجی۔“

”اوکے! لڈ بائے۔“ وہ کہہ کر ہر نکل آئی تھی۔ لیکن سیڑھیاں اترتے ہوئے فائزہ بیگم سے سامنا ہوا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ وہی ایک فطری سا سوال بار بار اس کے آڑے آ رہا تھا۔

”بس ایک کام سے جا رہی ہوں۔“ مدحیہ کہہ کر ان کے سامنے ٹھہری نہیں تھی۔ بے شک جو بھی تھا۔ لیکن وہ

ایک ماں تھیں اور وہ ماں کی گہری نظروں کے سامنے عیاں نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے ذرا کترا کے جواب دیا تھا۔

”مام! میری واپسی تک مومنہ کا خیال رکھیے گا، میں جلدی آجاؤں گی۔“ سیڑھیاں اترنے کے بعد اسے خیال آیا تو اس نے مرکز فائزہ بیگم کو تاکید کی تھی۔

”خوش قسمت ہے مومنہ بی بی جس کے خیال تمہیں ستارے ہیں۔“ فائزہ بیگم نے رشک کا اظہار کیا اور مدحیہ مسکراتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی۔ ابھی اس نے گھر کے گیٹ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا تھا۔

”ہیلو۔“ اس نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

”کیسی ہو۔۔۔؟“ دوسری طرف جیزی تھا۔

”ایک دم فٹ! تم ساؤ! تم کیسے ہو؟“ مدحیہ کے لہجے میں بے پناہ ہلاکت تھی۔

”کیسا ہونا چاہیے مجھے؟ کیا تمہیں میری کچھ خبر ہے؟ کیا اس کو مہمان نوازی کہتی ہو کہ دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہ لو کسی کی؟“ جیزی شکوہ کر رہا تھا۔ مدحیہ تو اسے سچ سچ بھولی ہوئی تھی۔

”سوری یار! ایم رینلی سوری۔۔۔ ان فیکٹ دو دن پہلے نبیل بھائی کا کسی لڑکی کے ساتھ ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے گھر میں کچھ مصروفیت تھی اور کل دل آور بھائی اپنے گھر آئے ہوئے تھے تو ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ تب ہی تم سے ملنے کا ٹائم نہیں ملا۔“ وہ ڈراؤ کر رہے تھے اسے جواب دے رہی تھی۔

”اور اس وقت کہاں جا رہی ہو؟“ جیزی کے کہنے پہ مدحیہ چکر آ گئی۔

”اف! کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟ میں کیسے جانے کے لیے کیا نکلی ہوں کہ شہر کا شہر پیچھے پڑ گیا ہے۔ ہر طرف ایک ہی سوال سنائی دے رہا ہے۔ کہاں جا رہی ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے جیسے سر پیٹ لیا۔

”تو تم بتاؤ کہ تم کہاں جا رہی ہو؟“ جیزی سکون سے کہہ رہا تھا اور مدحیہ ٹھہری گئی۔

”کسی سے ملنے جا رہی ہوں۔“ اب کی بار اس کا ہلاکت آمیز لہجہ دھیمّا پڑ چکا تھا۔

”کس سے ملنے جا رہی ہو؟“ یہ سوال جیزی چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ سکا تھا کیونکہ مدحیہ کا دھیمّا لہجہ اسے ٹھنکا گیا تھا اور وہ یہ سوال پوچھ کر اپنے وہم پہ یقین کی مہر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

”ہیلو جیزی! مدحیہ نے اس کی خاموشی پہ اسے پکارا تو وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

”ہوں! سن رہا ہوں۔“ اب اس کا لہجہ دھیمّا ہو چکا تھا۔

”چپ کیوں ہو گئے ہو؟“

”کچھ کہنے کے لیے بھی تو نہیں ہے؟ اپنی دے۔ تم جہاں جا رہی ہو جاؤ واپسی پہ تم سے بات ہوگی مگر بھولنا مست یہ بھی یاد رکھنا کہ میں منتظر ہوں۔“ جیزی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور مدحیہ فون کو دیکھ کے رہ گئی تھی کیونکہ جیزی اپنی بات کا مفہوم واضح کر گیا تھا۔

\*\*\*

اواڑا اے تے ماڑا سسی یار تو ہے  
جگ جوی ہوے او ساڈا پیا ر تو ہے  
کیوں ماسے دا کیوں ڈھولے دا ٹکڑے کراں  
میں تان لکھ داری بسم اللہ کراں۔۔۔



او بسم اللہ کراں۔

ورکشاپ کے گرو آلودر آمدے میں لکڑی کے بچہ رکھے کالے رنگ کے ٹوٹے پھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر میں فل والیوم سے گونجتی ملکوں کی آواز عدیل کے اعصاب پہ ٹینشن کی طرح سوار ہو رہی تھی وہ پہلے ہی کافی بے زار تھا ملکوں کے ان چونچلوں پہ اور بھی کوفت اور بے زاریت ہونے لگی تھی اس نے دو تین بار چھوٹے کو ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن وہ یہ رسک لینے کو تیار نہیں تھا کیونکہ یہ ٹیپ ریکارڈر سالوں سے بند پڑا تھا اور دو دن پہلے چھوٹے نے اسے کاٹھ کباڑ سے دریافت کر کے اسے دس روپے کا نیا سوچ لگا کر تقریباً ”پچاسی جھٹکے دیئے تھے اور تب جا کے وہ اشارت ہونے پہ آمادہ ہوا تھا اور چھوٹا خوشی سے بھاگتا ہوا جا کر ساتھ والے چائے کے ڈھابے سے یہ کیسٹ اٹھا لایا حالانکہ اس نے جب یہ کیسٹ لا کر ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کیا تھا تو ٹیپ ریکارڈر نے ابکائی کرنے والے انداز میں فوراً ”وہ کیسٹ باہر اگل دیا تھا کیونکہ ٹیپ ریکارڈر کے کیسٹ ڈالنے والے فریم ٹوٹے ہوئے تھے اس لیے بغیر کسی فریم یا بغیر کسی سہارے کے کیسٹ کا ٹھہرنا مشکل تھا لیکن وہ سری طرف ٹھہرانے والا بھی آخر ”چھوٹا“ تھا۔

اس نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں ڈال کے اس کے دائیں بائیں ماچس کی تیلیاں پھنسی تھیں اور اوپر سے ٹیپ ریکارڈر پہ ایک زوردار پھٹر رسید کیا اور تب سے اب تک ملکوں کا گھبراہٹ ہو گیا تھا کیونکہ چھوٹے نے اسے بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بس جب بجلی آف ہوتی تو اسے ذرا دم لینے کا وقفہ ملتا تھا ورنہ تو نان اسٹاپ چلتا رہتا اور اگر بھی درمیان میں ٹیپ ریکارڈر اٹکنے لگتا تھا تو چھوٹا اسے پھٹ مار کے پھر سے اس میں پھریری سے بھر دیتا اور اس پہ ستم کہ ٹیپ ریکارڈر کا والیوم بھی کم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کا والیوم والا بٹن ہی غائب تھا اور اس کا یہ اعصاب شکن مشغلہ عدیل کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ ضبط کیے اپنے کام میں مصروف رہا تھا تاکہ اس کے کچھ سخت ست بولنے پہ کوئی بد مزگی پیدا نہ ہو لیکن چھوٹا تھا کہ باز ہی نہیں آ رہا تھا۔

اساں تاں جن کے یار بنایا شوقاں دا

ہورے کھڑا امل لگدا اے ایناں لوکاں دا؟

چھوٹے نے شاید عدیل کو زچ کرنے کا پورا پورا پروگرام بنا رکھا تھا کیونکہ اب وہ خود بھی ساتھ ساتھ گانا شروع ہو چکا تھا جس پر عدیل کو اور بھی تاؤ آ رہا تھا۔

”دیکھ چھوٹے! یہ ہاتھ میں پکڑا ہوا رینج تمہارے سر پہ دے ماروں گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے اپنا اور اس کا منہ بند کرو ورنہ تم دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک آؤں گا۔“ عدیل کی برداشت جواب دے چکی تھی اس نے خونخوار نظروں کے ساتھ چھوٹے کو اور اس کے دریافت شدہ دھکا اشارت ٹیپ ریکارڈر کو بیک وقت دیکھا تھا۔

”استاد! تم تو یوں غصہ کر رہے ہو جیسے ملکوں تمہیں چھیڑ رہا ہو۔“ چھوٹے نے چوٹ کی تھی جس پہ عدیل تلملا گیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”رے استاد! مطلب والی باتیں ہمیں نہیں آتیں ہم تو بغیر مطلب والی بات کرتے ہیں۔ ویسے استاد! آپس کی بات ہے یہ جو پار ہوتے ہیں یہ مارے کیوں ہوتے ہیں؟“ چھوٹے نے آخر میں معصومیت سے سوال داغ دیا اور عدیل نے اسے گھور کے دیکھا۔

”تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”اللہ کی قسم استاد! میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو لیکن کیا کریں؟ رنگ میں بھنگ تو وہ ولایت والا (جھڑی) ڈال گیا تھا جب بھی یاد آتا ہے کھوپڑی گرم ہو جاتی ہے اچھا بھلا استاد کا کام سیدھا ہو رہا تھا لیکن وہ نہ



جانے کہاں سے بیچ میں آگیا لیکن استاد کوئی بات نہیں تیری مانگ میں اگر دم ہوا تو وہ میڈم ضرور آئے گی کیونکہ یہ تو ایک فطری سی بات ہے کہ جس طرح دسی کو ولایتی میں بڑی کشش ہوتی ہے اسی طرح ولایتی کو بھی دسی میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے، خصوصاً ولایتی عورت تو دسی مرد کی طرف کھینچی چلی آتی ہے اور تم بھی ماشاء اللہ دسی مرد ہو مشرقی مرد ہر لحاظ سے مکمل کشش سے مالا مال ممکن ہی نہیں کہ وہ ولایتی میڈم تمہارے سحر سے بچ نکلے۔

چھوٹے کی بات یہ عدیل نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

”میرے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تمہیں خوا مخواہ ایٹو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“

”ہو نہ استاد! تمہارے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تو پھر دماغ میں یہ گرمی کس لیے ہے؟ جو تم ہمہ نکال رہے ہو۔“ چھوٹے کا انداز معنی خیز سا تھا۔

”تمہارے کرتوت ہی ایسے ہوتے ہیں کہ خوا مخواہ دماغ گرم ہونے لگتا ہے۔“

”میرے کرتوت یا پھر؟“ چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور عدیل نے سمجھتے ہوئے یکدم اسے مارنے کے لیے ریچ گھمایا تھا اچانک ورکشاپ کے احاطے میں ایک گاڑی جھٹکے سے آن رکی۔ سلور کلر کی چمچاتی ہوئی یہ گاڑی عدیل کے لیے اجنبی نہیں تھی اس کا ہاتھ یکدم نیچے پہلو میں آگرا تھا۔

”مرد یہ دسی شراب اور عورت یہ دسی مرد بڑا اثر کرتے ہیں استاد۔ آزمائش شرط ہے۔“ چھوٹا اس کے قریب سرگوشی سے کہتا ہوا پاس سے گزر کر ورکشاپ کی پچھلی سائیڈ پہ چلا گیا جہاں جیدی اور سلو کسی گاڑی کی مرمت میں مصروف تھے۔ وہ گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آگئی۔

”ہیلو!“ آواز تھی یا مٹھاس جس کا احساس عدیل کو روح تک محسوس ہوا تھا۔

”اسلام علیکم۔“ اس نے بھی کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اس وقت وہ احساسات اور جذبات سے گندھی ہوئی ایک نارمل لڑکی نظر آرہی تھی جس کے وجود میں بھڑکنا غصہ اس لمحے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ سر سے پاؤں تک تسخیر آمادہ تھی اور اس لمحے عدیل کو اس کی ذات کے آئینے میں اپنے آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا اسے اس کے وجود میں اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا وہ اس وقت اس کے سامنے کھڑی ”مدیہ حیات“ نہیں بلکہ ”عدیل عمر“ لگ رہی تھی شاید اسی لیے کہ عدیل عمر کے سامنے آنے کے لیے اسے مدیہ حیات کو پیچھے چھوڑ کے آتا ہوا تھا شاید اپنے اسی بستر میں جہاں سے وہ عدیل عمر سے ملنے کا ارادہ لے کر اٹھی تھی اور اب اس کے سامنے کھڑی وہ مدیہ ”مدیہ“ ہی نہیں لگ رہی تھی جس کو دیکھ کر عدیل عمر کا دل بھی اپنی جگہ سے اس کی سمت ہلکنے لگا تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا ریچ ایک سائیڈ پہ ڈال دیا۔

”میں تھیک ہوں! آپ سنائیں کیسی ہیں؟“ عدیل کا دل اس کے لہجے پر حاوی ہو رہا تھا ”آج دے رہا تھا۔“

”میں آپ کے سامنے ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ میں کیسی ہوں؟“ وہ آج پہلی بار دل کی رضا سے آئی تھی اس لیے سب کچھ دل کی رضا پہ چھوڑ رکھا تھا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی چھوٹ پہ دل اپنی رضا سے کیا کیا کرتا ہے؟ کیا گل کھلاتا ہے؟ کون سا چاند چڑھاتا ہے؟ کہاں تک جاتا ہے؟ کتنا بھگتا ہے؟ اور کتنا بھگتا ہے؟ یہی جاننے کے لیے اس نے دل کو خاصی ڈھیل دے رکھی تھی اور وہ عدیل عمر کے حضور آن پہنچا تھا کسی سدھائے ہوئے بے زبان جانور کی طرح۔!

”آپ اپنے فیصلے دو سروں پر بھی چھوڑتی ہیں؟“ عدیل کا سوال دلچسپی لیے ہوئے تھا۔

”کثر نہیں، کبھی کبھی۔“ وہ بھی خوشگواریت سے بولی۔

”کبھی کبھی کیوں؟“

”کیونکہ دل کبھی کبھی موج و مستی پہ آمادہ ہوتا ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”یعنی آپ اس وقت موج و مستی پہ آمادہ ہیں؟“ عدیل کے معنی خیز لہجے پہ مدیہ بری طرح چونکی تھی وہ اس کی بات کو فو معنی سمجھ رہی تھی۔

”نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔“ مدیہ جیسی شعلہ صفت لڑکی کا یوں گڑبڑا جانا عدیل کو لطف دے گیا تھا اس کے دماغ کی گرمی دور ہو گئی تھی۔

”تو پھر کیسی بات ہے؟ کس موج میں ہیں آپ؟ اور کس مستی کی بات کر رہی ہیں؟“ اس کے رنگ اس کے انداز دیکھ کے عدیل خود مستی میں آگیا تھا۔ اور مدیہ نظریں چراگئی۔

”کیا بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟“ اس نے عدیل کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

”ارے کیوں نہیں! سو بسم اللہ سر آنکھوں پہ آئیے بیٹھیے۔“ عدیل نے چونکتے ہوئے فوراً پلاسٹک کی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دی اور دوسری کرسی اپنے لیے کھینچ لایا۔

”ارے بے فکر رہیں! کرسی گندی نہیں ہے بس حالات اور ماحول نے اسے بد وضع اور بے رنگ بنا دیا ہے۔“

عدیل نے اسے تسلی دی تھی اور مدیہ جھل جھل ہوتی بیٹھ گئی۔

”اب بتائیے! کیا لیں گی آپ؟“ وہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور مدیہ کو یوں اس کے رویہ بیٹھنے پہ جھک سی ہو رہی تھی۔

”نہیں! کچھ نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”کیا ناشتا کر کے آئی ہیں؟“

”نہیں۔“

”ارے! تو پھر انکار کس لیے ہے؟ یہاں ناشتا کریں گرما گرم حلوہ پوری، پنے اور لسی کے ساتھ دماغ کی خشکی دور ہو جائے گی۔“ عدیل نے اسے ناشتہ اصرار کیا تھا۔

”نہیں! اتنا ہیوی ناشتا میں نہیں کر سکتی۔“ وہ اتنا بھاری بھر کم ناشتا کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

”اتنا بھی ہیوی نہیں ہے بس آپ کو نام سن کر ایسا لگ رہا ہے اس نرم گرم سے موسم میں یہ ناشتا بہت گرمائش دیتا ہے۔“ عدیل کا اصرار ہنوز تھا۔

”ایم سوری! اتنا ہیوی ناشتا تو نہیں لیکن چائے لے سکتی ہوں۔“ اس نے چائے پہ رضامندی ظاہر کی تھی اور مجبوراً عدیل کو اسے اصرار سے ہٹا پڑا۔

”اوکے! ابھی منگواتا ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے گردن موڑ کر سلو کو آواز دی تھی۔

”سلو! اوئے سلو۔“ اس نے بلند آواز سے پکارا۔

”جی استاد؟“ سلو فوراً ہاتھ جھاڑتا ہوا حاضر ہوا تھا۔

”دو کپ چائے پکڑو ڈھابے سے۔“ اس نے اشارہ کیا تھا۔

”استاد! سلام تو کر لینے دیں۔ سلام میڈم! کیسی ہیں آپ؟“ سلو نے عدیل کو خفگی سے کہا تھا اور ساتھ ہی مدیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”و علیکم السلام! تھیک ہوں اللہ کا شکر ہے۔“ مدیہ نے آہستگی سے کہا اور اس کے انگلش لب و لہجے میں ”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

”اللہ کا شکر“ ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔



چلا گیا۔ عدیل کو پتا تھا کہ وہ تینوں لوفرا سے بہت تنگ کریں گے اسی لیے تو اس نے بڑے لوفر ”چھوٹے“ کو نہیں بلایا تھا جو صرف نام کا چھوٹا تھا، کام کا نہیں، کام تو اس کے بڑے بڑے تھے، خصوصاً اس کی عقل بہت بڑی تھی، کافی دور کی سوچ رکھتا تھا۔ اور اس کا اور اک عدیل کو کافی اچھی طرح سے ہو چکا تھا۔

”اور سنائیں کیسے آتا ہوا آپ کا؟ میرے لائق کوئی خدمت۔“ عدیل دوبارہ سے اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا اور مدحیہ کو اس وقت کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے؟ اور کیا بتائے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ کیونکہ اس کے پاس کوئی وجہ ہی نہیں تھی یہاں آنے کی۔

”وہ دراصل میں نے آپ کے گھر جانا تھا، آپ کے فادر کی خیریت معلوم کرنے کے لیے لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتا نہیں تھا اس لیے یہاں آنا پڑا ہے۔“ مدحیہ کو بروقت ایک بہانا سوجھ ہی گیا تھا اور عدیل اس کا یہ گریز فوراً ہی سمجھ گیا۔

”اوہ اچھا اچھا! تو آپ اباجی کی عیادت کے لیے یہاں آئی ہیں؟“ اس نے اپنی ذوق معنی سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے دور سے آتے سلو پے نظریں جمادیں تاکہ مدحیہ سے نظروں کا تصادم نہ ہو۔

”آپ مجھے گھر کا پتا بتادیں، میں چلی جاؤں گی۔“ وہ بھی بات کرتے ہوئے کافی جھجکی اور کترائی کترائی سی لگ رہی تھی اپنے سابقہ شعلہ جوالہ انداز سے قطعی مختلف نظر آ رہی تھی۔

”ارے نہیں نہیں! جب تک میں آپ کو اپنے گھر لے کر نہیں جاؤں گا آپ کیسے جائیں گی بھلا؟ آپ کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔“ عدیل کے جواب پہ اس نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر دیکھا اور عدیل اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے وار سے گھائل ہو کے رہ گیا تھا اس کی آنکھوں کی دھار بہت تیز تھی۔

”استاد! چائے۔“ سلو آنکھوں کی آنکھوں تک رسائی کا یہ منظرو دیکھ چکا تھا اسی لیے گلا کھنکار کے متوجہ کیا۔ ”ہوں! لاؤ دو ادھر۔“ عدیل نے نظروں کا دامن چھڑا کر سلو کے ہاتھ سے دونوں کپ تھام لیے تھے۔ ”میں جاؤں استاد؟“

”ہوں! آجاؤ۔“ عدیل نے سلو سے نظر ملائے بغیر کہا تھا۔ ”ٹھیک ہے استاد! کرلو موجدال۔“ سلو آہ بھر کے کتا ہوا واپس چلا گیا اور اس کی یہ سرگوشی نما آہ سن کر عدیل مسکراہٹ دیا گیا۔

”یہ بیچے چائے۔“ اس نے کپ مدحیہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔ ”تھینکس۔“ مدحیہ دو دھیا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چائے کا وہ چھوٹا سا کپ تھام لیا اور عدیل اس کے ہاتھ کی خوبصورتی دیکھ کے رہ گیا۔ دودھ کی طرح سفید ملائم اور گداز ہاتھ عدیل کی نظروں کو بھٹکا گئے تھے۔

”ہوں! اچھی چائے ہے اور اسٹرائنگ بھی۔“ مدحیہ نے چائے کا سب لینے کے فوراً بعد تعریف کی تھی۔ ”تنی زیادہ محنت اور تھکن کے بعد اسٹرائنگ چیزیں ہی ہماری ترجیح ہوتی ہیں جو تھکے ہارے جسم سے ساری تھکن نچوڑتی ہیں اور دل و دماغ ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔“ عدیل نے بھی چائے کا سب لیا۔

”آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟“ مدحیہ کے ذہن میں انکا ہوا سوال باہر آیا تھا۔ ”کیونکہ میں اپنے گھر کا واحد تغیل ہوں، پانچ بہنوں کا بھائی اور ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ اس لیے محنت تو مجھے فرض ہے۔“ وہ لا پرواہی ظاہر کر رہا تھا۔

”لیکن آپ کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہیں؟“ وہ فوراً بولی۔ ”بہت کوشش کی تھی کرنے کی، یہاں تک کہ خود کشتی بھی، لیکن اللہ کو خود کشتی کرنا پسند نہیں ہے اس لیے اس نے مجھے خود کشتی کے کام سے ہٹا کر یہاں بھیج دیا شاید اسے میرے لیے یہی پسند تھا۔“ اس نے کندھے جھٹکے تھے۔

”لیکن یہ کام آپ کو سوٹ نہیں کرتا۔“ وہ بے ساختگی سے بولی تھی۔ ”ہمیں زندگی میں بہت سے کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو ہمیں سوٹ نہیں کرتے، جیسے آپ بھی دیکھ لیں کہ آپ کا یہاں آنا سوٹ نہیں کرتا، لیکن پھر بھی آپ کو آنا پڑا ہے کیونکہ آپ کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا بالکل اسی طرح میرے پاس بھی یہاں آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔“ عدیل کے لہجے میں ہلکی تلخی کی آمیزش تھی۔

”لیکن کام کا کوئی اسٹینڈرڈ تو ہونا چاہیے؟“ ”دیکھیے میڈم! ایسی بات وہی بندہ سوچ سکتا ہے جو ہر لحاظ سے آزاد ہو، بے فکر ہو، حالات اور مشکلات میں پھنسا ہوا آدمی یہ سب نہیں سوچ سکتا اس کی عقل اور شعور تو مسائل سے ہی مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مجبوری معیار نہیں دیکھتی۔ مجبوری یہ نہیں سوچتی کہ کیا معیاری ہے؟ اور کیا غیر معیاری ہے؟

مجبوری کہتی ہے کرو۔ وہ سب کرو جو تمہارے اختیار میں ہے۔ چاہے وہ معیاری ہے یا غیر معیاری، اچھا ہے یا برا حلال ہے یا حرام؟ بس تم نے کرنا ہے کیونکہ میرا نام مجبوری ہے اور محبت کی طرح مجبوری بھی اندھی ہوتی ہے کچھ بھی نہیں دیکھتی، مقام، مرتبہ، معیار کبھی نہیں دیکھتی سب کروا لیتی ہے بلکہ وہ کام بھی کروا تی ہے جو کام انسان سے کبھی محبت بھی نہیں کروا پاتی اس لیے اور دیگر مجبوروں کی طرح میں بھی اس مجبوری کے ہاتھوں مجبور ہوں وہ سب کرنے کے لیے جو شاید میرے معیار کا نہیں ہے۔“ عدیل کے تفصیلی اور تلخ سے جواب پہ مدحیہ چپ چاپ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے لفظ لفظ میں سچائی اور چیخ تھی وہ اب کچھ کہتی بھی تو کیا کہتی؟

”خیر! چھوڑیں اس بات کو۔ آپ کو ایک بات بتانا ہوں۔“ عدیل نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ اور چائے کا سب لیتے ہوئے مدحیہ کو کچھ بولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

”کیا؟“ ”مدحیہ نے بھی چائے کا سب لیتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔ ”آپ اس وقت بہت ”اپنی“ سی لگ رہی ہیں۔“ عدیل اظہار کے بنا نہیں رہ سکا اور مدحیہ نے یکدم پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ مسکرا رہا تھا اس کی مسکراہٹ میں کئی رنگ تھے کئی معنی تھے۔ وہ نظر جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔ عدیل اس کی حرکت پہ قہقہہ لگاتا، اگر اسے مدحیہ کا ڈرنہ ہوتا وہ کسی بھی وقت اپنا ٹیمپو لوڑ کر سکتی تھی اسی لیے وہ سنبھل گیا اور اپنا قہقہہ دبا گیا اور ہمیشہ اعتماد سے بات کرنے والی انتہائی بولڈ سی مدحیہ نہ جانے کیوں اس لمحے نروس ہو گئی تھی۔

”اوکے! میں اب چلتی ہوں۔“ وہ چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”آئندہ کی امید بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟“ وہ بلا ارادہ پوچھ بیٹھا۔

”کیا آئندہ بھی آنا چاہیے؟“ ”یہ سوال تو آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔“ ”لیکن! میں یہ سوال آپ سے کر رہی ہوں۔“ وہ عدیل پہ نظریں جما چکی تھی۔

”کیا میرے جواب کی اہمیت ہے آپ کی نظریں؟“ ”ہے تو پوچھ رہی ہوں نا۔“ ”تھینک یو! پھر میں تو کہوں گا آپ کا جب بھی دل چاہے آپ آئیں میرے گھر سے دل تک تمام دروازے کھلے ہوئے ملیں گے آپ کو۔“ اس نے خوشدلی سے بازو پھیلا کر کہا۔

”وجہ؟ اتنی عنایت کس لیے؟“ وہ اسے کھوجنا چاہتی تھی۔ ”آئی جاتی رہیں گی تو وجہ بھی بتا چل جائے گی۔“ وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

”تھینک یو! پھر میں تو کہوں گا آپ کا جب بھی دل چاہے آپ آئیں میرے گھر سے دل تک تمام دروازے کھلے ہوئے ملیں گے آپ کو۔“ اس نے خوشدلی سے بازو پھیلا کر کہا۔

”وجہ؟ اتنی عنایت کس لیے؟“ وہ اسے کھوجنا چاہتی تھی۔ ”آئی جاتی رہیں گی تو وجہ بھی بتا چل جائے گی۔“ وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔



”او کے! گڈ بائے۔“ وہ کہہ کے پلٹ گئی اور اپنے گلاسز والوں میں اٹکا لیے تھے اور گاڑی کے قریب جا کر دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے روڈ تک لے گئی۔ عدیل اسے دور تک دیکھتا رہا جیسے ہی اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوئی وہ واپس پلٹا تھا لیکن یکدم گڑبڑا گیا کیونکہ وہ تینوں عین اس کے پیچھے کھڑے تھے اور عدیل کو گھور رہے تھے وہ جان بوجھ کر بال سہلاتا ہوا کترا کے ان کے پاس سے گنٹاتا ہوا گزر کر آگے بڑھ گیا۔

کیوں ماہیہ دایکوں ڈھولے دا گلہ کراں  
او میں تان لکھ واری بسم اللہ کراں۔

”استاد۔“ اس کے گنٹانے پہ چھوٹا یکدم چیخ اٹھا اور خونخوار انداز میں اس کی سمت لپکا تھا اور جواباً ”وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔“

\*\*\*

”پلیز بھابی۔! ایک منٹ میں کچھ بھول گئی ہوں۔“ زری گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے یکدم رک گئی۔ عبد اللہ سارا سامان گاڑیوں میں رکھوا رہا تھا دھنکے بعد ان کی فلائٹ تھی۔

”کیا بھول گئی ہو؟“ نگارش بھی ٹھٹک کے رک گئی۔

”جائے نماز۔“ زری نے کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے۔

”جائے نماز۔؟“ نگارش کو حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں بھابی! میری جائے نماز جس پہ میں نماز پڑھتی ہوں۔“

”لیکن زری! جائے نماز تو پاکستان سے بھی مل جائے گی؟“

”یہ جائے نماز کہیں سے بھی نہیں ملے گی بھابی۔“ زری گھر کے کوریڈور میں داخل ہو چکی تھی۔

”کیا مطلب؟“ نگارش کو بھلا کیا پتا تھا۔

”مطلب آگرتا ہوں۔“ زری بغیر رکے اور بغیر پیچھے پلٹے کہتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی اور نگارش وہیں دہلیز میں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

”نگارش! کھڑی کیوں ہو؟ گاڑی میں بیٹھو۔“ گاڑی کے قریب کھڑے عبد اللہ نے آواز دی۔

”وہ زری آجائے تو۔“ نگارش بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی۔

”کیوں؟ زری کہاں گئی ہے؟“ عبد اللہ بھی زری کی غیر موجودگی پہ چونکا۔

”اند رگنی ہے کچھ بھول گئی تھی شاید۔“

”اسی لیے میں نے تم لوگوں سے کہا بھی تھا کہ سب کچھ دوبارہ چیک کر لینا تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔“ عبد اللہ خفگی سے کہتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سامان والی گاڑی اس نے خود ڈرائیو کرنی تھی اور جس گاڑی میں زری اور نگارش نے جانا تھا وہ گاڑی نگارش کے بھائی نے ڈرائیو کرنا تھی۔

”آئی! آپ بیٹھیں تب تک وہ بھی آجاتی ہیں۔“ شیراز (نگارش کا بھائی) نے آگے بڑھ کے نگارش کو بیٹھنے کا کہا۔ لیکن نگارش کو بے چینی ہو رہی تھی کہ کہیں زری دیر نہ لگا دے اور وقت کی کمی کی وجہ سے عبد اللہ غصہ نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہی تھی۔

”بیچے بھابی! میں آگئی۔“ زری تیزی سے قدم اٹھاتی گھر سے باہر نکل آئی تھی اور تب جا کے نگارش کا سانس بحال ہوا تھا۔ اور دونوں نے قدم گاڑی کی سمت بڑھا دیے تھے شیراز ان کے پیچھے گھر کا دروازہ لاک کیا اور آکر

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

”اب بتاؤ ایسا کیا ہے اس جائے نماز میں کہ عین ٹائم پہ تمہاری جان اٹک گئی تھی؟“ گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی نگارش کا سوال بھی سامنے آگیا۔

”اس جائے نماز میں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔“ زری نے نیلے رنگ کی دبیز رو والی ویلوٹ کی مٹلی جائے

نماز بہ بڑی عقیدت۔ اور محبت سے ہاتھ پھیرا۔

”کیسا اثاثہ؟“ نگارش کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

”آج سے تین سال پہلے اسی جائے نماز پہ اس نے (دل آور شاہ) نماز پڑھی تھی آپ کو یاد ہو گا عبد اللہ بھائی کا ایک سیلنٹ ہو گیا تھا کافی چوچیں آئی تھیں اور اس دن وہ اور نیل ہمارے گھر ہی ٹھہر گئے تھے، آپ دوسرے بیڈ روم میں تھیں، جلدی سو گئی تھیں لیکن میں جاگ رہی تھی وہ عبد اللہ بھائی اور نیل کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی تو میں کیسے سو سکتی تھی بھلا؟ اور جب ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ اٹھ کر باہر نکل آیا وہ نماز پڑھنا چاہتا تھا اور جائے نماز ڈھونڈ رہا تھا اس نے پہلی بار کوئی چیز مانگی تھی اور وہ تھی جائے نماز۔ وہ وضو کر کے آیا تھا اور میں نے اسے اپنی جائے نماز دی تب اس نے اس جائے نماز پہ عشاء کی نماز پڑھی تھی اللہ کو سجدہ کیا تھا وہ اللہ کے حضور جھکا تھا اور میرا دل اس کے حضور جھک گیا تھا اس وقت ان لمحات میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جائے نماز بچھا کے نہیں۔ بلکہ میرے دل کو بچھا کے میرے دل پہ قدم جما کے کھڑا اپنے رب کو سجدہ کر رہا ہے، دل میرا تھا۔ قدم اس کے تھے۔ اور سجدہ اللہ کا تھا۔ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے نا وہ میرے دل پہ کھڑا اللہ کو سجدہ کر رہا تھا اور تب سے اب تک اس کے قدم میرے دل پہ ہیں، میرا دل نیچے ہے اور اس کے قدم اوپر۔ وہ جب جب قدم اٹھا کے چلتا ہے میرا دل تب تب نیچے ہی نیچے دیتا چلا جاتا ہے اس جائے نماز میں اور میرے دل میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ اس کا رنگ نیلا ہے اور میرے دل کا رنگ سرخ۔“ زری انتہائی مدنم و دھیمی اور سحر انگیز آواز میں بولتی ہوئی نگارش کو ششدر سا کر چکی تھی نگارش کے دل و دماغ سے دھواں نکل گیا تھا۔ یہ عشق اور جنوں کی کون سی منزل تھی جہاں یہ زری جا پہنچی تھی؟ اور اس منزل پہ پہنچنے کے بعد حاصل کیا تھا؟ ایک اور مسافت؟ یا ایک اور منزل۔؟ نگارش کا دل اس سوچ سے ہی دھل گیا تھا اسے جھرجھری سی آگئی تھی۔

”یا اللہ! اس بگلی پہ اپنا رحم فرما۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

”آپ میرا اثاثہ پوچھتی ہیں کیا یہ اثاثہ کم ہے کہ اس جائے نماز پہ اس کے سجدے کا لمس ہے اس کی پیشانی کا غور ہے اس میں۔ میرے ہزاروں سجدے اور اس کا ایک سجدہ ہے اس جائے نماز میں اس سے بڑھ کر میرا اثاثہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ اور میں اسے ہی یہاں بھول جاتی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟“ زری نے بڑی محبت بڑی چاہ اور بڑے جذب سے کہتے ہوئے اس جائے نماز کو اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ میں رکھ دیا۔

”یہ بیگ ایئر پورٹ پہ جا کر میں نے اپنے اپنی میں رکھنا ہے تاکہ محفوظ رہے۔“ وہ پہلے سے ارادہ باندھ رہی تھی اور نگارش کو یاد آ رہا تھا کہ زری نے یہ جائے نماز کبھی کسی کو نہیں دی تھی اس پہ صرف وہ خود نماز پڑھتی تھی اور آئندہ بھی اس نے اسی میں نماز پڑھنا تھی اسی لیے تو وہ ساتھ لے کر جا رہی تھی۔

آوھے، پون گھنٹے میں وہ لوگ ایئر پورٹ پہنچے تھے، نگارش کے پیرٹس اور بہن بھائی پہلے سے وہاں موجود تھے بس شیراز ان کے ساتھ تھا، نگارش پہلی بار پاکستان جا رہی تھی اس لیے وہ سب ہی سی آف کرنے آئے تھے، فلائٹ میں ٹائم کم رہ گیا تھا اس لیے عید اللہ اور شیراز کو کافی بھاگ دوڑ کر ناپڑی تھی سامان کلیئر کروا کے خود بھی ان ہونا تھا اس لیے کافی جلدی مچی ہوئی تھی اور سب کچھ اوکے ہوتے ہی وہ سب مل کر ایئر پورٹ کے اندرونی حصے کی سمت بڑھ گئے تھے، زری بار بار انگلیٹ کی فضاؤں میں دیکھ رہی تھی، انگلیٹ اس کی محبت کی جائے پیدائش تھی وہ



انگلینڈ کو کیسے بھول سکتی تھی بھلا؟ اور یونہی آنکھوں میں آنسو لیے وہ نگارش کا ہاتھ تھا جسے جہاز کا زینہ طے کر گئی لیکن اپنی سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پہ نظر پڑتے ہی وہ جمی گئی۔ ملک اسد اللہ بھی اسی فلائٹ سے واپس پاکستان جا رہے تھے زری کو دیکھ کر ان کے چہرے پر کرخش آگئی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔

\*\*\*

وہ اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھا ایک اہم کیس اسٹڈی کر رہا تھا جب اسٹڈی روم کے دروازے پہ کسی نے ناک کیا۔

”میں کم ان۔“ اس نے اپنے سامنے پھیلی فائل کو بند کرتے ہوئے اجازت دی اور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی گلاب خان دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تھا۔

”سلام صاحب۔“ گلاب خان نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ آؤ۔“ دل اور اپنی توجہ اس پہ مرکوز کر چکا تھا۔

”صاحب! آپ سے کچھ کہنا تھا، اگر آپ غصہ نہ کریں تو۔“ گلاب خان کالجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھا اور دل اور شاہ کا ڈر بھی تھا۔ اس نے گلاب خان کو حیرت سے دیکھا تھا۔

”تمہیں بتا ہے گلاب خان جائز بات پہ میں غصہ نہیں کرتا۔“ اس نے گلاب خان کو آگاہ کیا۔

”صاحب! یہ بات بھی جائز بات ہی ہے۔“

”تو پھر بے فکر ہو کر کہو۔ کیا کہنا ہے؟“ اس نے اپنا پین بند کر کے کتاب کے درمیان رکھتے ہوئے کتاب بھی بند کر دی تھی۔

”صاحب! میرا اس بات سے کوئی تعلق تو نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی حق ہے کہ میں آپ کے کام میں مداخلت کروں، لیکن صاحب اللہ کا بندہ ہوں، انسان ہوں اور انسان کے دماغ میں خیال آتے دیر نہیں لگتی، اچھے برے سب خیال آتے ہیں، خیال آتا ہے تو احساس جاگتا ہے اور میرے دل و دماغ میں بھی یہ احساس جاگ رہا ہے کہ وہ لڑکی جسے آپ نے ہسپتال میں بند کر رکھا ہے وہ اگر بھوک پیاس سے مرگئی تو اللہ میری پکڑ ضرور کرے گا اور میرا ضمیر بوجھ تلے دب جائے گا کیونکہ وہ لڑکی آپ کی گناہ گار اور مجرم سہی، آپ کی اس سے نفرت اور دشمنی سہی، لیکن میری تو نہیں ہے نا؟ میں تو اس کے لیے کچھ کر سکتا تھا نا؟ کیونکہ اس کے قید خانے کی چابی میری جیب میں ہے۔ میں اس کے لیے اس قید خانے کا دروازہ نہیں کھول سکتا کیونکہ مجھے آپ کا ڈر ہے اور جب مجھے آپ کا اتنا ڈر ہے تو کیا اللہ کا ڈر نہیں ہے؟ آپ مجھ سے پوچھ کچھ کر سکتے ہیں تو اللہ بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ میں آپ کا نوکر اور اس کا بندہ ہوں، اس لیے آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ میں نہ تو آپ سے چھپ کے کچھ کر سکتا ہوں اور نہ ہی اس کی ذات سے چھپ سکتا ہوں، اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں، بڑی مشکل میں ہوں، برے خیال آرہے ہیں۔“ گلاب خان سر جھکائے کھڑا وہ سب کہہ چکا تھا جو وہ دل سے کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دل اور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ بالکل خاموش! چند ثانیے وہ خاموش رہنے کے بعد گہری سانس کھینچتا ہوا اٹھا اور اپنے اسٹڈی روم کی دیوار گیر کھڑکی کے تمام پردے ہٹا دیے تھے اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا، باہر سیاہ اندھیرا تھا۔ اتنا سیاہ تھا دل اور شاہ کے اندر تھا۔

”سگریٹ اور لاٹرو۔“ اس کی بھاری۔۔۔ آواز ساٹ تھی۔

”جی صاحب! گلاب خان نے فوراً آگے بڑھ گئے اس کی رائٹنگ ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور لاٹرو اٹھایا اور اسے پیش کر دیا۔ دل اور نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پھر اسے لاٹرو کا شعلہ دکھادیا۔ اور ایک

گہرا کش لیتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ اور لاٹرو دوبارہ گلاب خان کی سمت بڑھا دیا تھا اور گلاب خان ان کو واپس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے دوبارہ اپنی سابقہ جگہ پہ جا کھڑا ہوا تھا۔

”تو تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ اب کی بار تو دل اور کے لہجے میں بھی دھواں تھا۔

”اجازت! صاحب صرف اجازت۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”کس چیز کی اجازت؟“

”صاحب! اس لڑکی کو روٹی پانی دینے کی اجازت۔“

”صرف روٹی پانی؟“

”جی صاحب! صرف روٹی پانی۔“ گلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مگر کل کو تمہیں اس کی کسی اور ضرورت کا خیال آگیا تو؟“ دل اور نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی نظریں گلاب خان کی بجائے اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبے سگریٹ پہ تھیں۔

”صاحب! روٹی اور کپڑے کے سوا انسان کی اور کوئی بڑی ضرورت نہیں ہوتی ہر چیز کے بغیر گزارا ہو جاتا ہے لیکن ان دو چیزوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، فی الحال اس لڑکی کو ان دونوں چیزوں میں سے روٹی کی ضرورت ہے۔“ گلاب خان کالی سوچ سمجھ کے بول رہا تھا۔

”بھول! ٹھیک ہے، جاؤ تم اور دے دو اسے روٹی پانی، شاید تم اللہ کی پکڑ سے بچ جاؤ، اگر میری ایک اجازت سے تمہارا ضمیر سرخرو ہوتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ اس نے گلاب خان کی انکی ہوئی سانس بحال کر دی تھی گلاب خان کے کہے کا مان رکھ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے صاحب کا بہت وفادار اور تابع دار ملازم تھا کیونکہ وہ اسے بھی پروٹوکول دیتا تھا، ملازم کو ملازم سمجھ کے دھتکارنا نہیں تھا۔

”بہت بہت شکریہ صاحب! بہت زیادہ شکریہ، آپ کا یہ احسان ہے مجھ پہ۔“ گلاب خان دل سے مشکور ہوا تھا۔ ”میرا کوئی احسان نہیں ہے! لیکن گلاب خان تمہیں کیا پتا؟ اس لڑکی پہ جو بہت دیر سے تم صرف وہ دیکھ سکتے ہو، لیکن جو مجھ پہ بہت چکی ہے وہ تمہیں کبھی نظر نہیں آئے گی، تمہیں بھی خیال نہیں آئے گا اور نہ ہی کبھی احساس جاگے گا۔ تمہیں صرف یہ لگے گا کہ تمہارا صاحب ظالم ہے اور یہ لڑکی مظلوم ہے۔ شاید یہ لڑکی مظلوم ہی ہو۔ لیکن اس کی بد قسمتی یہ ہے کہ وقار آئندی کی بیٹی ہے ایک ظالم انسان کی بیٹی مظلوم کیسے ہو سکتی ہے؟ میں اس پہ ترس کھانا بھی چاہوں تو نہیں کھا سکتا گلاب خان کیونکہ اس کی رگوں میں اس کے ذیل باپ کا خون ہے جس سے مجھے اتنی نفرت ہے کہ دل چاہتا ہے اب بھی اسپتال جا کر اسپتال کے بستر پہ اس کے مفلوج اور معذور جسم کو بھی اپنے رپو الور کی گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دوں۔ اک ریت کے ذرے جتنا بھی ترس نہ کھاؤں اس پہ اور ایسی عبرت ناک موت دوں کہ ہر زمانے میں مثال دی جائے۔“ دل اور شاہ کا غضب اس کے لہجے میں بول رہا تھا اور گلاب خان بے یقین اور حیرت زدہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا وہ جواباً کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا اور پھر ذرا وقفے سے ٹھٹکا اور وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔

\*\*\*

”پانی پانی پانی۔۔۔ ماما پانی۔۔۔ مجھے پانی۔۔۔“ ڈرا۔۔۔ یوں پانی۔۔۔ گلاب خان ہسپتال کا دروازہ کھول کے نیچے آیا تو اسے وہ لڑکی فرش پہ اونڈھے منہ گری ہوئی نظر آئی اور اس کی حالت نیم بے ہوشی کی سی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں بند اور یوں اونڈھے منہ گرے ہونے کے باوجود اس کے منہ سے یہ کمزور نڈھال اور نقامت زدہ سے الفاظ نکل رہے تھے اس کی پیاس اور پانی کی طلب اتنی شدید تھی کہ وہ بے ہوش ہو کر بھی بے ہوش



نہیں ہو پار ہی تھی اس کی زبان پہ ایک سی فریاد تھی پانی اور صرف پانی! اور اس کی یہ حالت اور اس کی پیاس کا یہ عالم دیکھ کر گلاب خان کانپ کے رہ گیا۔ اس کا دل مٹھی میں آگیا، ذات کا پٹھان تھا، خالص پٹھان، اس لیے اس کے حمیر میں نرمی اور سختی کا تناسب برابر پایا جاتا تھا اور اس وقت اس کی ذات پہ نرمی اور خوف خدا کا سایہ بنا ہوا تھا اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔

”بی بی جی! بی بی جی! آنکھیں کھولیں بی بی جی۔ میں پانی لے کر آیا ہوں آپ کے لیے۔“ گلاب خان روزانہ اس کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھ گیا اور نیم بے ہوش بڑی علیزے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی قبر میں دبی ہوئی ہے اور کوئی اسے قبر سے باہر کھڑا آوازیں دے رہا ہے جس کی ہستہ ہم سی آواز اس کی سماعتوں تک بمشکل پہنچ رہی تھی اس کا چہرہ فرش پہ تھا اس کے چہرے کی ایک سائید فرش سے جڑی ہوئی یوں جیسے اس کے چہرے کا ایک حصہ اور فرش کی سطح آپس میں پیوست ہو چکے ہوں اور فرش کی ساری ٹھنڈک اس کے چہرے میں منتقل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت برف کی طرح سرد اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور وہی نیلے ہونٹ پیاس کی شدت سے لرز رہے تھے۔

”پانی! پانی! پانی! مجھے پانی!۔۔۔۔۔“ اس کے منہ سے نامحسوس سی آواز نکل رہی تھی جو بمشکل سنی جاسکتی تھی۔

”بی بی جی! میں پانی لے کر آیا ہوں نا آپ کے لیے۔ آپ انھیں پانی پی لیں۔“ گلاب خان نے دوبارہ کہا تھا لیکن اس میں کچھ کہنے سننے کی سکت ہوتی تو وہ جواب دیتی یا اور خود سے اٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا جسم نقاہت سے بے جان ہو چکا تھا اور اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس فرش سے کروٹ بدل کر سیدھی ہو جاتی۔

”گلاب خان! لگتا ہے کہ کبھی کبھی ہی عقل سے کام لیتے ہو؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ خود اٹھ سکتی ہیں؟“ گلاب خان کے قریب ہی گل کی آواز سنائی دی تھی اور گلاب خان چونک گیا۔

”تم یہاں؟“

”ہاں! میں یہاں۔“

”لیکن! تم یہاں کیوں آئی ہو۔ صاحب غصہ کریں گے۔“ اس نے گل کو خفگی سے گھورا تھا۔

”میں بس یہ دیکھنے آئی تھی کہ یہ بی بی جی زندہ ہیں یا مر گئیں؟“

”اللہ معافی دے! یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ گلاب خان نے جھرجھری سی بی۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے لاڈ میں انہیں اٹھاتی ہوں۔“ گل سر جھٹک کر آگے بڑھی اور پھر نیچے بیٹھ کر علیزے کو مضبوطی سے سہارا دے کر سیدھا کیا تھا اور ایک ہی پوزیشن میں اتنے گھٹنے پڑے رہنے کے بعد جسم کو حرکت ملی تو وہ تکلیف سے کراہ اٹھی تھی اس کو سیدھا کر کے دیکھا تو اس کے چہرے کا زاویہ ٹیڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ گل نے اپنے دوپٹے سے اس کی پیشانی رخسار اور ہونٹ صاف کیے تھے جن پہ فرش کی گرد جم گئی تھی۔

”ہپ! پانی!۔۔۔۔۔“ اس کی ہونٹوں کی جنبش پہ گل نے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

”گلاب خان! ان کی حالت تو بہت خراب ہے؟“ گل نے کافی تشویش سے کہا تھا۔

”جو کچھ بھی کرنا ہے یہیں کرنا ہے، ڈاکٹر کی امید مت رکھو، اتنی اجازت نہیں ہے ان کے لیے۔“ گلاب خان اپنی بیوی کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔

”یہاں پہ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟“ گل باپوس ہوئی تھی۔

”دکوشش کریں تو سب ہو سکتا ہے، تم فوراً جاؤ اور ان کے لیے چائے بنا کر لاؤ، چائے کی گرمائش سے یہ قدرے ہوش میں آجائیں گی لیکن ٹھہرو۔ پہلے انہیں یہ پانی پلا دو۔“ گلاب خان نے جب سے پانی انڈیل کر گلاس

گل کو تھام دیا تھا۔

”بی بی جی! ذرا آسرا لیں اور یہ پانی پی لیں۔“ اس نے علیزے کو ذرا سا سہارا دے کر اونچا کیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا دیا تھا، علیزے کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا ہوا ہے۔ گل نے خود ہی اس کے منہ میں پانی ڈالا تھا اور چند گھونٹ اسے پانی پلانے کے بعد اس کا چہرہ اور اس کے بازو سہلانے لگی تھی اس کے جسم کو تھوڑا تھوڑا دبا کر گرمائش میں لانے کی کوشش کی تھی۔

”گلاب خان! ان کے لیے بستر کا ہونا بھی بہت ضروری ہے، یوں ٹھنڈے فرش پہ تو ٹھنڈے ہی مرجائیں گی۔“

گل کو ہر چیز کا خیال آ رہا تھا۔ ”میں بھی کچھ ہی سوچ رہا تھا۔“

”سوچو مت! کرو جاؤ لے کر آؤ۔“ گل کافی اتاؤلی ہو رہی تھی۔

”لیکن گل وہ صاحب؟“

”ارے! صاحب کچھ نہیں کہیں گے اگر کہا بھی تو تم میرا بتاؤ نا، مجھ پہ غصہ نہیں کریں گے وہ۔“ گل نے اسے سمجھایا اور گلاب خان پریشانی سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔ پھر اس نے نیچے بچھانے کے لیے فوم کا گدا اور سنکھل کبل لاکر کر دیا تھا اور گل نے بڑی وقت سے علیزے کو فرش سے ٹھیکٹ کے گدے پر لٹایا تھا اور اوپر کبل اوڑھا دیا تھا۔

”تم یہاں بیٹھو میں ان کے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں، بعد میں چائے کے ساتھ انڈے بواگل کر کے لے آؤں گی تب تک یہ ہوش میں آجائیں گی۔“ گل کہتی ہوئی گلاب خان کو دباں بٹھا کر چلی گئی تھی اور گلاب خان اس لڑکی کی بد قسمتی پہ سوچ رہا تھا وہ کتنے بڑے گھر کی بیٹی تھی، کنٹنی امیر تھی، کنٹنی لاڈلی تھی لیکن پھر بھی بد قسمت تھی اپنے باپ کا بویا کاٹ رہی تھی، اتنی آسانٹوں میں زندگی گزارتے ہوئے اسے کیا پتا تھا اسے آگے جا کر اپنے باپ کے کیے کا بھگتان بھی بھگتنا ہے؟ اسے کیا خبر تھی کہ جو آسانٹاں اور مراعات اسے اس کے باپ نے دے رکھی ہیں وہ اس کے باپ کی وجہ سے ہی چھن جائیں گی؟ وہ مخملی بیڈ سے زمین کی سخت سطح پر آجائے گی اس کا نرم و نازک وجود زمین کی سختی سہہ نہیں پائے گا بلکہ اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اور اس پہ یہ عذاب دیکھ کر گلاب خان کو بہت دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔

”گلاب خان! گل کی آواز پہ وہ بری طرح چونکا تھا۔ وہ چھوٹی سی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟ بی بی جی کو دیکھو۔ وہ ہوش میں آرہی ہیں شاید۔“ اس نے گلاب خان کو متوجہ کیا۔

”ہاں! ہاں! تم ان کو یہ دودھ پلاؤ، ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔“ اس نے فوراً کہا تھا اور گل دوبارہ علیزے کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس نے چمچ کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کے منہ میں دودھ ڈالنا شروع کیا تھا دودھ نیم گرم تھا جس کی تراوٹ سے علیزے کے سن ہوئے حواس واپس آنے لگے تھے اور لگا تار دھکے کی دیکھ بھال کے بعد وہ مکمل ہوش میں آچکی تھی۔ اب اسے خوراک کی ضرورت تھی کیونکہ معدہ خالی تھا۔

”آج زلفی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے لیے وال چاول بنائے تھے آپ کو اگر بھوک لگی ہے تو آپ کے لیے لے آؤں؟“ گل نے اسے تکیے کے سہارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھاتے ہوئے استفسار کیا تھا اور کھانے کے لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا ٹک گیا دو تین دن پہلے اس نے دل اور شاہ کی طرف سے بھیجا ہوا کھانا ٹھکرا دیا تھا اور کھانا سے منہ موڑ کر کبھی نہ کھانا کھانے کا عزم کیا تھا لیکن آج وہ اس نوبت اس حال کو پہنچ چکی تھی کہ کھانے کے سوا اور کسی چیز کی طلب یا ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

آج وہ کھانے کے لیے ترس رہی تھی وہ جو بھی لے آتے وہ کھانے کے لیے تیار تھی، کیونکہ پیٹ کا دونوں خاگر



سرے تک چلا گیا۔  
 ”صاحب! بل ڈوگ پہ جب آپ توجہ دیتے ہیں تو اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔“ زلفی مسکرا کر کہتا ہوا قریب آگیا اتنے دنوں سے زلفی ہی بل ڈوگ کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن اتنے دنوں میں اس نے ایک بار بھی بل ڈوگ کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا جتنا اس وقت دیکھ رہا تھا۔  
 ”اسے مجھ سے پیار ہی بہت ہے اسی لیے تو اسے انگلیڈ سے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔“ دل اور مسکرایا تھا۔  
 ”حالانکہ آپ کو انگلیڈ سے اسے لانے کی بجائے ایک میم لانی چاہیے تھی۔“ زلفی کی بات پہ دل اور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

”میم اس لیے لے کر نہیں آیا کہ شاید میم اتنی وفادار نہ ہوتی جتنا یہ وفا دار ہے۔ وہ دوبارہ واپس جانے کی ضد کرتی، شور کرتی، ہنگامہ کرتی جبکہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کی ضد کرنی ہے اس ملک کا ہر سرد گرم اس نے میرے ساتھ ہی سہنا ہے اور میری ذرا سی توجہ پہ یوں خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ جیسے پہلے کبھی خوش ہی نہ ہوا ہو۔“ دل اور کی دلیل پہ زلفی خوب متاثر ہوا تھا۔

”صاحب! آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ اسی لیے تو کبھی کبھی بڑا دل چاہتا ہے کہ کاش میں ”دل آر شاہ ہوتا؟“ زلفی کی خواہش سن کر اس کا فلک شگاف قہقہہ گونجا تھا جس پہ قریب آتا گلاب خان کافی حیران ہوا تھا۔  
 ”یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ کاش میں ”زلف خان“ ہوتا؟“ دل اور نے ہنستے ہوئے دلچسپی سے زلفی سے کہا تھا۔

”صاحب! میں نے یہ تو نہیں کہا؟“ وہ کھسیانا ہوا تھا۔  
 ”تو پھر اور کیا کہا ہے ہار؟ اگر تم دل آر شاہ ہوتے تو ظاہر ہی بات ہے کہ پھر میں زلف خان ہوتا۔ زلف خان نہ ہوتا تو گلاب خان ہوتا۔ لیکن جو بھی ہوتا یا دل آر شاہ نہ ہوتا۔ دل آر شاہ ہونے میں بڑی اذیت ہے۔ تم نہیں جانتے۔“ کہتے کہتے دل اور کا لہجہ بجھ گیا اس کی زبان پہ تلخی آگئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تلخی بڑھتی اس کے سیل فون پہ واٹس ایپیشن ہونے لگی۔

”گلاب خان! بل ڈوگ کے لیے دودھ لے کر آؤ اس کا بریک فاسٹ دوا سے۔“ دل اور نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی زلفی بھی وہاں سے چپ چاپ پلٹ گیا۔  
 ”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! گڈ مارننگ۔“ دوسری طرف کی آواز نیل کی تھی۔  
 ”صبح بخیر۔“ دل اور کا انداز سنجیدہ تھا۔  
 ”کیا ہو رہا ہے؟“ نیل نے کافی فریش لہجے میں پوچھا۔

”کیوں؟ کیا ہونا چاہیے؟“ دل اور نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا تھا۔  
 ”بے چینی۔“ نیل کی آواز بھی کچھ مضطرب اور بے چین ہی لگ رہی تھی۔  
 ”بے چینی؟ مطلب؟“ دل اور سمجھ نہیں پا رہا تھا۔  
 ”یار! کیا تمہیں نہیں پتا کہ آج عبداللہ آرہا ہے؟“ نیل خفگی سے جھنجھلایا تھا اور دل اور کو ہر چیز سمجھ میں آگئی تھی۔

”اوہ اچھا! عبداللہ۔“ اس نے لفظ کو کافی لمبا کھینچا تھا۔  
 ”ہاں یار عبداللہ۔! کیا تمہیں نہیں یاد تھا؟“ نیل کو حیرت ہوئی تھی۔  
 ”یاد تھا۔! لیکن بے چینی نہیں تھی۔“ دل اور سکون سے بولا۔

بھرا نہ جائے تو بڑے بیوں کو شکست خوردہ، غڈ حال، کمزور اور بے جان کر ڈالتا ہے اور وہ تو تھی ہی نازک اندام سی موم کی گڑیا جس نے کبھی ایک منٹ بھی بھوک برداشت نہیں کی تھی جس کے ایک اشارے پہ رجو کھانے کے تمام لوازمات اور تمام ڈانٹنے پھیلنے پہ سجادتی تھی ایک وقت کے کھانے میں کئی ڈشز تیار ہوتی تھیں اور وہ محض برائے نام کھانا کھاتی تھی لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب پیٹ بھر کے کھانا کھائے اور اس کے بے جان جسم میں پھر سے طاقت اور توانائی آجائے کیونکہ وہ پیٹ کے دونخ کا یہ عذاب سہار نہیں پار ہی تھی ایک ایسا عذاب جو لوگوں سے قتل کروا لیتا تھا چوری اور ڈاکے پہ مجبور کر ڈالتا تھا صرف اس لیے کہ پیٹ کا یہ دونخ خالی نہ رہے نہ انسان کا اپنا نہ انسان کے اپنوں کا۔ پیٹ کی آگ ایسی آگ تھی کہ انسان ہر آگ میں کوونے کے لیے تیار ہو جاتا تھا کیونکہ بھوک اللہ نے ایک ایسی چیز بنائی ہے جس کے سامنے طاقت ور اور کمزور انسان یکساں غڈ حال ہو جاتے تھے جس کو سہنا کسی بھی ذی روح کے بس میں نہیں تھا اس میں اتنی طاقت تھی کہ انسان کی اتنا غیرت، عزت، غرور اور آن سب کچھ ڈھیر ہو سکتا تھا یہاں تک کہ انسان خود بھی۔!

”لےجی بی بی جی۔! کھانا کھا لیجئے۔“ گل نے کھانے کی ٹرے لا کر اس کے سامنے نیچے فرش پہ ہی رکھ دی تھی اور علیزے نے چونک کر زمین پہ رکھی ٹرے اور ٹرے میں رکھے وال چاول کی پلیٹ دیکھی تھی اور علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا۔ گل نے پلیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور علیزے نے اپنی کم مائیگی کے باوجود بڑے بے صبر سے انداز میں چاول کھانا شروع کر دیے تھے لیکن اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اس سے چچہ نہیں پکڑا جا رہا تھا ہاتھ میں پکڑی پلیٹ بھی لرز رہی تھی بلکہ یہاں تک اس کے حلق تو الٹ بھی نیچے نہیں اتر رہا تھا مگر وہ پھر بھی پلیٹ تھوڑی دیر کے لیے رکھ دینے پر آمادہ نہیں تھی یوں جیسے اس سے یہ کھانا بھی چھن جائے گا اور پھر تین چار نوالے کھانے کے بعد جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس نے تھک کے پلیٹ واپس نیچے فرش پر رکھ دی اور لرزتے کانٹے وجود کے ساتھ وہ بے ساختہ اپنے حال اپنی کیفیت پہ رو پڑی اور کھانا چھوڑ کر اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ یوں بلک بلک کر روئی تھی کہ گل اور گلاب خان کے دل بھی کانپ گئے۔ گل کافی دیر اسے تسلی اور دلا سے دیتی رہی لیکن علیزے کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے کئی خیال رلا رہے تھے جن میں یہ خیال سرفہرست تھا کہ وہ وقار آندی کی بیٹی ہو کر کھانا کھانے کے لیے ترس رہی ہے؟ اس کے پاپا کو پتا چلے گا تو وہ مرجائیں گے۔ ان کی علیزے بھوکی تھی۔ ان کے لیے یہ احساس مرجانے کے برابر تھا۔! علیزے نہ جانے کتنی دیر تک پونہی روئی رہی اور پھر بہت بعد میں گل اور گلاب خان اسے تسلی دے کر چلے گئے تھے البتہ جاتے جاتے کھانا اور پانی وغیرہ پاس رکھ گئے تھے جس کو دیکھ کر علیزے کی آنکھیں پھر سے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ اتنی آسائشوں کے بعد غریبی کا یہ وقت کاٹنا بے انتہا مشکل تھا۔ اس کا رونا بلکنا بجا تھا۔

\*\*\*

وہ فجر کی نماز پڑھ کے واپس گھر آیا تو بل ڈوگ نے اسے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔  
 اس نے ٹھنک کر دیکھا تھا بل ڈوگ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اتنے دن ہو گئے تھے اس نے بل ڈوگ پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور یہی سوچ کر وہ اس کی جانب آگیا اور بل ڈوگ اسے دیکھ کر بڑے لاڈ سے دم ہلانے لگا تھا۔ اس کے اوہراوہر شہلے کی چال بھی بدل گئی تھی۔  
 ”کیسے ہو شیرو؟“ اس نے بل ڈوگ کے قریب آ کر اسے سہلایا تھا اور اس کی کھسپائی ہوئی سی غرغراہٹ سنائی دینے لگی گویا وہ اس موٹے سنگل سے آزاد ہونا چاہتا تھا کہ دل اور نے آگے بڑھ کر دیوار میں نصب کھونٹے سے اس کی سنگل کھول دیا تھا۔ اور بل ڈوگ خوشی کے اظہار کے طور پہ لان کے ایک سرے سے بھاگتا ہوا دوسرے



”کیوں نہیں تھی؟“  
 ”کیونکہ تمہیں جو ہے۔“ دل اور کے جواب پہ نیل ٹھٹک گیا۔  
 ”کیا تمہارا دوست نہیں ہے؟“  
 ”صرف دوست ہے نا۔“ اس کا ہر جواب الٹا تھا۔  
 ”تو میرا اور کیا ہے؟“

”یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے جسے بے چینی ہو رہی ہے۔“  
 ”اف! میں نے غلط کیا صبح صبح تمہیں فون کر کے۔“ نیل زچ ہو گیا۔

”تو تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم اتنی صبح صبح فون کر کے مجھ سے میری بے چینی پوچھو؟ ویسے اگر میں نے تمہیں اپنی بے چینی بتا دی تو تمہاری ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔“ دل اور کا لہجہ مبہم تھا نیل کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔  
 ”چھا خیر! یہ بتاؤ کہ ان کو ریسیو کرنے کے لیے گھر سے کب نکلنا ہے؟“ نیل نے اگلا سوال کیا۔

”نوبے۔“  
 ”ارے کیوں؟ نوبے کیوں؟ آٹھ بجے نکلتے ہیں نوبے لیٹ ہو جائیں گے۔“ نیل کو جلدی اور بے چینی ایک ساتھ لاحق ہوئی تھیں۔

”کیوں ایئر پورٹ پر جا کر میں نے پروازوں کی گنتی کرنی ہے جو آٹھ بجے ہی پہنچ جاؤں؟ ہاں اگر تمہیں اتنی جلدی اور اتنی بے چینی ہے تو تم جاسکتے ہو، میں بعد میں آ جاؤں گا۔“ دل اور کے جواب پہ نیل بے چارہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔  
 لیکن اندر ہی اندر اس نے تلملا بھی رہا تھا مگر افسوس کہ کچھ نہیں سکتا تھا۔

”اوکے! نوبے ہی چلیں گے۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔  
 ”گڈ! جلدی عقل آگئی نہیں۔“ دل اور مسکرا کے بولا تھا۔

”دل اور! تو بڑا ذلیل ہے! اللہ کرے کہ تیرا حال بھی کبھی میرے جیسا ہو۔“  
 ”کیوں؟ تمہارے حال کو کیا ہوا ہے؟ کوئی خاص وجہ؟“ اس کے انجان بن کے کہے جانے والے سوال پہ نیل گڑبڑا گیا۔

”نن! نہیں! کچھ نہیں ہوا بس ایسے ہی۔“ نیل ٹال گیا تھا۔  
 ”ٹھٹک ہے پھر! اللہ حافظ۔“ دل اور نے بات سمیٹی تھی۔  
 ”اوکے! گڈ بائے۔“ نیل نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا لیکن اندر راہداری کی سمت بڑھتے ہوئے دل اور نیل ہی سوچ رہا تھا کیونکہ نیل اس کو سوچ رہا تھا جو دل اور کو سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ عالم شوق کا وہ کھانا جائے  
 وہ بت ہے پا خدا دیکھانہ جائے  
 یہ آج کن نظروں سے تو نے دیکھا  
 کہ تیرا دیکھنا دیکھانہ جائے۔

زری کی نگاہیں تھیں اور دل اور شاہ مجسم تھا۔ یہ حقیقت تھی یا افسانہ تھا؟ دو عالم تھے جو زری کی نگاہوں میں ایک ہو کر ٹھہر گئے تھے پوری کائنات پر اسمِ محبت پھونک دیا گیا تھا۔ پوری کائنات اس اسم کے طلسم میں جکڑی

تھی جو جہاں تھا وہ وہیں رہ گیا تھا جہازوں کی پروازیں جہاں تھیں وہیں ساکت ہو گئی تھیں، ایئر پورٹ پہ آنے جانے والے ہزاروں مسافر اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو چکے تھے، ایئر ہو سٹس، پائلٹ اور دیگر عملہ جامد ہو گئے تھے تمام ذی نفس اپنی سانسیں روک چکے تھے کیونکہ زری کا عشق ان سب کو اس وقت ایسے حال میں ہی تصور کر رہا تھا۔ گویا وہ وہاں اکیلے تھی اور اس کے سامنے وہ بھی اکیلا کھڑا تھا باقی ساری دنیا پتھر کی ہو گئی تھی۔ انسانوں سے مجسموں میں تبدیل ہو گئی تھی اور مجسموں کے سامنے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی دنیا سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتے ہوئے سیراب بھی ہو سکتی تھی حالانکہ وہ یہ بھول گئی تھی کہ پوری کائنات حالتِ حرکت میں ہے سوائے اس کے۔  
 وہ دو سروں کو پتھر کے مجسمے تصور کر رہی تھی حالانکہ خود اس وقت پتھر ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا عشق دل اور شاہ کو اپنی آنکھوں سے چوم رہا تھا اس کی آنکھوں نے اس کے اک اک نقش پہ بوسہ دیا تھا اس کے پاؤں پہ اس کے ہاتھوں پہ اس کے ماتھے پہ اس کے چہرے پہ اس کے بالوں پہ اک اک نقش کو چوم کر دل میں اتار لیا تھا اور دل کی دھڑکنیں جہاں تیز ہوئی تھیں وہیں انہیں اک قرار آ گیا تھا، رگ و پے میں طمانیت اتر گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھا اس کی نظروں میں تھا، آنکھوں میں بسا ہوا تھا، دل میں دھڑک رہا تھا، ایسے عالم میں زری کو اور کیا چاہیے تھا؟

اس کی محبت اس کا عشق اس کی چاہ بس ایک ہی تھی۔ دل اور شاہ۔ اور یہ دل اور شاہ!  
 ”السلام علیکم۔“ وہ عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ زری جو پتھر بنی کھڑی تھی اس کی آواز پہ اس کے گمبھیر لہجے پہ اس کے انداز پہ یکدم چیخ کے پتھر پلے حواسوں سے ہوش میں آئی تھی اور اسے دیکھنے کے بعد اس کے دل کی حالت نازک تھی کیونکہ دل اور شاہ اس کے سامنے اس کے قریب کھڑا ہے ہی دیکھ رہا تھا۔!!!  
 (باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

☆ ☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق

خوبصورت چمپائی

شائع ہو گئے ہیں

مضبوط جلد

آفٹ پیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امرنیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



# میر کے گھر

”رات بڑی مدت بعد مجھے مدر کے ابا نظر آئے۔“ جہاں آرا بیگم نے ناشتے کی میز پر ہر افراد خانہ کو مخاطب کیا تھا۔ حوریہ کا نوالہ حلق میں اٹکنے لگا۔

مرحوم سر جب بھی ساس محترمہ کے خواب میں آتے ان لوگوں کے کام میں کوئی نہ کوئی رخنے ضرور ڈال کر جاتے۔ اس نے میز کے گرد بیٹھے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ اس کے بڑے جیٹھ مدر، شوہر منزل اور چھوٹا دیور مصورتینوں بڑی عقیدت سے ماں کو تک رہے تھے کہ وہ آگے کیا ارشاد فرمائی ہیں۔ جبکہ اس کی جیٹھانی ناعمہ کے چہرے پر چھائی بے چارگی واضح نظر آرہی تھی۔ وہ بھی حوریہ والے خدشات کا شکار تھی۔

”کیا کہہ رہے تھے ابا؟“ مصور نے اشتیاق سے پوچھا۔ سب جانتے تھے کہ ابا جب بھی اماں کے خواب میں آتے کوئی نہ کوئی اہم پیغام بیگم کے ذریعہ اولاد کو ضرور پہنچاتے تھے۔ تینوں بیٹے مرحوم باپ کی محبت میں سرشار والدہ محترمہ کے خواب پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے ہوئے اپنی بیویوں کا خون خوب ہی جلاتے تھے۔

حوریہ اور منزل کی شادی کو ڈیڑھ برس ہونے کو آ رہا تھا۔ شادی کے ابتدائی دن اسے حسین خواب کی مانند لگتے تھے۔ منزل بہت پیار کرنے اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ دونوں گھرانوں میں دور برے کی رشتہ داری تھی۔ کسی شادی میں جہاں آرا بیگم کی نگاہ حوریہ پر پڑی۔ انہوں نے اسی فنکشن میں اپنے بچلے بیٹے منزل کے لیے حوریہ کے والدین سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ حوریہ اچھی پرکشش لڑکی تھی۔ جہاں آرا

بیگم کا بیٹا منزل بھی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ انہیں اس کے لیے خوب صورت مگر متوسط گھرانے کی سیدھی سادی لڑکی درکار تھی۔ حوریہ اسی لیے ان کا نگاہ انتخاب ٹھہری۔ اس کے ابا ریشمڈ سرکاری ملازم تھے۔ پانچ بہن بھائیوں میں حوریہ کا نمبر تیسرا تھا۔ ایک بڑی بہن اور بھائی شادی شدہ تھے۔ حوریہ کے والدین بھی آج کل حوریہ کا مناسب برڈھونڈنے کی تنگ و دو میں تھے۔ جہاں آرا بیگم نے حوریہ کا ہاتھ مانگا تو مانوان کے دل کی مرا بر آئی۔ سوچ بچار کی رسمی مہلت لینے کے بعد انہوں نے ہاں کر دی۔

منزل بر سر روزگار تھا۔ شریف تھا اور جاذب نظر شخصیت کا مالک، انہیں اس کے علاوہ اور کیا چاہیے تھا۔ یوں چند مہینوں کے اندر حوریہ دلہن بن کر پیا ٹکر سدھا رہ گئی۔

شروع شروع میں اسے سسرال کا ماحول بالکل اپنے گھر جیسا لگا۔ ناعمہ اس کی جیٹھانی جو عمر میں اس سے بمشکل ہی ڈیڑھ دو برس بڑی ہوگی۔ اس سے بہت جلد بہنپا اور دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ چھوٹا دیور مصور اسے اپنے چھوٹے بھائی علی کی طرح لگتا۔ شوخ اور شرارتی۔ جہاں آرا بیگم بھی شفقت سے پیش آتیں۔ رہا منزل تو اس سے تو پہلے دن سے ہی دل کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ خوشیوں بھرے اس نئے سفر کے آغاز کو حسین تربیت کے لیے منزل نے ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات جانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے آفس میں مزید چھٹیوں کے لیے اپلائی کر دیا۔ حوریہ نے ناعمہ کو شریکیں مسکراہٹ کے ساتھ منزل کے ارادے سے

آگاہ کیا۔ ناعمہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ حوریہ نے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی معنی خیز ہنسی کا مطلب سمجھ نہ پائی تھی اور یہی بات اس نے ناعمہ سے پوچھ بھی ڈالی۔

”حوریہ ڈیر! میری دلی خواہش ہے کہ ہنی مون پر جانے کا تمہارا اور منزل کا ارادہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ مدر کے ابا تمہیں اتنی آسانی سے ہنی مون پر جانے دیں گے۔“

”مدر کے ابا؟“ اس نے اچنبھے سے ناعمہ کو دیکھا۔

”جی ہاں میرے مدر اور تمہارے منزل کے ابا۔“

ہمارے مرحوم سر صاحب۔“ ناعمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں کچھ سمجھی نہیں بھابھی۔“ حوریہ واقعی الجھ گئی تھی۔

”شروع شروع میں تو میں بھی کچھ نہ سمجھی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ سب سمجھ آ گیا۔ افسوس صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ ہمارے میاں صاحبان کو یہ سب سمجھ نہیں آتا۔ تینوں بیٹوں کی ہر بات کو سچ اور حرف آخر جانتے ہیں۔“ ناعمہ کا لہجہ اس بار بہت بو جھل تھا۔ وہ اس بار بھی اسے نا سمجھی سے تکتی رہ گئی۔ ناعمہ کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو مسکراتے ہوئے اس کی ٹھوڑی





چھوٹی۔

”میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا یا الجھانا نہیں ہے۔ تم اور منزل اماں سے اجازت لے لو۔ اللہ کرے کہ وہ خوش دلی سے تمہاری اس بے ضرر سی خواہش کو پورا ہونے دیں۔ لیکن مجھے اماں کی نیچر کا اندازہ ہو چکا ہے۔ شادی کے اخراجات کے بعد انہیں ہنی مون وغیرہ کا خرچہ سراسر اضافی لگتا ہے۔ وہ اسے صرف نئے شادی جوڑوں کا چونچلا قرار دیتی ہیں۔“

”مگر ہم ان سے اجازت لے چکے ہیں اور اماں نے اجازت دے بھی دی ہے۔“ حوریہ نے قدرے جوش سے بتایا۔

”وہ تو اجازت دے ہی دیتی ہیں۔ اصل میں تو مدثر کے ابا آڑے آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔“ ناعمہ بھابھی جانے آج کیسی باتیں کر رہی تھیں۔ منزل نے اسے آواز دے کر کسی کام سے بلایا تو حوریہ ناعمہ کی باتوں پر غور و فکر کرتی وہاں سے ہٹ گئی اور اگلی صبح ناعمہ کی ساری باتیں سیاق و سباق سمیت اس کی سمجھ میں آچکی تھیں۔

”کل مدثر کے ابا خواب میں نظر آئے۔ بہت الجھے ہوئے اور پریشان لگ رہے تھے۔“ ناشتا سارا خاندان اکٹھے بیٹھ کر کرتا تھا۔ جہاں آرا بیگم کی بات پر سب نے ہی سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ مرحوم شوہر کا ذکر کرتے ہوئے وہ بہت دل گرفتہ اور طول سی دکھائی دے رہی تھیں۔ حوریہ بھی قدرے حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ اپنے سر کا ذکر سن رہی تھی۔ اسے پہلے سے ہی علم تھا کہ منزل کے والد دس گیارہ سال پہلے اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔ اس نے پورے گھر میں ان کی کوئی تصویر تک لگی نہ دیکھی تھی۔ اس نے خود ہی قیاس لگالیا تھا کہ سب گھر والوں کے لیے وہ ایک بھولی ببری یاد بن گئے ہوں گے۔ لیکن آج جہاں آرا بیگم کے ذکر چھیڑنے پر جس طرح ان کے تینوں بیٹے بے تابی سے ماں کو تکتے لگے تھے کہ وہ پورا خواب سنائیں

حوریہ کو بیٹوں کی مرحوم باپ سے محبت کا اندازہ ہو گیا اور یہ بات اسے اچھی لگی تھی۔ اس نے بھی دلچسپی سے ساس کو دیکھا۔ جانے انہوں نے رات کیا خواب دیکھا تھا اور یہی بات مدثر بھائی نے پوچھ لی۔

”کیا کہہ رہے تھے ابا؟“

”کہنا کیا تھا بیٹے! بس صحن میں پریشانی سے ٹہل رہے تھے۔ سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے جی۔ پریشان لگ رہے ہیں۔ انا مجھے ڈانٹنے لگے۔ کہنے لگے کیسی ماں ہو، اولاد کی صحت، سلامتی سے تمہیں غرض ہی نہیں۔ ملک کے حالات سنگین ہیں اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو گھر کی عافیت بھری فضا سے نکال کر باہر بھیج رہی ہو۔ میں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ پیٹھ موڑ کر چل دیے۔ یوں تو کبھی خفا نہ ہوتے تھے بیٹا۔“ جہاں آرا بیگم نے دوپٹے کے پلو سے ناویدہ آنسو پونچھے تھے۔

”ابا ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے اماں۔ منزل یا رتم اپنا ہنی مون کا پروگرام کینسل کیوں نہیں کر دیتے۔“ مدثر نے منزل کو مخاطب کیا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں بھیا۔ ابا کا اشارہ ضرور ہماری طرف ہی تھا۔“ منزل نے جھٹ ان کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ جہاں آرا بیگم نے مطمئن ہو کر بیٹوں کو دیکھا اور رہی حوریہ تو وہ آنکھیں پھاڑے میاں کو تک رہی تھی۔ رات ہی تو کتنے ارمانوں سے وہ اپنا ہنی مون ٹرپ ڈسکس کر رہے تھے اور صرف ایک خواب پر انہوں نے یلکھت پروگرام ہی ملتوی کر دیا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ ناعمہ پر پڑی جو بڑی جتنی ہوئی نگاہوں سے اسے تنگ رہی تھی اور حوریہ کو اس کی کل والی باتیں یاد آ گئیں۔ چند لمحوں میں اسے ساری بات سمجھ آ گئی تھی اور بعد میں جب ناعمہ اور وہ تہائی میں اکٹھے ہوئے تو ناعمہ نے اسے ایسے بیسوں واقعات سنائے جن میں مرحوم سر جہاں آرا بیگم کے خوابوں میں اگر بہت سے پروگرام تلپٹ کرنے کا سبب بنے تھے۔

”اور مزے کی بات بتاؤں حوریہ ابا کو عالم بالا میں

بھی دنیا کے واقعات کی پوری خبر رہتی ہے۔ لگتا ہے انہوں نے جنت میں بھی اخبار لگوار کھا ہے۔“ ناعمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ حوریہ کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کچھ عرصہ لگا تھا۔ پھر وہ بھی اپنی زندگی میں ”سسر مرحوم“ کے دخل کی عادی ہو گئی۔ جس کام سے یا جس بات سے جہاں آرا بیگم کو انہیں روکنا مقصود ہوتا وہ مرحوم شوہر کو درمیان میں لا کر بات منوالیتیں۔ منزل نے آفس میں کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ اس نے حوریہ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کمیٹی کھلنے پر اسے گولڈ کا لاکٹ سیٹ بنوا کر دے گا۔ جینز بری میں سونے کے سیٹ تو تھے۔ مگر عام روٹین میں پہننے کے لیے کوئی لاکٹ، چین نہ تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں ڈیزائن تک سوچ لیا تھا۔ مگر ادھر منزل کی کمیٹی کھلی، ادھر جہاں آرا بیگم کو خواب میں ”مدثر کے ابا“ نظر آ گئے۔ وہ اپنی بیٹی، داماد کے حوالے سے پریشان تھے جنہیں کاروبار میں خسارے کا سامنا تھا۔ انہوں نے بیوی کے ”خواب“ میں آکر بیٹوں کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنی اکلوتی بڑی اور شادی شدہ بہن کے اس آڑے وقت میں مالی مدد کریں۔ سو منزل نے فوراً کمیٹی کی رقم اماں کو تنہا دی کہ وہ صفیہ کیا کو دے دیں۔ بے شک صفیہ آبانے بعد میں قسطوں کی صورت میں اس قرض کی ادائیگی کر دی۔ مگر وہ پیسے روزمرہ کے خرچوں کی ہی نذر ہو گئے۔ نہ دوبارہ رقم جڑ پائی، نہ حوریہ کا لاکٹ سیٹ بن سکا۔ وہ اور ناعمہ اماں کے حربے کو سمجھ چکی تھیں۔ لیکن اماں کے تینوں بیٹے ماں کی بات پر جھٹ اٹھ کر لیتے۔ وہ دونوں کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتیں۔

اب بھی ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔ مصور اور منزل دونوں بھائیوں نے نوکریوں کے ساتھ ساتھ چھوٹا موٹا پارٹ ٹائم بزنس شروع کیا تھا۔ اللہ نے کام میں برکت ڈالی، خوب منافع ہوا تھا۔ اب دونوں بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ اس منافع میں مزید جمع پونجی ملا کر ایک رہائشی پلاٹ خرید لیں۔ پلاٹ ان کی نظروں میں تھا۔

اسی علاقے میں کارنر کاپلاٹ بہت مناسب قیمت پر مل رہا تھا۔ شاید مالک کی کوئی مجبوری تھی۔ وہ فوری سودا چاہتا تھا۔ ناعمہ اور حوریہ بھی بہت خوش تھیں۔ موجودہ مکان ان کی ضروریات کے حوالے سے بہت چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ مدثر، منزل کے والد نے وہ اپنی فیملی کے حساب سے تعمیر کروایا تھا۔ مگر اب جب دونوں بیٹے شادی شدہ ہو چکے تھے اور تیسرے کی شادی بھی یقیناً کچھ عرصے بعد ہو جانی تھی سو یہ مکان سب کی ضروریات کے حوالے سے نہایت ناکافی تھا۔ فی الوقت پلاٹ خریدنے کے پیسے تو اکٹھے ہو گئے تھے۔ تعمیر کا مرحلہ تو بعد میں آتا تھا۔ خوش آمد بات یہ تھی کہ جہاں آرا بیگم کو بھی اس امر پر قطعی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ بھی بیٹوں کے ہمراہ جا کر خوش خوش پلاٹ دیکھ آئیں۔

حوریہ اور ناعمہ مطمئن اور خوش تھیں کہ مستقبل میں سرچھپانے کو اچھا ٹھکانہ میسر آجائے گا۔ لیکن پھر ایک دن صفیہ آپا چلی آئیں۔ صفیہ آپا جہاں آرا بیگم کی پہلو تھی کی اولاد تھیں۔ طویل عرصے تک انہیں اکلوتی اولاد ہونے کا شرف حاصل رہا تھا کہ ان کے بعد جہاں آرا بیگم کے چار بچے کسی طبی پیچیدگی کا شکار ہو کر پیدائش کے بعد جانبر نہ ہو پائے تھے۔ سالوں حکیموں، ڈاکٹروں کا علاج کروایا۔ پھر اللہ نے یکے بعد دیگرے تین تندرست بیٹوں سے نوازا تھا۔ صفیہ باجی کی شادی بھی خاصی کم عمری میں ہو گئی تھی اور اب تو ان کی بڑی بیٹی شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ جہاں آرا بیگم کی کوشش سے نواسی کا رشتہ اچھی جگہ طے پا گیا۔ پہلے پہل تو دونوں فریق اس بات پر راضی تھے کہ جمع کم از کم لی اے تک تعلیم مکمل کرے گی۔ اس سے پہلے شادی کا ذکر نہیں چھیڑیں گے۔ لیکن لڑکے کی ماں کو انجانا کا ہلکا سا اٹیک کیا ہوا ان کی طرف سے جلد شادی کا شور مچ گیا۔ آج بھی بوکھلائی ہوئی سی صفیہ آپا اسی بارے میں ماں سے مشورہ کرنے آن پہنچی تھیں۔ ناعمہ اور حوریہ کے سامنے تو وہ جمع کی کم عمری کو بنیاد بنا کر ماں



سے فکر مندی کا اظہار کر رہی تھیں۔ مگر جیسے ہی دونوں بھابھیاں ان کی تواضع کا سامان کرنے کمرے سے نکلیں انہوں نے اپنی اصل پریشانی سے آگاہ کیا۔

”سارا مسئلہ پیسوں کا ہے اماں۔ اکلوتی بیٹی ہے شمع میری۔ میری خواہش ہے کہ اس کا جیسا ہوا کہ دنیا رشک کرے۔ زیور تو میں نے پہلے وقتوں میں بنوایا تھا۔ لیکن فرنیچر، کراکری، الیکٹرونکس کا سامان، رفع کے پاس تو اس وقت صرف اتنا ہے کہ ضرورت کا سامان ہی بمشکل اکٹھا ہوا ہے گا۔ اگر آپ منزل مدثر سے میری مجبوری بیان کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ اس آڑے وقت میں وہ بہن کے کام آئیں۔ پلاٹ کا کیا ہے وہ بعد میں لے لیا جائے گا۔ ادھار تو میں رکھتی نہیں، پانی پانی لوٹا دوں گی۔“ صفیہ آپا جہاں آرا بیگم سے مخاطب تھیں اور حوریہ آپا کے لیے چائے کی ٹرے اٹھائے باہر کھڑی تھیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ کتنی خود غرضی کا مظاہرہ کر رہی تھیں صفیہ آپا، اپنی بیٹی کے شان دار جینز کے لیے چھوٹے بھائیوں کی جمع پونجی استعمال میں لانا چاہ رہی تھیں۔ اپنے بیوی بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے انہیں سر چھپانے کا معقول ٹھکانہ فراہم کرنے کا جو قدم وہ اٹھانے جا رہے تھے صفیہ باجی انہیں اس سے روکنا چاہ رہی تھیں اور بھلے سے وہ بعد میں پانی پانی چکا دیتیں۔ مگر وہ پانی کی صورت میں ہی چکا میں ان کا ماضی کا ریکارڈ گواہ تھا کہ یکسخت بڑی رقم بطور قرضہ لے کر وہ اتنی چھوٹی قسطوں میں قرضہ اتار تیں کہ قرض دینے والا مجموعی طور پر خسارے میں رہتا۔ حوریہ جانتی تھی کہ اکلوتی بیٹی اور اکلوتی ہی نواسی کی محبت میں مجبور ہو کر جہاں آرا بیگم بیٹوں کی جمع پونجی ٹھکانے لگانے سے دریغ نہیں کریں گی۔

بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے ناعمدہ کو بھی اس بات سے لاعلم ہی رکھا۔ وہ بے چاری ابھی خوش تھی۔

حوریہ اس کی خوشی ملیا میٹ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ بے چاری نے ایک دو دن مزید خوش رہ لیتا تھا۔ پھر تو مدثر بھائی کے ابا نے اماں کے خواب میں نظر آ ہی جاتا تھا۔

اگلی صبح کا ہی ذکر تھا حسب معمول سب ناشتے کی میز پر جمع تھے۔ حوریہ درزیدہ نگاہوں سے اماں کو تنک رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ انہیں رات کو ہی مدثر کے ابا نظر نہ آ گئے ہوں اور اس کا خدشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد چائے کے سبب پیتے ہوئے اماں نے بات کا آغاز کیا تھا۔

”رات بیٹا بڑا عجیب سا خواب نظر آیا۔“ وہ جیسے کسی ٹرانس میں بولنا شروع ہوتی تھیں اور ان کے بیٹے ایک دم سے ہی ان کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اتنے میں ہی حوریہ کا ہاتھ بے دھیانی میں چائے کے کپ سے ٹکرایا اور گرم گرم چائے اس کا ہاتھ جلا گئی اس نے ذرا زیادہ ہی آہ و بکا کا مظاہرہ کیا۔ منزل فوراً اس کا ہاتھ پکڑے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے بیدار میں لے گیا اور پھر بہت احتیاط سے اس کے ہاتھ پر مرہم رکھا تھا۔ حوریہ نے محبت کرنے والے شوہر کو نظر بھر کر دیکھا۔ دل میں خدا کا شکر بھی ادا کیا۔ مگر وہ بھی جانتی تھی کہ اس کا محبت کرنے والا شوہر ایک انتہائی فرماں بردار بیٹا بھی ہے۔ وہ اپنی ماں کے خلاف ایک بھی لفظ سننے کا روادار نہ ہو گا۔ حوریہ ایسی کوئی بات کر کے شوہر کی نگاہوں میں اپنا مقام نہیں کھونا چاہتی تھی۔ سوچ رہے پر مجبور تھی۔ آج تو اس نے ڈانٹنگ ٹیبل کا ”گورم“ توڑ کر اماں کو اپنا خواب سنانے دیا تھا۔ مگر وہ روز، روز اپنا ہاتھ جلا نہیں سکتی تھی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اگلی صبح اماں اپنا خواب سن کر ہی دم لیں گی۔

سارا دن وہ بے بسی کی کیفیت میں گھری گھر کے کام نبھاتی رہی، بلکہ آج تو اس نے دھیان بٹانے کے لیے خود کو قصداً گھر کے غیر ضروری کاموں میں الجھا لیا تھا اور اسٹور روم کی صفائی کرتے ہوئے تصویروں کا ایک

غلاف اس کے ہاتھ آن لگا۔ مدثر بھائی اور منزل مصور کی بچپن اور لڑکھن کی تصویریں تھیں۔ پرانی تصویریں جو کسی البم کی زینت بننے کے بجائے بڑے سے لفافے میں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور ان ہی تصویروں کے بیچ میں سے ایک پاسپورٹ سائز تصویر پھسل کر نیچے گری۔ حوریہ نے اٹھا کر تصویر کو غور سے دیکھا۔ گندی رنگت، سرمئی رعب چھلکانی آنکھیں، گھنی مونچھیں، مشت بھرداڑھی اور نقوش میں سب سے چھوٹے مصور کی بے تحاشا جھلک، یہ یقیناً اس کے سرمرحوم کی تصویر تھی جو غالباً پاسپورٹ وغیرہ خوانے کی غرض سے ہی کھنچوائی گئی تھی۔ کیونکہ اس نے آج سے پہلے ان کی کوئی تصویر نہ دیکھی تھی۔ ایک بار منزل سے پوچھا بھی تو اس نے بتایا کہ ابا فوت ہو جانے کے خلاف تھے۔ سو مرحوم سر سے ان لوگوں کا زبانی کلامی ہی تعارف تھا۔ آج اسے تصویر دیکھنے کو ملی تو اس نے بہت دھیان لگا کر تصویر دیکھی۔ گویا ان کے نقش بھی ازبر کرنا چاہ رہی ہو اور پھر تصویر دوبارہ لفافے میں گھسا کر لفافہ چیزوں کے ڈھیر کے نیچے دبا دیا۔ صفائی کا بانی کام اس نے آئندہ بر ڈال دیا اور بہت ہلکی پھلکی ہو کر اسٹور سے نکلی تھی۔ اگلی صبح کا ذکر تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ سب ایک بھرپور ناشتے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب اچانک ہی حوریہ نے سب کو مخاطب کیا۔ انداز بالکل جہاں آرا بیگم والا تھا۔ کچھ کھویا کھویا سا۔

”رات ایک عجیب سا خواب دیکھا میں نے۔ میں برآمدے کی سیڑھیوں پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، اتنے میں فضا میں عجیب بھیننی بھیننی سی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ میں نے آہٹ پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو سفید لباس میں ایک نورانی چہرے والی شخصیت میرے پیچھے کھڑی تھی۔“ حوریہ دھیرے دھیرے خواب کی جزئیات سناتے گئی۔ سب انتہائی توجہ سے اسے سن رہے تھے۔

”تیکھی ناک، سرمئی آنکھیں اور چہرے کے نقش تو یوں سمجھیں بالکل اپنے مصور جیسے تھے۔“ حوریہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے  
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ یاش	500/-
درد و سو	راحت جبین	600/-
دعائی اک روشنی	رخسانہ گارعدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ گارعدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شادیہ چودھری	400/-
حیرے نام کی شہرت	شادیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ انصار	500/-
بھول بھلیاں حیرت گیاں	فائزہ انصار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ انصار	250/-
یہ گیاں یہ چہارے	فائزہ انصار	300/-
میں سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
دُخم کو ضد تھی سیما سے	نوزیہ یاسین	250/-
اماں کا چاند	جہڑی سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا ہا دل	انٹاش آفریدی	450/-
درد کے قاصدے	رضیہ جمیل	500/-
آج مگن پرچاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	حیمہ قریشی	300/-
تیری راہ میں رُل گئی	میونہ خورشید علی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 30/- روپے  
منکوانے کا پتہ:  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار کراچی۔  
فون نمبر: 32216361



# قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

نے بالکل تصویر کے مطابق خاکہ کھینچ دیا تھا۔  
”ابا تھے وہ تو سو فیصد ابا۔“ سب سے پہلے مدثر بھائی اچھلے تھے۔

”اور نہیں تو کیا ابا ہی ہوں گے۔ اماں! ابا واقعی مجھ میں ملتے تھے۔ مجھے تو آج تک یہ بات کسی نے بتائی نہیں۔“ مصور بھی اشتیاق سے ماں سے پوچھ رہا تھا۔  
”پھر بتاؤ نا ابا نے کیا کہا؟“ منزل نے بے تابی سے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

”وہی تو سمجھ نہیں آیا“ کچھ عجیب سی ہی بات کر رہے تھے وہ۔ میں نے پہلے سے ان سے پوچھا کون تو ہنس کر کہنے لگے بیٹا مجھے اپنا باپ سمجھو۔ پھر میرے برابر آن بیٹھے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور کہا واقعی میرا بنایا ہوا گھر بچوں کے لیے چھوٹا پڑ گیا ہے۔ کچھ دیر سوچتے رہے میں بھی خاموشی سے ان کو دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگے ٹھیک ہے۔ دلہن خیر سے نئے آشیانے کی بنیاد رکھو اور دیکھو خبردار میرے بیٹوں کی حق حلال کی کمائی کو کسی اور مقصد کے لیے خرچ نہ ہونے دینا چاہیے کسی قریبی رشتہ دار کی خفگی کا اندیشہ ہی کیوں نہ ہو اور یہ بات اپنی اماں کو بھی سمجھا دینا بس میں نا سمجھی سے انہیں تکتی رہی اور اتنے میں میری آنکھ بھی کھل گئی۔“

”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر وہ واقعی ابا تھے تو ان کی باتوں کا مقصد کیا تھا۔“ حوریہ نے الجھ کر حاضرین کو مخاطب کیا۔

”لو تمہیں اب بھی شک ہے کہ وہ ابا تھے۔“ منزل ذرا برا مان کر بولا۔

”وہ سو فیصد ابا ہی تھے بھابھی جان۔ ورنہ خود بتائیں

آپ نے کبھی ابا کو دیکھا تک نہیں اور آپ نے نقشہ کھینچا ہے وہ سو فیصد ہمارے ابا کا ہی ہے۔“ مدثر نے بھی بھائی کی تائید کی۔

”لیکن وہ کہنا کیا چاہ رہے تھے۔“ حوریہ نے انکھيوں سے ساس کو دیکھا جو ہکا بکا ہو کر ساری باہر سن رہی تھیں۔

”ظاہر ہے وہ یہی پیغام دے رہے تھے کہ نیا پلا

فی الفور خرید لو اور جو رشتہ دار حسد ظاہر کریں یا بات بنائیں ان کی قطعی پروا نہ کرو۔“ مدثر بھائی نے دانست میں ابا کی بات کی تشریح کی۔

”ہاں ہو سکتا ہے یہی کہنا چاہ رہے ہوں۔“ حوریہ نے تسلیم کر لیا۔

”بس منزل اب مزید دیر نہیں کرنی۔ شیخ صاحب سے فوراً ساری تفصیلات طے کرو۔“ مدثر بھائی منزل کو مخاطب کیا۔

”آپ کیوں چپ ہیں اماں! آپ بھی بولیں۔“ منزل کو ماں کی خاموشی کا خیال آیا تو اس نے انہیں مخاطب کیا۔

”میں کیا بولوں جو تم مناسب سمجھو کرو۔“ آرا بیگم ابھی تک کچھ حیران پریشان تھیں۔

”اماں کو ابا یاد آرہے ہوں گے“ ہے نا اماں۔“ نے ان کی کھوئی کھوئی کیفیت سے نتیجہ اخذ کیا۔

آرا بیگم نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا اور چند کے اندر اندر مدثر منزل نے پلاٹ تو خرید لیا

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جہاں بیگم کو آئندہ کبھی ”مدثر کے ابا“ خواب میں آئے۔



# سید عالم سرگرم

جو میرے درد کو سینے میں چھپا لیتا تھا  
آج جب درد ہوا مجھ کو بہت یاد آیا  
رات بڑے دنوں بعد اس نے امی کو خواب میں  
دیکھا۔ انہوں نے میرے کچھ دیا تھا۔ لیکن بہت سوچنے پر  
بھی اس کو یاد نہیں آیا کہ امی نے اسے کیا دیا۔ لیکن یہ  
طے تھا کہ آج کا دن بہت اچھا گزرنے والا تھا۔ کیونکہ  
جب بھی اسے امی خواب میں دکھائی دیتیں، اگلا دن  
اس کے لیے اپنے دامن میں کچھ بہت خاص اور یادگار

## مکمل ناول

لے کر آتا تھا۔

گاؤں جانے والی بس نے اسے تقریباً ”ڈھائی گھنٹے  
بعد منزل پہنچانا تھا۔ میر حسن نے سیٹ کی پشت سے  
سر نکا کر گھڑکی کے پار دیکھا۔ صبح سویرے کی مدھم  
روشنی اور ہلکی دھند میں بھگے کھیتوں کو دیکھ کر نہایت  
سکون محسوس ہوا۔ اسے محض دو ماہ پہلے ہی اپنی بی ایڈ  
پوسٹ ملی تھی، گاؤں اس کے شہر سے کافی دور تھا،  
آنے اور جانے کا سفر ملا کر پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے  
ہو جاتے تھے، جس وجہ سے اسے پورا ہفتہ گاؤں میں  
ہی رہنا پڑتا۔ اس کے علاوہ تین اور پیچرز بھی شہر سے  
جاتے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ البتہ بانی چھ اساتذہ میں  
سے دو لوکل تھے اور چار آس پاس کی تحصیلوں سے  
آتے تھے جو روزانہ ڈیوٹی کے بعد گھروں کو لوٹ جاتے  
تھے۔

یہاں کام کرتے میر کو ایک مہینے سے کچھ اوپر ہو گیا  
تھا۔ اسکول اور گاؤں کا ماحول اسے بہت پسند آیا تھا۔

کرتی تھیں جو عموماً ”سفید ٹوپی والے برقعے کی صورت  
میں نظر آتا تھا اور مقامی عورتوں میں بعض فینسی سفید  
ٹوپی والے برقعے کی صورت میں نظر آتی تھیں۔  
کبھی کبھار کچے راستوں پر آتے جاتے اسکول جاتی  
لڑکیوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا، کیونکہ ان کا اسکول  
کھیتوں کے راستے میں پڑتا تھا۔ لیکن میر حسن نے  
کبھی اس بات پر خصوصی توجہ دینا مناسب نہیں جانا  
تھا۔ ویسے بھی وہ فطرتاً نہایت شرمیلا اور محتاط  
طبیعت کا تھا۔ طالب علمی کے دور میں بھی پورا دھیان

رہا۔ زیادہ آبادی لوکل دیہاتیوں کی تھی جو  
ٹکی بولتے تھے اور گاؤں کے بڑے زمیندار مخدوم  
تھے۔ یہاں ان کی بڑی عزت اور مقام تھا  
کے کھرانے سے گاؤں والے نا صرف عقیدت  
تھے بلکہ ان کی یہاں مانی بھی بہت جاتی تھی۔  
مہینے بھر میں ہی میر حسن نے یہاں کے بارے میں  
کچھ جان اور سمجھ لیا تھا۔ پردے کے معاملے میں  
یہ علاقہ کسی ایک رواج کا پابند نظر نہیں آتا تھا،  
وہاں میں کام کرتی عورتیں محض ایک دوپٹہ یا چادر  
ہوتی تھیں۔ پٹھان عورتیں البتہ بہت سخت پردہ

کچھ اس کی طبیعت بھی بچپن سے قدرتی ماحول  
طرف راغب تھی۔ دیہاتی زندگی میں اس نے ہمیشہ  
چارم محسوس کیا تھا۔ البتہ قریب سے جاننے اور  
کا یہ پہلا موقع تھا۔ بلکہ تدریس کو بطور پیشہ اپنا  
خالص اس کی اپنی خواہش تھی۔ بچپن میں جب  
کلاس پیچرز بچوں سے ان کے مستقبل کے بارے  
سوال کرتے تو تقریباً ”بھئی بچے ڈاکٹر“ انجینئر  
خواہش ظاہر کرتے اور صرف اسی کا جواب ہوتا  
اور اسے حیرت ہوتی کہ بچے اس کا جواب سن کر  
تھے اور میر سوچ میں پڑ جاتا کہ تاریخ تو ہمیں یہ

ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ بھی اپنے استاد کی تعظیم  
کھڑے ہوتے تھے۔ پھر کیوں سب اس کے جواب  
ہنتے تھے۔ البتہ سوال کرنے والے اساتذہ نے ہمیشہ  
شفقت سے ہاتھ پھیر کر اس کی حوصلہ افزائی  
کی تھی۔

سفر کا اختتام ہوا اور بس اسے آبادی کی شروع  
میں سڑک کنارے اتار کر آگے بڑھ گئی، کیونکہ  
شارٹ کٹ تھا۔ وہ کھیتوں کے راستوں پر قدم  
اسکول کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ خوب صورت  
علاقہ اپنے اندر کئی حسین رنگ لیے ہوئے  
سنگلاخ پہاڑ بھی تھے اور ہرے بھرے کھیت  
دھول اڑاتی مٹی بھی تھی اور پتھریلے راستے بھی۔  
معاملہ یہاں کے قبائل اور خاندانوں کا تھا۔  
یہاں مہاجر تھے۔ یعنی باہر کے علاقوں سے  
ہوئے جو اب برسوں سے یہاں رچ بس کر رہیں





پڑھائی کی طرف دیا۔ لیکن زندگی میں ہمیشہ سب کچھ عادت اور فطرت کے مطابق کہاں ہوتا ہے۔ اس دن بھی جو کچھ پیش آیا، ایسی سچویشن سے اس سے قبل کبھی میر حسن کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

پچھلی رات یہاں بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے کھیتوں کی پگڈنڈیاں ابھی تک پھسلن زدہ تھیں۔ میر نے دور تک جاتی پگڈنڈی کو نظروں سے جانچا اور اس پر مزید سفر جاری رکھنے کا ارادہ موقوف کرتے متبادل راستے کی تلاش میں اطراف کا جائزہ لیا۔ لڑکیوں کے اسکول کا راستہ بھی اگرچہ کچھ تھا، لیکن پگڈنڈی کی نسبت کافی چوڑا تھا اس لیے پھسلن کا خطرہ نہیں تھا۔ میر حسن نے دائیں طرف کا رخ کیا اور کچھ دُور سے بچتا بچتا جاتا جلد ہی اس چوڑے راستے پر پہنچ گیا۔ لڑکیوں کے اسکول کی دیوار پر لٹکتی بوگن ویلیا دیکھ کر اچانک ہی اسے اپنا خواب یاد آگیا۔ اسی نے اسے رات پھولوں سے بھری چٹکیر دی تھی۔ خواب کے یوں اچانک یاد آنے پر میر نے بے پناہ خوشی محسوس کی، چٹکیر میں کئی گلابی پھول تھے اور شاید ایک سرخ بھی۔ وہ اسی خیال میں کھویا آگے بڑھا جا رہا تھا جب اچانک ہی آگے نا صرف چوڑا راستہ ختم ہو گیا بلکہ ایک بڑا سا خشک نالہ آگیا جو آج بارش کی وجہ سے نسبتاً ”کچھ زردہ“ تھا۔ چھلانگ لگا کر پار جانا ناممکن تھا، کیونکہ نالے کی چوڑائی کافی زیادہ تھی۔ عام دنوں میں یقیناً ”لوگ اس میں اتر کر دوسری طرف جایا کرتے ہوں گے“ لیکن اس کو تو عین بارش کے بعد اس سے واسطہ پڑا تھا۔

”ایسی صورت حال کے لیے یہاں ایک لکڑی کا تختہ رکھ دینا چاہیے تھا یا کم از کم نالے میں تھوڑی سی خشک مٹی ڈالنی چاہیے تھی۔“ وہ ہونٹوں پہ انگلی بجاتے ہوئے سوچ ہی رہا تھا جب نالے کی دوسری طرف عین اس کے سامنے تین لڑکیاں آن پہنچیں۔ میر نے بے ساختہ نظر اٹھائی۔ ایک لڑکی سفید برقعے میں تھی اور دو لڑکیاں کالی چادروں میں، انہوں نے چہرے بھی نہیں ڈھانپے ہوئے تھے۔ میر حسن تھوڑا سا سائیڈ پر ہو گیا۔ وہ لڑکیاں چادریں سمیٹ کر سنبھل

کر پیر رکھتی نالے میں اتریں۔ زیادہ کچھ زوالی جگہ چھلانگ لگا کر دوسری سمت کی اونچائی پر چڑھ کر کوشش کرنے لگیں، ان کی دیکھا دیکھی میر کا پڑھانے حوصلہ ہوا اور اس نے بھی پانچے چڑھا کر نیچے رکھا۔ اور عین جب وہ نالے کے سینٹر میں تھا، لڑکی کی زوردار چیخ بلند ہوئی۔

”سانپ۔“ میر نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ لڑکی سے محض پانچ، چھ قدم دور کالے رنگ کا بازو بھر ساپ جھاڑیوں میں لپکا۔ لڑکیاں پورا زور لگا رہی اوپر جانے کے لیے، لیکن پیر بار بار پھسل جاتا اور انہوں نے اسکول بیک بھی لٹکائے ہوئے تھے۔ وقت ضائع کیے فوراً آگے بڑھا اور سفید برقعے لڑکی کا بازو پکڑ کر پیٹھ پہ دھکا دیا۔ وہ جیسے ہی اوپر پہنچ حسن نے اسی طریقے سے دوسری لڑکی کو اور تیسری لڑکی نے خود ہی ہاتھ آگے کر دیا جسے پکڑ کر اسے بھی اوپر دھکیلا، لیکن اسی دوران سانپ میں سرعت سے لہراتا جھاڑی سے نکل کر اس طرف بڑھا، میر کی جب تک اس پر نظر پڑی کہ قریب آچکا تھا اس سے پہلے کہ میر کچھ سوچتا آخری لڑکی نے مضبوطی سے میر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچ لیا اور ٹھیک اسی وقت سانپ وہاں پہنچا دو سینڈ پہلے میر کے قدم تھے۔

”اوہ۔“ ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے نے سانپ سے نظر ہٹا کر سامنے توجہ کی۔ اور پھر دو قدم پیچھے ہٹا، کیونکہ اس آخری لڑکی کے ہاتھ نے بے دھیانی میں اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ میر فوراً اس کا ہاتھ چھوڑا اور پلٹ کر نالے میں قدم اور لمبی جست لگا کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ بارش شرمندگی کے دوبارہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پیشانی سے تر تھی اور دل کی دھڑکنی قابو سے باہر قدموں سے اسکول پہنچا۔

اسکول کی رو میں یہ تھی کہ دن کا وقت تو پڑھانے میں مصروف گزرتا، چھٹی کے بعد ظہر کی نماز اور دوپہر کے کھانے کے بعد نیچر گھنٹہ بھر آرام کرتے تھے۔

”ارے واہ چاچا یہ تو بہت ہی ایڈیل جلد ہے۔ اب تو مجھے آپ سے یہ شکوہ ہے کہ آپ نے اتنی دیر سے کیوں بتایا، مجھے پتا ہوتا تو پہلے دن سے ہی یہاں آکر پڑھائی کرتا۔“

”بس صاحب۔۔۔ شروع میں اگلے کے مزاج کا پتا نہیں ہوتا، کوئی کوئی لوگ اونچے مزاج کے بھی ہوتے ہیں نا ایسی جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔“ چاچا نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔

”پر آپ کو میں جان گیا ہوں صاحب، آپ بہت ساہ طبیعت کے ہیں۔“

”شکریہ چاچا۔۔۔ ویسے یہ جگہ صرف اچھی ہی نہیں بلکہ میرے لیے ایڈیل بھی ہے۔“ دور تک پھیلی ہریالی، خاموشی اور سکون کو میر نے اپنے لیے جیسے نعمت تصور کیا۔

”اچھا صاحب، آپ یہیں بیٹھیں، میں آپ کی کتابیں اور چائے ادھر ہی لے آتا ہوں۔“ چاچا خوشی سے پھولے نہیں سمائے اور فوراً واپسی کے لیے پلٹ گئے۔

اپریل کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا اپنے پیچھے وں میں بھرتے ہوئے میر نے بل بھر کو پلکیں بند کیں تو چھم سے دو چمکی براؤن آنکھیں تصور میں اتر آئیں۔ میر نے بے ساختہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ ایسا اس کے ساتھ صبح سے ہو رہا تھا۔ وہ گہری نظر بچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی اور وہ بھی ہریار خود کو تسلی کے انداز میں یہی باور کر رہا تھا کہ واقعہ تازہ ہے، اس لیے دماغ سے نکل نہیں رہا اور آہستہ آہستہ خود ہی محو ہو جائے گا۔

چاچا کتابیں اور چائے لے آئے تو میر نے ان سے پوچھا۔

”کیا یہاں کوئی لکڑی کا کام کرنے والا ہے۔“

میر چاہتا تھا اس خشک نالے کی گزر گاہ پر ایک لکڑی کا تختہ دکھوے، تاکہ آنے جانے والوں کو آئندہ نالے میں اترنا نہ پڑے۔ چاچا نے جواب دیا۔

”دسویں جماعت کے منظور کا بڑا بھائی لکڑی کا کام کرتا ہے۔“ چاچا اس وقت منظور کے بھائی کو وہیں بلا



لائے۔ میر نے اسے تختہ بنانے کی ضروری ہدایات دیں اور وہ دو دن کا وقت مانگ کر واپس چلا گیا۔  
منظور کے بھائی نے تختہ تیار کر لیا تو میر حسن دو لڑکوں اور چاچا کے ساتھ خود وہاں جا کر تختہ کو سیٹ کروا آیا۔ لڑکوں نے کافی مہارت سے کچھڑکی مدد سے تختہ وہاں جمایا تاکہ کوئی اٹھا کر لے نہ جائے۔ اسکول کے ٹیچر اور پرنسپل صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے میر کو خوب سراہا جسے سن کر وہ خاصا شرمندہ ہو گیا، کیونکہ اس کے نزدیک کام واقعی بہت معمولی تھا۔

پیل کے سائے تلے پڑھائی کرتے اسے پانچواں روز تھا۔ آج اس کا دیر تک زور و شور سے بڑھنے کا ارادہ تھا۔ کیونکہ اگلے روز چھٹی کے فوراً بعد گھر کے لیے روانہ ہونا تھا اور پھر پیر کی صبح واپس آنا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ چاچا کے گھر سے ان کا بیٹا حشمت اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے باہر آیا، پیچھے غالباً اس کی بیوی تھی۔ میر کو سلام کر کے وہ پاس سے گزر گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اسے چاچا کے گھر کی دیوار پر دھب سے کچھ گرنے کی آواز آئی۔ میر نے چونک کر سر اٹھایا۔ اندر سے کسی نے دیوار پر گینا کھیں نما کچھ پھینکا تھا۔ اور وہی منٹ میں دیوار پر ایک چہرہ نمودار ہوا مانتے پہ آئے گیلے بالوں کو پیچھے کرتی وہ کھیں کو ترتیب سے دیوار پر پھیلانے میں لگن تھی۔ چند گز کے فاصلے پر درخت کے نیچے کوئی بیٹھا ہے اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی نہ ہی اس نے اوھر اوھر دیکھنے کی زحمت کی تھی۔ میر حسن البتہ حیرت زدہ سا ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حواسوں پر چھا جانے والی وہ خوب صورت آنکھیں اس کے اتنے قریب رہتی تھیں۔  
گرمی شوق نظارہ کا اثر تو دیکھو گل کھلے جاتے ہیں وہ سلیہ در تو دیکھو

وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو  
”کیا وہ چاچا کی بیٹی ہے؟“ میرا بھی حیرت سے اتنا ہی

سوچ پایا تھا کہ اچانک اس کی بھی نظر میر پر پڑی۔ پھر وہ بھی حیرت کا بت بنی بس دیکھتی ہی رہی۔ پھر ایک دم جیسے ہوش میں آئی اور فوراً ”نیچے اتر گئی۔ پڑھائی طرف اب کس کا دھیان رہا تھا۔ میر کتنی ہی دیر بلا وہاں بیٹھا رہا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو کتابیں سمیٹ اسکول واپس آگیا۔ کھانے کا پہلا نوالہ منہ میں ڈالے ہوئے ہاتھ رک گیا۔

”کیا کھانا اس نے بنایا ہوگا؟ کیا مصیبت ہے۔“ خود ہی اپنی سوچ پر جھینپ گیا۔ ان کے لیے کھانا رحما چاچا کے گھر سے بن کر آتا تھا۔ جس کے لیے اساتذہ مل ملا کر الگ سے بے منٹ کرتے تھے۔ رات کو بڑے لینا تب بھی اسی کا تصور سوچ پر غالب تھا۔ چمکتی ہر سنہری پیشانی۔ بکھری بکھری چند لٹیں۔ حیرت بھر شوخ نظروں۔ میر نے سر کے نیچے بازو ٹکا کر تارہ بھرے آسمان کو مسکرا کر دیکھا۔ اور اک محبت کی طویل رات۔ جانے صبح کب ہو، میر نے ایک کر بدلی۔

مہراں تیری نظر تیری ادائیں قاتل تجھ کو کس نام سے اے دوست پکارا جائے

\*\*\*

”بازار چلو گے میر۔“ سر مختیار نے جوتے پہ ہوئے اسے دیکھا۔

”کون سے بازار؟“ میر حسن رجسٹر پر جھکا تھا، نہیں پایا۔

”ارے بھائی۔ میں اور سر بشیر یہیں گاؤں بازار تک جا رہے ہیں۔ پرنسپل صاحب کو آج واپس جانا ہے۔ پہلے انہیں اڈے تک چھوڑیں۔ اور پھر بازار سے چھوٹا موٹا سامان لے کر واپس آجائے گے۔“

”نہیں۔ مجھے تو کچھ خاص نہیں لینا، آپ لو جائیں۔“ ان سے باتیں کرتا وہ خود بھی گیٹ آگیا۔ اسکول مکمل طور پر بچوں سے خالی ہو چکا تھا۔ رحمان چاچا بھی شاید گھر چلے گئے تھے۔ میر حسن

گیٹ پر رک کر ان سب کو جاتا دیکھتا رہا۔ ادائیں طرف نظر گھمائی تو اسکول کی بچیاں دور کھیتوں میں پھیلی نظر آئیں۔ یقیناً ان کے اسکول کی بھی اب چھٹی ہوئی تھی۔ میر نے سینے پہ ہاتھ باندھ کر گیٹ سے ٹیک لگائی۔ اسی دم سامنے درختوں کے جھنڈ سے دو لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ ایک لڑکی آگے سے دوسرے راستے کو مڑ گئی اور کالی چادر میں ملبوس وہ سیدھی ادھر کو آنے لگی۔ میر کا دل عجیب ترنگ میں دھڑکا۔ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ اس نے بالکل میر حسن کے آگے سے گزر کر جانا تھا اس لیے کافی نزوس ہی تھی۔ میر نے بہت کوشش کی کہ اندر چلا جائے، لیکن پیر جیسے کسی نے جکڑ لیے تھے۔ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں گیا۔ وہ کبھی سر کی چادر ٹھیک کرتی، کبھی کندھے پہ دھرے بیگ کو سیٹ کرتی۔ کبھی نظر جھکائی، کبھی آدھی اوپر اٹھاتی شاید وہ بھی خود کو دیکھنے سے روک رہی تھی، لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور بالکل قریب سے گزرتے ہوئے گھبرائی گھبرائی نظر بس لحاظ سے بھر کو اس کی طرف اٹھائی اور پھر تیز تیز چلتی آگے بڑھ گئی۔ میر نے اسے دور تک جاتے دیکھا اب وہ اپنے گھر کی طرف مڑ گئی تھی۔

کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں میری سنیں تو دل کا کہا مان جائے  
میر بھی مسکراتے ہوئے اسکول کے اندر چلا گیا

\*\*\*

اسکول کی چھٹی ہوئی تو میر چاچا کو دیکھتا ہوا دروازے تک آیا۔ چاچا کی عادت تھی کہ پیچرز کا ضروری سامان چھٹی کے فوراً بعد بازار سے لے آتے تھے اور پھر دو تین گھنٹے کے لیے گھر آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ میر نے کچھ ضروری چیزیں منگوائی تھیں۔ اس نے چاچا کے گھر کا دروازہ بجایا تو حشمت کا بڑا لڑکا باہر آیا اور اس نے بتایا کہ دادا ابھی سائیکل لے کر بازار گئے ہیں۔

”اوس۔“ میر واپس کے لیے پلٹا تو اسی وقت ”وہ“ اسکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ آئی دکھائی دی۔ میر پر

نظر پڑی تو بے ساختہ ٹھٹھک کر رک گئی، پھر اچانک خیال آنے پر دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ درخت کے نیچے دونوں نے ایک دوسرے کو کراہ کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے گھبرا کر نظر جھکالی۔ اسکول کی طرف مڑتے ہوئے میر نے ایک بار پیچھے دیکھا تو وہ اپنے دروازے میں کھڑی میر کو دیکھ رہی تھی۔ میر کو ہنسی آگئی۔ درخت سے یہاں تک کا سفر اگر بیس، پچیس قدم تھا تو درخت سے چاچا کا گھر بمشکل دس بارہ قدم کے فاصلے پر تھا، یعنی اس کو تب تک گھر کے اندر چلے جانا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ صرف میر کو دیکھنے کی خاطر وہاں رک گئی تھی۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ اگلے ہفتے جب وہ گاؤں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زمیندار کے بیٹے رجب کی شادی ہے، تمام اساتذہ کو بھی بلایا تھا۔

”جانا ضروری ہے؟“ میر نے قدرے بے زاری سے سر بشیر کو دیکھا۔

”ہاں۔ یہ لوگ استادوں کی بہت عزت کرتے ہیں اور ہماری عدم دلچسپی ان کو بلا وجہ ہماری طرف سے بدگمان کر دیتی ہے۔ پرنسپل صاحب خصوصی ہدایت کر گئے تھے کہ رجب کی شادی میں شرکت کرنی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ خود بھی کل آجائیں۔ ان کے مخدوم صاحب سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور تمہیں تو ہم ویسے بھی ضرور ساتھ لے جاتے ایک تو یہاں نئے ہو، دوسرے جب سے آئے ہو اسکول میں پڑے ہو۔ اتنا خوب صورت علاقہ ہے۔ ذرا گھومو پھو۔“ سر مختیار نے قائل کرنے والے انداز میں کہا تو میر حسن نے سر ہلادیا۔

اگلے روز اسے پتا چلا کہ شام کو انہوں نے رحمان چاچا اور ان کی فیملی کے ساتھ شادی پہ جانا ہے کیونکہ زمیندار صاحب کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے پہ تھا اور چاچا نے کہا تھا کہ رات کو ان علاقوں میں آنکھٹے نکلنے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔

وہ لوگ تیار ہو کر باہر نکلے تو چاچا کے گھر والے بھی آن پہنچے۔ میر حسن نے ایک اڑنی پڑتی نظر اس پر ڈالی تو



وہ جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی گھبرا کر دوسرے طرف دیکھنے لگی۔ میرا پیچھے کے ساتھ آگے چلنے لگا۔ چاچا نارنج سنبھالے سب سے آگے رہنا مانتی کر رہے تھے جبکہ حشمت پیچھے اپنے گھر کی خواتین کے ساتھ چل رہا تھا۔ میرا کو آج پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ گاؤں کافی بڑا تھا۔ زمیندار صاحب کے ہاں خوب ڈھول شہنائیاں پٹی جا رہی تھیں۔ وہ لوگ مردانے میں آگے اور عورتیں اندر چلی گئیں۔ کھانے پینے کے بعد — سر بشیر نے مخدوم صاحب سے اجازت لی۔ رحمان چاچا نے کہا کہ وہ اور حشمت ابھی زمیندار صاحب کے پاس رکیں گے۔ اس لیے وہ لوگ ان کی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیتے جا میں۔ چاچا نے ان کو زنانے سے بلوایا۔ تھوڑی ہی دیر میں حشمت کی بیوی اس کے دو بچے اور وہ باہر آگئی۔

سر مختیار اور سر بشیر نارنج لیے آگے چلے گئے۔ میرا کے موبائل میں بھی نارنج تھی۔ اس لیے سر بشیر نے اسے سب سے آخر میں رہنے کو کہا، تاکہ پیچھے بھی روشنی رہے۔

میرا نظریں جھکائے خواتین کے پیچھے آگیا۔ سب احتیاط سے قدم جماتے گھر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ میرا نے محسوس کیا کہ وہ جان بوجھ کر سب سے آخر میں رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلاوجہ باتوں کی نسبت ست ہو جاتی اور یوں نسبتاً "میر کے قریب ہو جاتی" بہت بار آپس میں نظریں بھی ملیں۔ وہ ہلکے سبز سوٹ کے ساتھ براؤن کڑھائی والی چادر پہنے ہوئے تھی۔ شادی کی مناسبت سے ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ کہیں کہیں جب روشنی والی جگہ آتی تو میرا سے دیکھنے کا موقع نکال لیتا۔ اس کے کھلے ہوئے رنگ کی وجہ سے آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیر بہت نمایاں اور خوب صورت لگ رہی تھی۔

سر بشیر اور سر مختیار سب سے آگے چلتے ہوئے باتوں میں مگن تھے۔ حشمت کی بیوی اپنے بڑے لڑکے کو دائیں اور چھوٹے کو بائیں ہاتھ سے پکڑے پیچھے چل رہی تھی۔ بس وہی دوتھے جو کبھی ہم قدم تو کبھی

تھوڑا سا آگے پیچھے چلتے ایک دوسرے کی موجودگی سے سرشار تھے۔ آج میرا کو پوری طرح اس کے جذبات سے آگاہی ہو گئی تھی۔ یقیناً "سانپ والے" واقعے نے دونوں کی زندگی میں ایک جیسی ہلچل پیدا کی تھی۔ میرا کو وہ سب اس کی آنکھوں میں دکھائی دے رہا تھا جو وہ خود اس کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر قریب آنے تک ان کے بیچ بنا ایک بھی لفظ بولے ہم آپس کی کا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا۔ تب ہی خشک نالے پر میرے رکھوائے گئے تھے بر سے گزرتے ہوئے پہلی بار اس نے شرابی شرابی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا، جس کے جواب میں وہ بھی مسکرا دیا۔

اس رات دیر تک میرا کو نیند نہیں آئی۔ بے چینی سے کرو میں لیتے وہ ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا کہ خود کو لاپرواہی سے محبت کی موجوں کے حوالے کر دینا مناسب نہیں، اس طرح کہیں وہ اپنی اور کسی "معصوم" کی رسوائی کا باعث نہ بن جائے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دشت جنوں میں پڑنے والا پہلا قدم دشت بل تک جاتا ہے۔ جیسے سمندر کی گہرائی کا اندازہ اس کے کنارے سے ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ان چمکیلی آنکھوں کی سحر خیزی میں اتر چکا تھا۔ لیکن خود کو باور کرانا اب بھی نہایت مشکل لگ رہا تھا۔



تکیوں میں منہ چھپا کر بے آواز رونا تو بچپن سے نانا کی عادت بن چکا تھا اور چار برس پہلے جب اماں نے منہ موڑا تب تو من چاہی زندگی جینے کی رہی سہی آس بھی دم توڑ گئی تھی اس نے تو آئینہ دیکھا بھی چھوڑ دیا تھا کہ کہیں اپنی بے پناہ خوب صورتی اسے کوئی اونچے خواب نہ دکھانے لگے۔ جب سہیلیاں اسے اپنی بھابی بنانے کی خواہش ظاہر کرتیں تو بے ساختہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھنے لگتی، جہاں پیدائش کے دن سے ایک ہی تحریر لکھ دی گئی تھی، اب سے پہلے صرف ایک بار اپنے نصیب سے لڑی تھی، جب برسوں

پہلے اسکول جانے کی بات بابا سے منوائی تھی۔ پھر بھی دو سال لالہ کی ضد کی بھینٹ چڑھ گئے اور وہ اپنی ہم عمروں سے دو سال پیچھے رہ گئی۔ لیکن اب کی بار تو ناز نے ایک آہ بھر کر آنکھیں بند کیں۔ جن میں چند دنوں سے صرف ایک ہی صورت بس گئی تھی میرا صاحب کی گہری کالی آنکھیں جب اسے اپنائیت سے دیکھتیں تو ناز کا باغی دل ہر جنگ کا سامنا کرنے کے لیے جیسے خود اس کے اپنے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور گھنی تراشیدہ موچھوں تلے آشنائی سے مسکراتے گلانی ہونٹ جیسے برسوں کی پہچان کا تاثر لیے ہوتے تھے، کیا محبت اتنی خوبصورت ہوتی ہے؟ بنا اس کیفیت سے گزرے وہ کبھی اس حسن کا تصور نہ کر پاتی۔ ناز اپنی دائیں ہتھیلی پر نظریں جمائے تصور میں کھوسی گئی۔ جب سے میرا نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا تھا اس کے دھڑکتے دل کو وہ تب سے اپنی پور پور میں محسوس کرتی تھی۔

ان جھیل سی گہری آنکھوں میں

ایک شام کبھی آباد تو ہو

پھر چاہے عمر سمندر کی

ہر مون چہریشاں ہو جائے

پھر چاہے آنکھ درتے تھے سے

ہر خواب گریزاں ہو جائے

پھر چاہے پھول سے چہرے کا

ہر درد نمایاں ہو جائے

اس جھیل کنارے پل دوپل

وہ روپ نگر ایجاد تو ہو۔۔۔

"کیا میں میرا صاحب کو سب بتا دوں۔۔۔؟" ایک خیال کے آتے ہی ناز اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہوں گے تو شاید کوئی مدد کر دیں۔ لیکن۔۔۔" وہ پریشانی میں انگلیاں چٹکانے لگی۔

"میں نہیں بتا کر کہیں ان کے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دوں۔۔۔ پر بتا دینے کا فائدہ انہیں بھی تو ہو گا۔ وہ میرے بارے میں جان جائیں گے تو ہم ایک دوسرے سے دور ہو سکیں گے ورنہ یہ روز کا آنا سامنا

مجھے ہر بات بھلانے پر مجبور کر دے گا۔" اس نے فیصلہ کر کے کچھ اطمینان محسوس کیا۔

میرا پیچھے کے کتابیں لیے درخت کے نیچے آکر بیٹھا تو کچھ ہی دیر بعد چاچا چائے کی ٹرے لیے اپنے گھر سے نکلے۔ میرا کو اس کا کپ دیا اور خود آگے بڑھ گئے، ان کے جانے کے چند منٹ بعد ہی دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی، میرا نے چونک کر ادھر دیکھا تو وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ میرا سے نظریں ملیں تو اس نے کچھ گھبراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، جس میں ایک لفافہ تھا شاید۔ میرا تھورا جھجک کر اٹھا کیونکہ اس پاس اور تو کوئی نہیں تھا۔ میرا کو اٹھتے دیکھ کر اس نے لفافہ دروازے کے سامنے نیچے زمین پر رکھ دیا اور خود اندر چلی گئی۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میرا کو ہی لفافہ دینا چاہتی تھی۔ میرا لفافہ اٹھا کر واپس اپنی جگہ پر آیا۔ پورے دو صفحات پر مشتمل وہ خاصی تفصیلی تحریر تھی، میرا نے اچھے دماغ کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

السلام علیکم استاد صاحب

صاحب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہمارا آپس میں کوئی رشتہ ہے نہ تعلق، پھر میں آپ کو خط کیوں لکھ رہی ہوں۔ اس گستاخی کے لیے آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ لیکن جو باتیں میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں، وہ میں کسی اور کو نہیں بتا سکتی۔ میرا دل کہتا ہے شاید آپ میری کوئی مدد کر سکیں گے۔ آپ سے پہلے میں نے اپنے اسکول کی ایک استانی سے مدد مانگی تھی لیکن میری بد قسمتی کہ ان کا تبادلہ ہو گیا اور وہ یہاں سے چلی گئیں۔ صاحب آپ کو یہاں آئے بہت کم وقت ہوا ہے لیکن بابا کہتے ہیں میرا صاحب جیسا نیک انسان انہوں نے پہلے نہیں دیکھا۔ دوسرے میں خود بھی آپ کو دیکھ چکی ہوں۔ اس دن آپ نے ہمیں سانپ سے بچایا اور بعد میں ہمارے اسکول کا راستہ بھی ٹھیک کر دیا۔

صاحب دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں جو پیر نعمت شاہ کا مزار ہے، پہلے اس کی خدمت گاری ہمارے خاندان کے پاس تھی۔ میرے دادا پیر بابا



کی مزار کے متولی تھے ایک بار انہیں خواب میں حکم ملا کہ اپنی بیٹی یعنی میری بوا کو پیر بابا کی خدمت میں ساری عمر کنوارا رکھا جائے۔ دادا بابا نے خواب کو پیر بابا کا اشارہ سمجھا اور پورے گاؤں میں اعلان کر دیا کہ ان کی بیٹی ساری عمر کنواری رہے گی اور مزار کی دیکھ بھال کرے گی۔ جس وقت دادا بابا نے یہ اعلان کیا گلشن بوا بہت چھوٹی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت تھیں۔ لیکن ہمیشہ بہت چپ اور اداس رہتی تھیں۔ ان کی کچھ سہیلیاں پاس کے گاؤں میں رہتی تھیں وہ جب بھی بوا سے ملنے آتیں ان کے دل میں شادی کا خیال ڈالتیں۔ پھر ایک دن گلشن بوا اغوا ہو گئیں اور بہت دن بعد پتا چلا کہ وہ ساتھ والے گاؤں میں ہیں اور ان کی شادی اپنی سہیلی کے بھائی سے ہو گئی ہے۔ دادا بابا سب کو یہی کہتے تھے کہ ان کی بچی کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے لیکن اندر سے وہ جانتے تھے بوا کی اپنی مرضی اس میں شامل تھی۔ گاؤں والوں نے ہم پر بہت باتیں بنائیں اور ہمارے خاندان سے مزار کی خدمت لے لی گئی۔

یہ سارا قصہ میرے پیدا ہونے سے دو سال پہلے کا ہے۔ مزار سے متصل ہمارا ذاتی مکان بھی ہم سے ملے کر نئے متولوں کو دے دیا گیا۔ تب سے یہی جھگڑا چلا آ رہا ہے کہ مزار کی خدمت کا ذمہ ہمیں واپس کیا جائے۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے دادا نے فیصلہ کیا کہ مجھے گلشن کی جگہ مزار کی خدمت گار بنایا جائے گا۔ تاکہ ہمارا مکان بھی ہمیں واپس مل جائے۔ پھر دادا ابا تو فوت ہو گئے لیکن میرے بارے میں کیا فیصلہ آج بھی برقرار ہے۔

صاحب میں نے بہت ضد کر کے اسکول میں داخلہ لیا تھا ورنہ حشمت لالہ میری پڑھائی کے سخت خلاف تھے۔ کیونکہ ان کو جلد از جلد مکان واپس چاہیے تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ بس چودہ پندرہ سال کی ہوتے ہی مجھے مزار کی خدمت گار بنادیا جائے لیکن میری اماں کو مجھے پڑھانے کا بہت شوق تھا اس لیے انہوں نے حشمت کی ایک نہیں سنی۔ ان کی تو یہ بھی خواہش تھی کہ ایک دن میں پڑھ لکھ کر اپنے اسکول میں استانی

لگوں۔

صاحب میں اپنی کلاس میں سب سے لائق ہوں۔ ہر سال اول آتی ہوں۔ اس لیے بابا کا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ میں میٹرک کر لوں۔ لیکن صاحب جب سے میں دسویں جماعت میں آئی ہوں لالہ روز بابا سے کہتے ہیں کہ اس کو اسکول بھیجنا بند کر دیں اور پیر بابا کے مزار پر بٹھا آئیں تاکہ ہمارا مکان ہمیں واپس مل جائے۔ صاحب مجھے لگتا ہے اگر کوئی آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی بابا اور لالہ کو سمجھائے تو شاید میری زندگی بدلنے سے بچ جائے مجھے یہ تو نہیں پتا کہ آپ میری کس طرح مدد کر سکتے ہیں لیکن میرا دل چاہا کہ آپ کو اپنے حالات بتاؤں۔ استاذ جی! اگر بابا لالہ کی بات مان گئے تو میں اپنی جان دے دوں گی کیونکہ میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔

والسلام۔ ناز بتول

میر نے خط تمہ کر کے چاچا کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ اب وہاں نہیں تھی۔ میر نے ایک گہرا سانس لیا اور وہیں کچے راستے پر ٹھلنا شروع کر دیا۔ جن حالات کا ذکر ناز نے اپنے خط میں کیا تھا اگر کسی اور لڑکی کے ساتھ پیش آئے ہوتے جس سے دلی تعلق نہ ہو تب بھی انسانیت کے نام سے اس کی مدد کرنا فرض بن جاتا اور وہ تو کچھ دنوں سے دل کے بھی بہت قریب آگئی تھی۔ میر کا اس کے لیے تکلیف محسوس کرنا فطری تھا۔ پھر اس کا ساتھ انداز تحریر۔ کتنے سیدھے اور سچے لفظ تھے۔ عموماً خط کے نام سے ذہن میں ایک ہی روایتی تاثر آتا ہے، میر کو بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا۔ لیکن ناز کے خط نے اس کے لیے دل میں مقام اور بھی بلند کر دیا تھا۔ وہ اس سے مدد مانگ رہی تھی۔ شاید اسے کسی قابل سمجھ کر اور اب امی کے خواب کی گرہ بھی کچھ کچھ کھلنے لگی تھی۔

جانے اس کو جواب کب اور کیسے دینا ہے۔ خط میں بھی کچھ لکھا نہیں تھا۔ میر نے جواب کو اگلی سہ پہر تک چھوڑتے ہوئے کتابیں سمیٹیں اور اسکول آگیا۔ خط جواب اس نے رات کو ہی لکھ لیا تھا۔ اگلی سہ پہر جب

وہ پڑ کے نیچے آکر بیٹھا تو کچھ ہی دیر بعد ناز دروازے پر آگئی۔ میر نے خود ہی آرام سے جا کر اس کے ہاتھ میں خط دے دیا کیونکہ رحمان چاچا اس کے سامنے ہی سائیکل لے کر بازار کے لیے نکلے تھے۔

”بہت شکریہ کہ تم نے مجھے بھروسے کے قابل سمجھا۔ تم بالکل بے فکر رہو میں چاچا سے بہت سوچ سمجھ کر اس موضوع پر بات کروں گا۔ ان کو تم پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوگا۔ اور امید ہے کہ انہیں قابل بھی کر لوں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم واقعی بہت لائق اور ذہین ہو۔ تمہیں آگے بڑھنے کا پورا حق ہے۔ اپنی بچی نیت اور اللہ کی مدد پر یقین رکھو۔ جان دینے کی باتیں وہ کرتے ہیں جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہوں۔ اللہ سے اپنے کئے کی معافی مانگو اور اپنے لیے خیر طلب کرو۔ البتہ ایک بات مجھے ضرور جانی ہے۔ چاچا ایک لائن میں اس کا جواب دے دو۔ کیا واقعی تم نے صرف اس لیے اپنے حالات مجھے بتائے کہ میں پڑھا لکھا ہوں اور تمہارے بابا مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔؟“

میر نے احتیاطاً ”سلام والقباب سے اجتناب کیا تھا۔ دس منٹ بعد ہی ناز نے دروازے میں واپس آکر جواب اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”صاحب جی۔۔۔ وجہ تو مجھے بھی معلوم ہے اور آپ کو بھی۔ لیکن میں آپ کی برابری کرنے کے لائق نہیں، آپ بہت بڑے ہیں۔ صاحب اگر میرے بابا مجھے مزار کا پابند نہ کریں اور بڑھتے رہنے کی اجازت دے دیں تو بدلے میں ان کا ہر حکم مان لوں گی، کوئی اور بڑا خواب دیکھنے کا میرا حوصلہ نہیں ہے۔“

میر اس کی ذہانت کا ایک بار پھر قائل ہو گیا۔ وہ اس کی بات بڑی آسانی سے سمجھ گئی تھی اور جواب بھی بہت واضح تھا۔ اگرچہ تھوڑا مایوس کن تھا۔ وہ مسکرا کر کمرے میں آگیا۔

خار بیجے ہیں مجھے اس نے تو حیرت سی ہوئی کوئی چاہت بھری سوچات بھی ہو سکتی تھی سب سے وابستہ میری ذات کو کرنے والے مجھ سے وابستہ تیری ذات بھی ہو سکتی تھی

☆ ☆ ☆

”یہ ساری زمین آپ کی ہے چاچا۔؟“ میر نے اگلے ہی دن بات کرنے کا موقع نکال لیا۔ چاچا اسے چائے دینے آئے تو میر نے انہیں اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

”نہیں استاد صاحب۔ بس یہ سامنے کا وہ ایکڑ رقبہ ٹھیکے پر لیا ہوا ہے۔“

”اور حشمت کی دکان کیسی چلتی ہے؟“ حشمت کی بازار میں پرچون کی دکان تھی۔

”بس صاحب! اپنے بال بچوں کا اچھا گزارہ کر لیتا ہے۔“

”گھر آپ کا اپنا ہے چاچا۔؟“ میر نے لہجے کو سرسری بنایا۔

”یہ گھر تو کرائے کا ہے صاحب۔ لیکن اپنا ایک ذاتی مکان بھی ہے یہاں۔“ چاچا آہستہ آہستہ کھل تو رہے تھے۔ میر نے مزید بات برہمائی۔

”ذاتی مکان کے ہوتے ہوئے کرائے کے مکان میں کیوں رہتے ہیں چاچا؟“

”بس صاحب۔ کچھ لڑائی جھگڑے کا معاملہ تھا جس وجہ سے وہ گھر تو چلا گیا لیکن زمیندار صاحب نے مہربانی کی، اسکول کی چوکیداری تو میں شروع سے کر رہا تھا پر رہتا اپنے ذاتی مکان میں تھا۔ پھر جب اپنا گھر چلا گیا تو زمیندار صاحب نے اسکول کے ساتھ ملی ہوئی اپنی زمین پر کرائے کا گھر بنوایا رہنے کے لیے اور زمین بھی ٹھیکے پر کاشت کے لیے دے دی۔“

”تو عدالت کے ذریعے اپنا حق واپس لے لیں۔“

”عدالت نہیں جاسکتے صاحب۔ گھر کی باتیں لوگوں کی زبان پر آجاتی ہیں۔“

”میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔؟ کس کا قبضہ ہے گھر پر، معاملہ کیا ہے؟“ اب کی بار میر نے کھل کر پوچھنا مناسب سمجھا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چاچا نے اسے اپنی بہن والا سارا واقعہ سنا ڈالا۔

”تو پھر گھر واپس کیسے ملے گا؟“



”پنچائیت کہتی ہے میں اپنی بیٹی کو عمر بھر کے لیے مزار کی خدمت پر بٹھا دوں تو گھر واپس مل جائے گا کیونکہ میرا باپ مرنے سے پہلے یہی فیصلہ سنا کر گیا تھا۔ یعنی پھر ساری زندگی اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہر حال آخری فیصلہ تو ہمیں ہی کرنا ہے۔“

”او۔۔۔ تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”بس صاحب۔ اسی سوچ بچار میں ہوں کہ کیا کروں۔ حشمت تو کہتا ہے ایک دن بھی انتظار نہ کروں۔“

”لیکن چاہا! یہ تو ظلم ہے اور یہ رسم بھی سمجھ سے باہر ہے۔ بھلا ایک ایسا بزرگ جس کے مزار پر لوگ اس عقیدت سے آتے ہیں کہ وہ اللہ کا نیک بندہ تھا اور ہم گنہگاروں کی نسبت اللہ کے زیادہ قریب تھا وہ بھلا ایسا غیر انسانی اور غیر اخلاقی حکم کیسے دے سکتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں چاہا!؟“ میر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو انہوں نے ٹھنک سہلا دیا۔

”چاہا! ہم سب نے پلٹ کر اس رب کی طرف جانا ہے۔ جس نے یہ دنیا فنا کے لیے بنائی ہے وہ کیسے پسند کرے گا کہ مٹی گارے کے مکان کے لیے ایک جیتے جاگتے انسان کو قربان کر دیا جائے۔ ہم سے اپنی اولاد کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا چاہا! کیا آپ اللہ کے سامنے سرخرو نہیں ہونا چاہتے؟ یہ ظلم مت کریں اور حشمت کو بھی سمجھائیں۔“ میر نے انہیں سمجھانے کی اپنی سی پہلی کوشش کی۔ چاہا کا فوری رد عمل بھی کچھ کچھ مثبت ہی نظر آیا۔ وہ چائے کے برتن لے کر اندر چلے گئے اور میر نے آسمان کی طرف دیکھ کر ان کی مزید ہدایت کی دعا کی۔

اگلے روز ڈیوٹی کے بعد وہ گھر چلا گیا۔ پیر کے دن پھر صبح سویرے وہ تھا اور اسکول کا سفر اس نے سوچ لیا تھا کہ ناز کے معاملے کو آئندہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر دیکھے گا اور چاہا کو بھی اس سلسلے میں سمجھاتا رہے گا۔ ناز شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی اگر اس کے دو بنیادی مسائل حل ہو جاتے ہیں تو یہی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ میر خود بھی پہلے دن سے اپنے آپ کو یہی

سمجھا رہا تھا کہ نوکری والی جگہ پر اپنا دامن ایسی باتوں سے بچا کر رکھنا چاہیے ناز کے خط نے ثابت قدمی کو مزید تقویت دی۔

مٹی کے مہینے میں شدید گرمی پڑی تو اس نے پیڑ تلے بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ ناز سے صرف دو مرتبہ آتے جاتے سامنا ہوا۔ اسکولوں میں گرمی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ میر نے رحمان چاچا کو تسلی سے پاس بٹھا کر ایک مرتبہ پھر سمجھایا وہ نہیں چاہتا تھا کہ تین مہینوں کے دوران اس کی غیر موجودگی میں ایسا کچھ ہو جائے جس کے لیے وہ کبھی خود کو معاف نہ کر سکے۔ کیونکہ ایک بار کھلی پنچائیت میں ناز کا فیصلہ ہو جاتا تو پھر اس کو تبدیل کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا، لیکن صرف چاچا کو کہہ دینا کافی نہیں تھا۔ چاہا اس کے سمجھانے پر قائل تو یقیناً ہو گئے تھے لیکن کسی دباؤ میں آکر بدل بھی سکتے تھے۔ میر کسی طرح ناز سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی طریقہ نہیں سوچ رہا تھا۔

چھٹیوں میں صرف دو روز رہ گئے تھے۔ میر نے چھوٹا سا خط پہلے ہی لکھ رکھا تھا۔ شام کو ہلکی سی ہوا چلی تو وہ پیڑ کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ تب تک ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس وقت گزاری کے لیے کتاب پڑھنے لگا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گزرا کہ حشمت کا چھوٹا بیٹا کھیلتا ہوا وہاں آیا۔

”اوئے بچے۔۔۔ ادھر آؤ۔“ میر نے بلایا تو وہ گھبرا کر رک گیا۔

”جاؤ ذرا اندر سے ٹھنڈی پانی کا گلاس لے آؤ۔ اور سنو۔ کہنا کہ سر میر مانگ رہے ہیں۔ بتاؤ۔ کیا کہو گے۔۔۔؟“

”سر میٹر مانگ رہے ہیں۔“ اس نے پتلی سی معصوم آواز نکالی تو میر نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔

”ٹھیک ہے شاباش جاؤ۔“

کچھ ہی دیر بعد وہ پانی لے آیا اور اس کے پیچھے ناز بھی دروازے میں آئی۔ میر کا آئینہ کام کر گیا تھا۔ وہ یقیناً سمجھ گئی تھی کہ میرا ہر پیڑ کے نیچے ہے۔ نظر ملنے پر میر نے ہاتھ میں پکڑا خط ناز کو دکھایا اور پانی پی کر خط

رول کر کے گلاس میں ڈال دیا۔ ناز نے بچے سے گلاس لے کر اسے اندر بھگا دیا۔ میر نے خط میں اپنا موبائل نمبر ناز کو دیا تھا اور لکھا تھا کہ اگر چھٹیوں کے دوران اسے کوئی مسئلہ درپیش آئے تو اس سے کسی طرح رابطہ کر لے۔



یہ جولائی کا اینڈ چل رہا تھا۔ جون کا پورا مہینہ تو امتحانوں کی نذر ہو گیا تھا۔ جولائی کے آغاز میں وہ دو ہفتے کے لیے دوستوں کے ساتھ مردان کی سیر کو چلا گیا تھا۔ باقی کے دن یوں تو گھر میں سکون سے گزر رہے تھے۔ جس میں کبھی کبھار دوسری امی اور بہنیں ساٹھ اور نیلم اپنی بے رخی کا پتھر گرا دیتیں۔ اور سکون عارضی طور پر بے سکونی میں بدل جاتا۔ لیکن خیر اس روٹین کا وہ گزشتہ اٹھارہ برسوں سے عادی تھا۔ وہ سات سال کا تھا جب اس کی امی دنیا سے چلی گئیں۔ اور ایک سال بعد جب ابائے دوسری شادی کی تو میر نے پہلے دن سے انہیں بھی امی ہی کہا، عارفہ پھپھو نے اسے پاس بٹھا کر پیار سے یہی سمجھایا تھا کہ وہ اپنے رویے سے نئے رشتوں میں فاصلہ پیدا نہ کرے۔ میر نے اپنی عمر اور سمجھ کے مطابق حتی الامکان پہلے نئی امی اور آنے والے سالوں میں دو بہنوں سے اپنائیت پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ لیکن گزرے اٹھارہ سالوں میں ان سب نے مل کر فاصلے کو خود ہی اتنا کھینچ ڈالا تھا کہ اب قریب آنے کی کسی بھی کوشش کا رنگ لانا تقریباً ناممکن تھا۔ جولائی کا آخری ہفتہ چل رہا تھا جب ایک دن اچانک ناز کا فون آگیا۔ فوری طور پر میر بہت پریشان ہو گیا کہ شاید کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ لیکن ناز نے تسلی دی کہ وہ اپنی دوست یا سمین کے ہاں آئی ہوئی ہے اور اس کے موبائل سے صرف خیر خیریت جاننے کے لیے فون کر دیا تھا۔

”او۔۔۔ اچھا۔۔۔ میں خود بھی کچھ روز سے یہی سوچ رہا تھا کہ چاہا کو فون کر لوں تاکہ حال احوال کے بہانے

تمہارے حالات جان سکوں۔“

”اس دن حشمت لالہ نے بابا کو بہت مجبور کیا کہ پنچائیت بلوا کر اس معاملے کو نبھائیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے بابا پر آپ کی باتوں کا کافی اثر ہوا ہے کیونکہ وہ لالہ کو اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف دلا رہے تھے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ امید ہے وہ آگے بھی تمہارا ساتھ دیتے رہیں گے۔“

”آ۔۔۔ آپ۔۔۔ اسکول کھلنے پر ہی گاؤں آئیں گے؟“

ناز نے بہت جھجک کر سوال کیا۔

”ہاں لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ درمیان میں کسی دن آنے کا کوئی موقع بھی نہیں بن رہا۔“

”وہ۔۔۔ بابا کہہ رہے تھے کہ اگست میں اسکول کو نیا فرنیچر ملنے والا ہے۔“

”اچھا۔۔۔؟ ہو سکتا ہے کیونکہ میرا کسی سے رابطہ نہیں ہوا۔ پر پبل صاحب سے پوچھوں گا۔“

”تو پھر آپ گاؤں آئیں گے؟“ اس کے انداز میں واضح اصرار تھا، میر کو ہنسی آگئی۔

”تم کیا کہتی ہو۔۔۔ آؤں؟“ میر نے الٹا اسی سے سوال کر دیا تو جواباً خاموشی چھا گئی۔ میر نے گلا کھنکھارایا۔

”چلی گئیں کیا۔۔۔؟“

”اگر آپ کا دل کرتا ہے تو آجائیں۔“ اس نے نہایت دھیمی آواز میں بمشکل اتنا کہا۔

”دل کی آواز سننے سے تو تم نے منع کر دیا تھا۔“ میر نے پہلی بار شرارت کی۔

”آپ اتنا کہنا مانتے ہیں سب کا۔۔۔؟“ بڑا بے ساختہ سوال تھا۔ میر کا قہقہہ نکل گیا۔

”ہاں۔۔۔ عادت تو ہے۔ کوشش کروں گا آئندہ نہ مانا کروں۔ تم کیا کہتی ہو۔“ میر نے کچھ جاننے کے انداز میں استفسار کیا تو وہ جھینپ گئی۔

”مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں اب فون بند کرتی ہوں۔“



”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ بہر حال کوئی کام نکلا تو میں گاؤں آنے کی ضرورت کو شش کروں گا۔“ اپنا خیال رکھنا۔“ میرنے ناز سے بات ختم کرنے کے فوراً بعد ہی پرنسپل صاحب کا نمبر ملایا۔ انہوں نے بتایا کہ دو اگست کو نیا فرنیچر اسکول جانا ہے اور انہوں نے سرمدایت اور سر شفیق کو گاؤں فون کر کے فرنیچر وصول کرنے کا کہہ دیا ہے۔ میر حسن نے جب اپنی خدمات پیش کیں تو پرنسپل صاحب بہت خوش ہوئے اور اسے بھی دو اگست کو مدد کے لیے دفتر بلا لیا۔

دو اگست کو سلمان کے ساتھ میر خود بھی گاؤں آیا۔ رحمان چاچا اور سرمدایت اسکول میں ہی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سر شفیق البتہ کسی کام کے سلسلے میں پشاور گئے ہوئے تھے۔ سرمدایت نے سلمان آف لوڈ کروانے کے لیے بہت سارے بڑے ٹرکوں کو بھی بلا لیا اور گھنٹے بھر میں ہی سارا سلمان ٹرک سے اتار لیا گیا۔ ٹرک ڈرائیور کو میر نے واپس بھیج دیا اور سارا فرنیچر اندر کمروں میں بحفاظت رکھوا دیا کیونکہ موسم کے تیور کافی خراب لگ رہے تھے۔ سرمدایت نے اسے کہا تھا کہ ڈرائیور کے ساتھ وہ بھی واپس چلا جائے اور باقی کام وہ خود کروالیں گے لیکن میر حسن نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دوبارہ طویل سفر کرنے سے اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اس لیے شام کو یا اگلی صبح واپس جائے گا۔ کام ختم ہونے کے بعد سرمدایت نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی لیکن چاچا نے یہ کہہ کر روک لیا کہ میر کے کھانے کا اہتمام انہوں نے کر لیا ہے سو سرمدایت بھی چلے گئے۔ میر کا کرا چاچا نے اسکول کے جمعدار سے صاف کروا لیا تھا۔ اس لیے کھانے کے بعد وہ کچھ گھنٹوں کے لیے سو گیا۔ سچ بچے چاچا چائے لے کر آئے تو وہ اٹھ گیا باہر کافی تیز آندھی چلنے لگی تھی۔

”میں تو کہتا ہوں صاحب آج نہ جائیں، شہر کے لیے آخری بس چھ بجے نکلتی ہے اب اتنی آندھی میں اڑے تک کیسے جائیں گے؟“

”جی چاچا۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اب صبح ہی

نکلوں گا۔“

چاچا چلے گئے تو میر لا بھری میں آگیا۔ بہت ساری اپنے کام کی کتابیں بھی نکالیں اور الماریوں وغیرہ کی سیٹنگ کر کے لا بھری کو اچھا خاصا ترتیب دے ڈالا۔ چاچا رات کا کھانا دے کر گئے تبھی تیز بارش شروع ہو گئی۔ شام سے ہی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ میر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ طبیعت عجیب ادا اس اور بو جھل سی تھی۔ شاید ناز کو دیکھ لینے کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی اس لیے۔ اوپر سے بارش اور ٹہائی ماحول کو مزید گھبیہ کرنے کا باعث بن رہے تھے۔ نیند بھی جلدی نہیں آئی تھی کیونکہ دوپہر کو کافی آرام کر لیا تھا۔ اس نے لی وی آن کر کے ماحول کی خاموشی توڑی اور ایک شاعری کی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اب بہت ہلکی ٹپ ٹپ لگی تھی۔ موبائل کی گھنٹی نے میر کو چونکا دیا۔ کال چاچا کے نمبر سے تھی۔ میر نے کلا کھنکھار کر ہلو کیا۔

”میں۔۔۔ نانہ۔“ نہایت دھیمی سرگوشی تھی لیکن میر کے حواسوں پر تو بجلی بن کر گری۔

”ناز تم۔۔۔ کیا بات ہے۔“

”آپ ابھی باہر آجائیں۔“ اس نے کہہ کر فون کاٹ دیا۔ میر نے رسٹ واپس پر نظر ڈالی ساڑھے بارہ بجے جلدی سے اٹھ کر باہر آیا۔ بہت آہستگی سے بنا آواز کیے گیٹ کھولا، باہر آکر اس پاس دیکھا وہ دائیں طرف دیوار کے قریب کھڑی تھی رات اگرچہ بہت تاریک تھی لیکن وہ ایک دوسرے کا چہرہ با آسانی دیکھ پا رہے تھے۔

”کیا بات ہے ناز، یہاں کیسے؟“

”وہ۔۔۔ گھر میں سب سو رہے تھے تو۔۔۔“ اس نے آہستہ سے کہہ کر سر جھکایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس وقت اس طرح۔“ میر کی حیرت کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے نامناسب وقت میں۔۔۔ اگر کوئی دیکھ لے تو۔۔۔؟ میر نے پریشانی سے اطراف کا جائزہ لے کر اس کی طرف دیکھا

تو وہ رو رہی تھی۔

”کیا ہوا نانہ۔۔۔ رو نے کیوں لگیں۔“ میر نے نرمی سے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر میر کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آہ۔۔۔ آپ میری خاطر میرے کہنے پر گاؤں آئے۔ اور اب واپس بھی نہیں گئے اور میں گھر میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ آپ کو اتنی تکلیف دی اور۔۔۔؟“ وہ پھر رونے لگی تو میر اس کشیدہ صورت حال میں بھی مسکرا دیا۔ اس کے بے ربط جملے کا مفہوم وہ آسانی سے سمجھ گیا تھا جگہ اور وقت بھلے نہایت ناموزوں تھے لیکن اظہار بہت حسین اور بر محل تھا۔ میر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور انگوٹھے کی مدد سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”تمہارے لیے اٹھائی تکلیف، تکلیف نہیں لگتی۔ اور ہاں تمہیں بنا دیکھے چلے جانا تو مجھے منظور تھا لیکن کوئی ایسی بے احتیاطی ہرگز منظور نہیں تھی جو تمہارے دامن پر داغ لگا دے۔ تمہیں بھی یہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ میرے لیے دکھ مت اٹھاؤ نانہ۔“

”مجھے خود نہیں پتا۔۔۔ میں نے اتنی ہمت کیوں کی اور کیسے باہر آ گئی۔ بس جب سے آپ کے آنے کا سنا دل میں عجیب سی بے چینی لگی تھی اور۔۔۔“ وہ پل بھر کو رکی۔

”صاحب میں نے اپنے بارے میں آپ کو بتا کر اچھا نہیں کیا۔ آپ سوچتے ہوں گے ناز کتنی خود غرض ہے صرف اپنا سوچتی ہے لیکن صاحب میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔ آپ کے بغیر گاؤں اچھا نہیں لگتا تھا“ آپ کو دیکھنے کے لیے میں یہاں تک۔۔۔“ وہ رونے کے ساتھ ساتھ بول بھی رہی تھی۔

”بس۔۔۔ بس۔۔۔“ میر نے اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر روک دیا اور اپنی پوروں سے اس کے آنسو صاف کیے۔ ”آگے کچھ مت کہو ناز۔ میں سب جانتا ہوں۔“ جانے آج اسے کیا ہو گیا تھا اس کی جذباتیت میر کو کمزور کر رہی تھی۔

”اب جاؤ ناز۔“ میر نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا اور واپس کے لیے مڑ گئی۔

کیوں نہ ہم اس کو دل و جان سے چاہیں تشنہ وہ جو اک دشمن جاں پیار بھی کرنا جائے

\*\*\*

اسکول کھل گئے۔ پرانی روٹین پھر سے رواں دواں ہو گئی تھی۔ اگست کے مہینے کو تو انتظار کا مہینہ کہنا زیادہ مناسب تھا یا پھر بحث مباحثے کا مہینہ۔ کیونکہ اب اس پر شادی کا زور ڈال رہے تھے اور شادی بھی اپنے سالے کی بیٹی ثوبیہ سے جسے میر اچھی طرح جانتا تھا نہ دھیان سے بھی دیکھا ہی تھا۔ پھر وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ آخر امی اسے اپنی سگی بیٹی سے کیوں بیاہنا چاہتی ہیں کیونکہ وہ تو میر کو خود سے دور کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھیں اچانک ایسے مہربان کیوں۔؟ لیکن معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا اس لیے عارفہ پھپھو کی مدد لی اور انہیں پوری بات بتائی۔ پھپھو نے اس سے چند دن مانگے اور جانے ان کے کیا ذرائع تھے کہ واقعی چند دن میں ساری کتنی سلجھ گئی۔ پھپھو نے بتایا کہ ثوبیہ کی حال ہی میں دو منگنیاں ٹوٹی ہیں۔ پہلی منگنی اس کی گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی جسے اس نے اپنی سہیلی کے بھائی کے چکر میں آکر توڑ دیا۔ گھر والوں نے مجبوراً اس کا رشتہ اس کی پسند کی جگہ پر کر دیا لیکن کچھ روز پہلے دوسری جگہ پر بھی جانے کس بنا پر لڑکے والوں نے رشتہ توڑ دیا اور اب ان خود سریوں کے بعد گھر والے ثوبیہ کو مزید کوئی مہلت دے دیے بنا اس کی جلد از جلد کہیں شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف ثوبیہ کا بھائی یعنی اس کی امی کا جھنجھا شہر پار ڈاکٹر بن چکا تھا جسے امی ساتھ کے لیے پسند کر چکی تھیں اور ہر حال میں ساتھ کی شادی شہر پار سے کروانا چاہتی تھیں۔ شاید انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے بھائی اور بھابھی سے کر دیا جس کا ڈراپ سین یوں ہوا کہ انہوں نے ثوبیہ کی میر سے شادی کی



شرط رکھ دی اور اسی بنا پر کچھ دنوں سے مسلسل اس پر دباؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ دن بڑی مشکل سے کٹے تھے۔ بہر طور کٹ ہی گئے۔ اسکول شروع ہوئے تو میر کو لگا جیسے پرندے کو بنجرے سے رہائی ملی ہو۔ گاؤں کی زمین پر قدم رکھا تو لگا جیسے ہر سمت بہار آگئی ہو۔ ناز کے تصور سے ہی روح تک سکون اتر آیا تھا۔

لیکن یہاں کی مصروفیت نے تو میر کا دماغ اور بھی چکرا دیا۔ پرنسپل صاحب پورے ہفتے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پہلے چار دنوں میں تو پتا ہی نہیں چلا کہ وقت کہاں گیا۔ اسکول کے بعد کا وقت بھی کاموں میں مصروف گزر رہا تھا۔ پانچویں روز وہ اتفاقاً اسی وقت گیٹ پر آیا تھا جب ناز اپنے اسکول سے واپس آرہی تھی۔ اسکول کے گیٹ پر پینٹ ہو رہا تھا۔ پرنسپل صاحب نے اسے دیکھنے کے لیے بھیجا کہ آدمی صحیح کام کر رہا ہے یا نہیں۔ میر نے آدمی کو ضروری ہدایات دے کر ناز کی طرف دھیان دیا، وہ اب کافی قریب آچکی تھی۔ اس نے بیک سے کچھ نکال کر ہاتھ میں لیا۔ میر نے غور کیا تو لگا خط ہے۔ میر نے کچھ سوچ کر ناز سے پہلے ہی چاچا کے گھر کا رخ کیا اور پیل کے نیچے جا کر رک گیا۔ چند منٹ بعد وہ بھی آگئی۔ وہ واقعی خط دینا چاہتی تھی۔ لیکن انداز کافی سنجیدہ سا تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور پس خط تھما کر چلی گئی۔ خط پر دو دن پہلے کی تاریخ درج تھی۔ یعنی خط اس نے پہلے سے لکھ رکھا تھا لیکن دینے کا موقع آج ملا تھا۔ میر نے وہیں کھڑے کھڑے ہی کھول لیا۔

السلام علیکم صاحب

”اسکول کھلے آج تیسرا روز ہے۔ لیکن آپ ایک بار بھی ہمارے پیڑ کے نیچے آکر نہیں بیٹھے، میں روز پانچ بجے کے بعد آکر دیکھتی ہوں۔ کل چھٹی کے بعد اسکول گیٹ کے سامنے سے گزری تو آپ دور کسی کے ساتھ پیٹھ کے باتوں میں مصروف تھے۔ شاید آپ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں۔ میں اپنا قصور مانتی ہوں، جی۔ اس رات مجھے آپ کو باہر نہیں بلانا چاہیے تھا۔ میں بہت مطلبی ہوں صاحب، آپ کی عزت خاک میں ملانے

چلی تھی۔ آپ مجھے معاف کر دیں صاحب، یا چاہیں تو برا بھلا کہہ لیں۔ لیکن اپنا غصہ ختم کر دیں۔“

اگست کا پورا مہینہ آپ کے چلے جانے کے بعد میں بہت بیمار پڑ گئی تھی، بابا مجھے کسی فقیر کے پاس لے گئے تھے دم کروانے۔ اس نے کہا کہ مجھ پر سایہ ہے اور کہا کہ پہاڑوں کا جن ہے اور کتا ہے اس لڑکی کا چچا نہیں چھوڑے گا۔ لالہ نے بابا سے کہا کہ اگر اسے جلد از جلد مزار پر نہ بٹھایا تو اور۔۔۔ مصیبتیں بھی آئیں گی۔ صاحب میں ان سب کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھ پر کوئی سایہ شایہ نہیں ہے۔ میں تو اتنے دن صرف آپ کے لیے پریشان تھی۔ بیمار بھی اسی لیے پڑ گئی تھی کہ پورا ایک مہینہ آپ کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ ایک ایک دن چٹھیاں ختم ہونے کا انتظار کیا۔ آپ کی بہت یاد آتی تھی۔

صاحب میں نے ہی آپ سے کہا تھا کہ اگر میری دو باتیں گھر والے مان لیں تو کوئی اور بڑا خواب نہیں دیکھوں گی، لیکن صاحب کیا کروں گی اس آزادی کا اور کیا ملے گا پڑھ لکھ کر۔ میرا تو اب جینے کو بھی دل نہیں کرتا دل چاہتا ہے لالہ سے کہوں ابھی مجھے مزار پر بٹھا آئیں اور اپنا مکان واپس لے لیں۔ کسی کے نو کام آوں۔“

میر نے ایک آہ بھر کر خط بند کیا۔ ناز اس کی وجہ سے تکلیف میں تھی۔ بھلا اسے آرام کہاں سے آتا۔ پانچ بجے کتابیں لے کر پیڑ کی چھاؤں میں آ بیٹھا۔ گرمی اگرچہ ابھی گئی نہیں تھی لیکن بہر حال برداشت کے قابل تھی۔ اس نے کانڈ پین سنبھال کر لکھنا شروع کیا۔

وعلیکم السلام

”سب سے پہلی بات یہ کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں اور اس رات جب تم نے مجھے بلایا تو مجھے بالکل برا نہیں لگا بلکہ بہت اچھا لگا اور یہ بات تم بھی جانتی ہو ورنہ اس طرح مجھ سے اکیلے میں ملنے نہ آتیں۔ تمہارا مجھ پر بھروسہ اس لیے ہے کیونکہ تم جانتی ہو کہ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ البتہ میں

نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ خود کو اس طوفان سے دور رکھوں تاکہ ہم دونوں کے لیے کوئی مصیبت نہ ہو لیکن اب میرے لیے بھی خود کو سمجھانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے بھی اسکول کھلنے کا انتظار اتنی شدت سے کیا جتنا تم نے۔ لیکن اسکول کھلتے ہی واقعی بہت زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔ تم اتنے دن بلا وجہ پریشان رہیں۔ اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔

جہاں تک پیر بابا کے مزار کی بات ہے تو جلدی میں کوئی فیصلہ مت کرو۔ ویسے بھی انسان کو اپنے مستقبل کے معاملات اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ ہم نے اپنی آنے والی زندگی کیسے اور کس کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس کا بہترین فیصلہ صرف اوپر والے پر چھوڑ کر پرسکون ہو جانا چاہیے۔ جہاں تک دم دینے والے فقیر کا تعلق ہے تو ایسی معمولی باتوں پر دھیان دے کر خود کو پریشان مت کرو۔ ویسے بھی اب تو میں آگیا ہوں، امید ہے اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو دم وغیرہ کروانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ خود کو خوش رکھا کرو اور اچھی اچھی باتیں سوچا کرو۔“

ناز کو جواب کا انتظار تھا اس لیے خود ہی دروازے پر آگئی تھی۔ میر نے اسی روز ہی خط اس کو دے دیا تھا۔

\*\*\*

اتوار کے دن وہ دیر تک سوتا رہا تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب موبائل بجاتا تو میر نے کسمندی سے ہاتھ بڑھا کر ہیلو کہا لیکن ناز کی آواز سن کر ایک سیکنڈ کے اندر پورا ہوش میں آگیا۔

”نانا کیسی ہو؟“

”اب تو ٹھیک ہوں۔ لیکن لگتا ہے لالہ بیمار کر کے چھوڑیں گے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”لالہ کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ اسی فقیر کو پھر بلا لائے تھے۔ اس نے کوئی تعویذ لکھ کر دیا ہے۔ اور بھابھی نے کپڑے میں سی کر میرے گلے میں پہنا بھی دیا ہے۔“

”تعویذ وغیرہ ایسے بے احتیاطی سے نہیں پہن لیتے۔ تم تو پڑھی لکھی ہو۔ پہلے تسلی کر لو پھر ہننا۔“

”جی میں دیکھ لوں گی۔ ویسے میں نے پھر آپ کو پریشان کر دیا۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا آج کوئی پریشانی والی بات نہیں کروں گی۔“

”اچھا۔ تو کوئی خوش کرنے والی بات کرو۔“ میر نے شوخ لہجے میں کہا۔

”دھم۔“ ناز کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں کہو۔“

”صاحب ایک بات پوچھوں۔“ وہ ذرا سا جھجکی۔

”ہاں۔ پوچھو۔“

”وہ میری سہیلی ہے نایا سمین۔۔۔ وہ کہتی ہے کہ میر صاحب اس لیے تمہارا خیال رکھتے ہیں کیونکہ تم نے خط لکھ کر انہیں اپنے حالات کے بارے میں بتایا تھا۔“

”ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ اور۔۔۔“ میر نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ سنجیدہ رکھا۔

”اس کا مطلب تھا۔۔۔ مجھے آپ کو چھٹیوں میں اسکول کے باہر بلا کر وہ سب باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ وہ کہتی ہے تمہارے صاحب کو تم سے صرف ہمدردی ہے۔“

”وہ مجھے ”تمہارے صاحب“ کہتی ہے۔“ میر نے لہجے کو حتی الامکان سرسری رکھا۔

”وہ نا“ میں آپ کی باتیں اس کو بتاتے ہوئے کہتی ہوں، میرے صاحب کی یہ بات ہے، وہ بات ہے۔ اس لیے۔۔۔“ ناز نے بڑے تدبر سے سمجھایا تھا۔ اس بار میر سے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

”اچھا تو یا سمین کو لگتا ہے کہ اس روز تمہیں کھل کر اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔؟“

”جی۔۔۔ اس نے کہا آپ نے مجھے اسکول کے اندر نہیں جانے دیا کیونکہ آپ کے دل میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔“

”واہ۔۔۔ دوست بھی اپنے جیسی سمجھ دار پال رکھی ہیں۔“ میر ہنسا۔

”اچھا اور۔۔۔“



”وہ آپ شر کے ہیں نا۔ تو آپ کی وہاں اور بھی۔“ ناز بات پوری نہ کر سکی۔

”اچھا۔ یعنی میری شہر میں بھی فریڈز ہوں گی اور یہاں تم سے بھی چکر چلا رہا ہوں، وہ بھی ہمدردی والا ہوں۔“ میر نے تائید چاہی لیکن وہ چپ رہی۔

”ارے میرے سوئے، اس رات اسکول کے اندر اسی لیے تو نہیں بلایا تھا کیونکہ تم سے بہت پار کرتا ہوں۔ تمہارے پارے سے معصوم اظہار نے تو مجھے اور بھی جذباتی کر دیا تھا، تمہیں اندازہ ہی نہیں اس وقت کتنی مشکل سے تمہیں واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا، ناز تم ایک لڑکی ہو۔“ میر کہتے کہتے رک گیا۔ سمجھ نہیں آرہی تھی وضاحت کیسے کرے۔

”چوری چھپے ملنا یا اکیلے ملنا، یہ سب کسی صورت مناسب نہیں ہوتا۔ کیا اتنا کہنا کافی ہے۔“

”اچھا۔ چھا۔“ ناز نے کافی طویل اچھا کہی جیسے اب بات سمجھ میں آئی ہو۔

”بلکہ اگر صرف ہمدردی رکھتا شاید تب بھی اندر نہ بلاتا کیونکہ اس طرح ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ویسے کیا تمہیں بھی یہی لگتا ہے کہ میری شہر میں اور دوست ہوں گی؟“ میر نے ٹانگ بدلا۔

”دل تو نہیں مانتا، لیکن آج کل سارے لڑکے ایسا ہی کرتے ہیں۔“ ناز نے سادگی سے اپنی رائے بتائی۔

”واہ بھئی، بڑی سیانی ہو تم تو۔ لیکن میں تو صرف اپنے بارے میں پوچھ رہا ہوں، کیا میں بھی تمہیں باقی لڑکوں جیسا لگتا ہوں۔“

”نہیں صاحب۔ آپ میں تو ایک بات بھی آج کے لڑکوں جیسی نہیں ہے۔ لیکن میری اماں کہتی تھیں کسی مرد پہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“ ناز کی کنفیوزن میر کو بہت پیاری لگی لیکن زبردستی لہجہ سنجیدہ رکھا۔

”اچھا تو شکی مزاج بیوی بنو گی۔ پھر تو سوچنا پڑے گا۔“

”نہیں صاحب۔ اللہ کی قسم۔ میں شک نہیں کرتی۔“ ناز نے بوکھلا کر اس کی بات کافی تو میر زور سے

ہنساجس پر وہ خاصی شرمندہ ہو گئی۔

”اب میں بند کرتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“ ناز نے فوراً اجازت چاہی۔

”ارے بات تو سنو۔“ میر نے ہی گیا۔

”اچھا اگلے ہفتے سے میں پھر رہا ہونے کی روٹین بناؤں گا۔ تم روز نہیں تو کبھی کبھار موقع ملنے پر دیکھ لیا کرو۔ اگر ضروری بات ہوئی تو میں خط لکھ رکھوں گا۔“

”جی اچھا۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

آنے والے دنوں میں میر نے خود کو پڑھائی میں ذرا زیادہ مصروف کر لیا۔ فائنل ایئر کی نئی نئی اسٹڈی بھی سمجھنے میں ہی کافی ٹائم نکل گیا تھا۔ اس دوران دوبار ناز سے خط و کتابت ہوئی اس نے لکھا تھا کہ کچھ دنوں سے ایک لڑکا اسکول آتے جاتے اس کا پیچھا کرتا ہے۔ میر کو کافی تشویش ہوئی۔ اس لیے ایک دن چھٹی کے بعد گرلز اسکول کے راستے پر کافی آگے تک آیا جہاں سے ناز نے آنا تھا۔ اور واقعی ایک اٹھارہ بیس سال کے لڑکے کو اس نے نوٹس کیا جو میر کو دیکھتے ہی راستہ بدل گیا تھا۔ میر نے ناز سے کہا کہ وہ چاچا کو اس بارے میں بتادے اور ایک دو روز وہ اسے اسکول بھی چھوڑ آئیں تاکہ لڑکا باز آجائے لیکن اس سے پہلے کہ ناز بابا سے شکایت کرتی حشمت نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کیا کہ گاؤں کے لوگ ناز پر باتیں بنا رہے ہیں کیونکہ لڑکے اس کا پیچھا کرتے ہیں اور اس کی پڑھائی روک کر اسے گھر بٹھا دیا جائے۔ میر کو یہ ساری بات ناز نے خط لکھ کر بتائی تھی۔ میر کو سن کر کافی عجیب لگا کہ حشمت تو سارا دن دکان پر ہوتا ہے اور اسکول کا راستہ بھی کھیتوں سے ہو کر جاتا ہے جہاں گاؤں کے لوگوں کی کوئی خاص گزر گاہ نہیں تھی۔ پھر حشمت کو کس نے بتایا کہ لڑکے اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور بجائے اس لڑکے کو بے عزت کرنے کے وہ اپنی بہن پر انگلی اٹھا رہا تھا۔ لیکن پھر رحمان چاچا نے یہ کہہ کر کہ ناز کا اسکول میں آخری سال ہے حشمت کو چپ کر دیا۔ اور وہ خود ہی ناز کو لانے لے جانے لگے تو وہ لڑکا بھی کہیں رنچو چکر ہو گیا۔ البتہ میر نے پڑ کے نیچے بیٹھنا چھوڑ دیا کیونکہ ناز نے ہی

اسے آخری خط میں منع کر دیا کہ کہیں حشمت لالہ اس پر بھی کوئی بات نہ کر دیں۔ میر کو بھی بات مناسب لگی اس لیے اسکول کی لائبریری میں بیٹھنا شروع کر دیا لیکن ناز کا لکھا وہ خط واقعی آخری ہی ثابت ہوا کیونکہ بیچ میں کافی سارے دن گزر گئے تھے۔ میر کو عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ بہت دن سے اسے اسکول آتے جاتے دیکھا تھا نہ اس نے خط لکھ کر رابطہ کیا۔ اس روز بہت مجبور ہو کر پمپل کے نیچے آکر بیٹھا۔ چاچا نہایت خاموشی سے چائے اس کے قریب رکھ کر گئے۔ کچھ خشک پتے پیڑ سے جھڑ کر گرے تو اس نے اوپر سر اٹھایا پورے پندرہ دن ہو گئے تھے ناز کا کوئی اتہ پتا نہیں تھا۔ ساری فضا ہی جلنے کیوں بہت مغموم سی لگی۔

شاید خزاں کے خوف سے رویا ہے کوئی گل بھیگا ہوا ہے آج پھر آنچل بہار کا

اسے اچانک ہی شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ اتنے دن ناز سے غافل رہ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔

حشمت کا بڑا بیٹا دوبار سامنے سے گزرا، میر کا دل چاہا اس کو روک لے لیکن بے کار تھا۔ شام کے سائے ڈھلنے لگے تو وہ واپس آگیا۔ مغرب کی نماز کے بعد جب وہ اور سر مختیار مسجد سے واپس آ رہے تھے تو میر نے دیکھا کہ چاچا کی پوری فیملی چاچا سمیت کہیں جا رہی تھی۔ میر حسن نے نظروں ہی نظروں میں جاچ لیا تھا، ناز ان میں نہیں تھی بلکہ اس کے علاوہ سب ہی تھے۔ میر چاچا سے پوچھے بنانہ رہ سکا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ قریب گئے گاؤں شادی میں جا رہے ہیں اور صبح واپس آئیں گے۔ میر کافی حیران سا واپس آیا۔ کھانا بھی نہایت بے دلی سے کھایا اور دو سرے کمرے میں آگیا۔ ٹیچرز کے استعمال میں دو کمرے تھے لیکن یہ دو سرے کمرے صرف میر ہی استعمال کرتا تھا کیونکہ سریشیر اور سر مختیار بیوی دیکھتے دیکھتے اسی کمرے میں سو جاتے تھے اور میر کو دیر تک بڑھنا ہوتا تھا اس لیے وہ اس کمرے میں پڑھائی بھی کرتا اور سو بھی جاتا۔ آج اس

نے پڑھائی بھی نہیں کی دھیان سارا ٹائم کی طرف تھا۔ گیارہ بجنے والے تھے پاس کے کمرے سے نی وی کی آواز آنا کافی دیر سے بند ہو گئی تھی۔ میر نے برآمدے میں آکر دیکھا تو لائٹ آف ملی، یعنی دونوں صاحبان سو چکے تھے۔ اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور آہستگی سے گیٹ کھول کر باہر آگیا۔ چاچا کے دروازے پر بڑا سا تالا دیکھا تو مزید پریشان ہو گیا۔

”ناز کہاں ہے۔؟“ اس کی پیشانی پہ پسینہ چمک اٹھا۔ فوراً ایک خیال کے آتے ہی اس نے موبائل نکالا۔ یاسمین کا نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ اگرچہ اسے بالکل مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ بے وقت کال کر کے اس کے لیے کسی پریشانی کا باعث بنے لیکن اس وقت اور کوئی راہ بچھائی نہیں دے رہی تھی پھر بھی احتیاطاً اس نے صرف مس کال دے کر چھوڑ دیا۔ اور خود انتظار کے لیے وہیں ٹھہرنے لگا کوئی پانچ سات منٹ بعد یاسمین کی طرف سے کال آئی۔ میر نے اس سے ناز کے بارے میں پوچھا تو جواباً اس نے بتایا کہ دو ہفتوں سے ناز اسکول نہیں آ رہی۔ اور اس نے چاچا کے موبائل پر دو تین مرتبہ کال کر کے خود بھی ناز کا پتا کیا لیکن ایک بار بھی بات نہیں کر سکی کیونکہ کبھی چاچا گھر سے باہر ہوتے تو کبھی بتاتے کہ وہ سو رہی ہے۔ میر نے جب اسے بتایا کہ ابھی چاچا اپنے سب گھر والوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے اور ناز ساتھ نہیں تھی تو یاسمین نے فوراً کہا کہ یقیناً وہ اسے گھر کے اندر بند کر گئے ہوں گے کیونکہ پہلے بھی ایک بار ایسا ہو چکا ہے۔ میر نے مزید کوئی اور بات کہنے کا خیال نہ کیا۔ وقفے وقفے سے تین بار اس نے ایسا کیا لیکن کوئی رسپانس نہیں آیا۔ وہ گھوم کر گھر کی سائیڈ سے ہوتا ہوا پیچھے کی طرف آیا۔ سنسناتی ہوئی خشک ہوا۔ گہرا خوفناک اندھیرا۔ اور رگ و پے میں دوڑتا عجیب سا خوف۔ میر کا کلاہی طرح خشک ہو رہا تھا۔ لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے ایک ہی نقطے پر آکر سمٹ گئی تھی کہ ناز کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ یاسمین سے بات



کرنے سے پہلے تک اس کا یہی خیال تھا کہ وہ گھر والوں سے پہلے کسی وجہ سے شادی والے گھر چلی گئی ہوگی۔ لیکن یا سمین کا بھرپور اعتماد سے دیا جواب اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہمت کر کے میر نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانی پتھر کی چکی اور کچھ اینٹیں رکھی تھیں، میر نے سب کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر کافی اونچی جگہ بنائی، پھر اس پر پیر رکھ کر اونچا ہوا اور دیوار کو تھام لیا۔ اب وہ ایک ہی جست میں دیوار کے اوپر تھا۔ اندر کی زمین باہر کی نسبت کافی اونچی تھی اس لیے چھلانگ لگانا آسان تھا۔ میر نے اللہ کا نام لیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اندر کود گیا۔ چاند کی روشنی بس اتنی تھی کہ کمروں اور دیواروں کا نقشہ سجھائی دے رہا تھا۔ بالکل سامنے دو کمرے اور ان کے سامنے پر آمدہ تھا۔ ایک کمرے کی سائیڈ والی دیوار نظر آرہی تھی۔ میر کچھ قدم چل کر صحن کے درمیان تک آیا تو اس تیسرے کمرے کا دروازہ اب اس کے سامنے تھا۔ اس کمرے میں ہلکی روشنی تھی جیسے لائٹیں یا دیا جل رہا ہو۔ میر کمرے کے قریب آیا۔ لکڑی کے پرانے سے دروازے میں کئی روزن تھے اس نے آنکھ لگا کر اندر جھانکا لیکن کچھ واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ اس نے دوسری پھر تیسری۔ کئی جگہوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کوئی انسانی وجود دکھائی نہیں دیا۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے ہلکی سی کھانسنے کی آواز آئی۔ لیکن آواز سے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ میر نے اپنا کانپتا ہاتھ دروازے پر رکھا جسے کھولنے یا بجانے کے لیے حد درجہ ہمت کی ضرورت تھی۔ ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے میر نے دروازہ بجا دیا۔ پہلی بار میں کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے ذرا دیر بعد دوبارہ دروازہ بجا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی سی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“ آواز بلاشبہ نازکی تھی۔

”دروازہ کھولو نا۔ میں ہو میر۔“ میر کو دو سیکنڈ سے بھی کم انتظار کرنا پڑا اور دروازہ کھل گیا وہ حیران

حیران نظروں سے میر کو دیکھے جا رہی تھی۔ میر کا بھی یہی حال تھا۔ کالے کپڑوں میں ملبوس، گلے میں ہلکا پیلا دوپٹہ لٹکائے کھلے بالوں کے ساتھ اس کا سفید چہرہ ہلکی روشنی میں بھی نور میں نہایا لگ رہا تھا۔ میر نے پہلی بار اسے اس انداز میں دیکھا تھا۔ وہ بھی ایسے ماحول میں اتنے قریب، میر نے ناز کو شانوں سے تھا اور دیر تک بنا کچھ کہے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اور پھر بے ساختہ اپنے ساتھ لگایا، میر کی غیر متوقع آمد اور اپنائیت بھرا انداز پر ناز زار وقار رونے لگی۔ پتا نہیں کتنا بوجھ تھا اس کے دل پر۔ وہ باقاعدہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے میر کو پکڑ رکھا تھا۔ جیسے گشدرہ بچہ ماں کے ملنے پر اس سے لپٹ جاتا ہے، میر اس کے سر پر تسلی آمیز چھکی دیتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے لیے چارپائی کے قریب آیا اسے بٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھ کر نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”بس چپ ہو جاؤ نا۔ اور تسلی سے مجھے ہر بات بتاؤ۔“

”مجھے یہاں سے لے جائیں صاحب جی۔ میں مر جاؤں گی۔“ وہ پھر سے رونے لگی۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے۔ لے جانے ہی آیا ہوں۔ تم پہلے چپ تو ہو جاؤ۔“ میر نے آس پاس نظر دوڑا کر پانی تلاش کیا، چارپائی کے ساتھ ہی چھوٹی میز پر پانی اور کچھ کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔ میر نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف برہنایا۔

”چلو پانی پی لو۔“ میر نے گلاس اس کے منہ سے لگایا تو ناز نے دو گھونٹ پیے۔

”اب بتاؤ۔ یہ سب کیا ہے؟“ میر نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

”میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا یا ہو رہا ہے وہ میرے سکے بھائی اور اس کی بیوی نے کیا ہے۔ یہ دیکھیں۔ اس نے اپنے پیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پانچ تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور پہلی بار میر کی نظر اس لمبی لوہے کی زنجیر پر پڑی جو ناز کے پیر سے شروع ہو کر

دور ایک مضبوط کھونٹے سے بندھی ہوئی تھی۔“

”یہ کس لیے ہے؟“ میر نے حیرت سے ناز کی طرف دیکھا اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”میں شروع سے ساری بات بتاتی ہوں۔ وہ جو لڑکا میرا بچھا کر تا تھا نا۔ مجھے شک ہے وہ لالہ کا اپنا بھیجا ہوا تھا کیونکہ اس بات کو لالہ نے بہت بڑھا چڑھا کر بابا کو پیش کیا اور مجھے اسکول بھیجنا بند کروا دیا۔ بابا ان کی ہر بات مانتے ہیں اور ان کے غصے کی وجہ سے وہی کرتے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔ اس لیے مجھے گھر بٹھا دیا لیکن کچھ دن بعد میرے ساتھ عجیب بات ہوئی۔ ایک دن میں کچھ عجیب الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی۔ اصل میں صبح پہلے سر میں شدید درد ہوا۔ ایسے لگ رہا تھا کسی نے سر پر پتھر رکھ دیا ہو پھر بلا وجہ نیند سی آنے لگی لیکن بھابھی مجھے سونے نہیں دے رہی تھی اور جان بوجھ کر سب کے درمیان لا کر بٹھا دیا۔ مجھے چکر آرہے تھے۔ میں کبھی بیٹھے بیٹھے خواب دیکھنے لگتی کبھی جاگ جاتی اسی حالت میں شاید میں نے کچھ بے ربط باتیں کیں اس پر بھابھی نے شور مچا دیا کہ مجھ پر جن آگیا ہے۔ اور مجھ پر سایہ ہے لالہ اسی وقت کسی فقیر کو بلا لائے اس نے مجھے کمرے میں بند کر کے دھواں کر دیا۔ کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا۔ پشت پر جھاڑو وغیرہ مارے اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد پھر میرے ساتھ یہی سب کچھ ہوا تب مجھے سمجھ آگئی کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ دونوں بار ایسی طبیعت ہونے سے پہلے بھابھی نے مجھے بیٹھا کھلایا تھا۔ ضرور اس میں کچھ ملا ہوا تھا، ابھی تین چار دن پہلے وہی بابا جی دوبارہ آئے اس نے کہا کہ پیر نعمت شاہ اس کے خواب میں آئے اور کہہ رہے تھے کہ اگر میری امانت کو جلد از جلد مزار پر نہ پہنچایا گیا تو ان کا قبر ہمارے گھر پر نازل ہوگا، فصل تباہ ہو جائے گی، بیماری اور موت خدا نا خواستہ ہمارا گھر دیکھ لے گی۔ روپے پیسے کی تنگی ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ مجھے تو صاف سمجھ آگئی تھی کہ وہ لالے کا سکھایا سبق پڑھ رہا ہے۔“

”تو تم نے چاچا کو بتایا جو کچھ خشمیت اور اس کی بیوی نے کیا ہے؟“

”نہیں۔ کیونکہ یہ سب میرے اندازے ہیں اور کسی بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ بابا کو بتاتی تو وہ ضرور میرا یقین کر لیتے لیکن پھر غصے میں آکر لالہ اور بھابھی سے کچھ کہتے تو وہ بہت بڑا ہنگامہ کھڑا کرتے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔“

”ہاں۔ یقیناً“ چاچا یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم پر آسیب ہے ورنہ کم از کم وہ تمہیں اس طرح باندھ کر اکیلا نہ چھوڑ جاتے۔ لیکن خشمیت کو یہ جن وغیرہ کا ڈرامہ کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”اصل میں اماں اور بابا ہمیشہ سے یہی کہتے تھے کہ ہماری ناز بہت سمجھ دار اور ذہین ہے اور پڑھائی میں بھی اتنی لائق ہے کہ ایک دن اپنے اسکول میں استانی لگے گی۔ اب لالہ اور بھابھی کو یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ ایک بار میٹرک مکمل ہو گیا تو پھر یہ آگے بڑھنے کی ضد بھی کرے گی۔ بس یہی کچھ سوچ کر یہ دونوں مجھے پاگل ثابت کرنے پر تلے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دیہاتوں میں جنوں بھوتوں کی باتوں پر کتنا یقین کیا جاتا ہے۔ ایسی باتوں کو یہاں سب فوراً سچ مان لیتے ہیں۔ میں نے جب کہا کہ گلشن بوا کے شادی کر کے چلے جانے کے بعد تو پیر بابا نے ہم پر کوئی قہر نازل نہیں کیا تھا تو لالہ مجھ پر بہت چلائے کہ میں فوراً معافی مانگوں ورنہ اپنے کئے کی سزا پاؤں گی۔“

”ہوں۔“ میر نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

”یہ بتاؤ اب آگے کیا کریں۔ تمہیں اس حال میں کیسے چھوڑ جاؤں۔ کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم خود کو محفوظ سمجھو؟“

”میرے ایک ماموں ساتھ والے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ میری مدد کر سکتے ہیں لیکن بابا سے کیا کہیں گے؟“

”میں کوئی ایسا حال سوچ رہا ہوں جس سے خشمیت کی سازش بھی بے نقاب ہو جائے اور میرا نام بھی بچ میں نہ آئے، میں نہیں چاہتا کوئی تمہاری ذات پر انگلیاں اٹھائے کیونکہ اگر میرا نام درمیان میں آگیا تو



لوگ واقعہ کو الگ ہی رنگ دیں گے اور تم پر ہونے والا یہ ظلم کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ ویسے ایک حل تو میرے ذہن میں آگیا ہے لیکن معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

”وہ کیا جی۔۔۔؟“ ناز نے امید بھری نظروں سے میرا کوہ کیا۔

”میں اتنی تفصیل کا ابھی وقت نہیں ہے۔ بس بہتری کی امید رکھو، کل شام تک ان شاء اللہ تمہیں اس تکلیف سے ضرور نجات مل جائے گی بس تم اللہ پر بھروسہ رکھو اور دیکھو گھبرانا نہیں۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ تسلی تمہیں خیریت سے دیکھ کر ہوئی ہے۔ بس ڈرنا نہیں۔“ میرے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

”آپ آگئے۔ اب مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ دل سے ہر ڈر نکل گیا۔“ پہلی بار ناز مسکرائی۔

”یہ تمہارا یقین اور محبت تھی جس کی بدولت میں آج یہاں تمہارے پاس موجود ہوں“ اس یقین کو ہمیشہ قائم رکھنا شاید یہی میری طاقت ہے۔“ میرے پیار سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”چھاننا اب میں چلتا ہوں؟“ میرے ناز کی زنجیر توڑ کر اسے آزاد کیا۔ وہ دیوار تک اس کے ساتھ آئی۔ میرے آگے بڑھنے لگا تو ناز نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔ وہ قدرے پریشانی سے مڑا۔

”کیا بات ہے نانہ! اکیلے ڈر تو نہیں لگ رہا؟ میں پوری رات تمہارے ساتھ رک سکتا ہوں لیکن۔“

”نہیں صاحب۔ میں تو بس۔۔۔“ اس نے بمشکل پلکوں پر آئے آنسوؤں کو روکا۔

”میں بہت پاگل اور جذباتی ہوں صاحب“ اس نے سر جھکا کر کانٹے ہاتھوں سے آنکھیں رگڑیں تو میرا دوبارہ رک گیا۔ آگے بڑھ کر اس کی آنکھیں صاف کیں اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

کے پار اترتے ہوئے ایک نظر دوبارہ اسے دیکھا اور دوسری طرف چھ۔۔۔ لگادی۔ ناز وہیں دیوار کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

”میں بھی کتنی بد نصیب ہوں، کبھی اس کو کوئی خوشی نہیں دے سکتی۔ وہ بھی ہر بار میرے لیے ایک نئی آزمائش کا سامنا کرتا ہے۔ کب تک میرے اللہ۔۔۔ کب تک۔۔۔“ وہ دیر تک بنا آواز آنسو بہاتی رہی۔

مل کے اس شخص سے میں لاکھ خوشی سے چلوں بول اٹھتی ہے نظر پاؤں کی پائل کی طرح پاس جب تک وہ رہے درد تھا رہتا ہے پھیلتا جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح



میرے ناز کے منہ سے اس جعلی فقیر کا نام ایک ہی بار سنا تھا، بس اگلی شام ہی پوچھتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔ میرے لہجے میں اعتماد پیدا کر کے صاف صاف کہہ دیا کہ اس نے حشمت کا کام جتنے پیسوں میں کیا تھا اس سے دگنے لے کر وہ میرا ایک کام کر دے۔ اور وہ تو واقعی پیسہ پیر نکلا۔ میرا کون کر حیرت ہوئی کہ محض پانچ سو کے بدلے اس نے ناز کا مستقبل تاریک اور زندگی برباد کر دی تھی۔ میرے دو ہزار اس کے ہاتھ پہ رکھے اور کہا۔

”سید ہار حمان چاچا کے پاس جاؤ اور اپنے جھوٹے بیان کا اقرار کرو۔ انہیں بتا دینا کہ حشمت کے کہنے پر تم نے ان کی بچی کو پاگل بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”لیکن صاحب۔ حشمت تو مجھے جان سے مار ڈالے گا۔“ باباجی کی اپنی ہی اب گل ہو رہی تھی۔

”حشمت اگر کوئی دھمکی دے تو اسے کہنا اس بار بچ چچا پیر نعمت خواب میں آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جس جس نے اس ڈھونگ میں حصہ لیا ہے اگر انہوں نے اپنی غلطی نہ سدھاری تو سب پر اصل عذاب آئے گا۔ تم ہی تھے نا جس نے پانچ سو کی خاطر پیر بابا سے جھوٹا خواب منسوب کیا تھا۔ اب ایک اچھے مقصد

کی خاطر ایسا کرو۔ اور ہاں اس بار تو پیسے دے کر کام کروا رہا ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ کی تو پولیس کے ڈنڈے بڑا کر کام نکلاؤں گا۔ سمجھ گئے نا؟“ میرے گھور کر تنبیہ کی تو اس نے سر ہلا دیا۔

”بچلو بنا وقت ضائع کیے چاچا کے پاس جاؤ۔ بلکہ ایک کام کرو۔ یہ پیسے مجھے واپس کرو۔“ میرے باقاعدہ چہین کر رقم واپس لی۔

”تم جیسوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ جاؤ پہلے ٹھیک طرح سے چاچا کو ساری بات بتا کر آؤ۔ پھر پیسے لے جانا۔“ اس وقت تو یقیناً ”وہ دو ہزار کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار لگ رہا تھا لیکن اگر اس کے جانے کے بعد کہیں عتاب ہو جاتا تو میرا اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا اور پلان بھی قیل ہو جاتا اس لیے میرے عارضی طور پر رقم واپس لے لی تھی۔

وہ خود وہاں سے پیر نعمت شاہ کے مزار پر آیا۔ بہت دنوں سے وہ یہاں آنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ جس مزار کے بارے میں اتنا سنا تھا اسے دیکھنے کی خواہش خود بخود دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ میرے مزار پر فاتحہ خوانی کی کچھ دیر اس پاس گھوم کر دیکھا۔ برگد کے نیچے کالی دیر سکون سے بیٹھنے کا موقع بھی ملا۔ کچی مٹی سے بنے اس چھوٹے اور سادہ سے مزار میں جانے ایسا کیا تھا، میرا بہت دیر تک واپس جانے کو دل نہیں چاہا۔ اس مزار کی اپنی کشش اتنی زیادہ تھی کہ یہاں خدمت کرنے والوں سے اگر اس کو چھین لیا جاتا تو وہ محض اس کی محبت میں برسوں کی جنگ لڑ سکتے تھے لیکن حشمت جیسے لوگ ان جیسے اللہ والوں کو بھی اپنی غرض کے لیے استعمال کرنے سے باز نہیں آتے تھے انسان کم از کم ان دنیا سے بے نیاز لوگوں کو تو اپنے مغلو کے لیے استعمال کرنا چھوڑ دے لیکن بے حس لوگوں کے لیے نرم دل لوگ برسوں سے اپنا خون جلاتے آئے ہیں پر حاصل وصول شاید کچھ بھی نہیں۔ دوسری طرف حشمت تھا جو اپنی جیتی جاگتی بہن کو اپنے مغلو کی جینٹل چڑھا رہا تھا اس کے لیے زمین میں دفن ایک بے ضرر وجود کی وقعت ہی کیا تھی۔ وہ اسکول واپس آیا تو مغرب

”پھر تو خوشی کی بات ہے چاچا کہ اصل بات سامنے آگئی۔“

”ہاں صاحب“ اس بات پر تو خوش ہوں لیکن حشمت کا کیا کروں۔ کہتا ہے کچھ بھی ہو جائے ناز کو مزار پر بھیجے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ بہت ڈھیٹ ہے میرا صاحب۔ آپ ہی بتائیں بچی کو لے کر کہاں جاؤں کل کو میں مر مر آگیا تو یہ خبیث مکان کی خاطر اسے جان سے بھی ہار سکتا ہے۔“

”چاچا آپ بیٹی کو کہیں اور نہیں بھیج سکتے۔ میرا مطلب ہے کسی عزیز رشتہ دار کے ہاں۔“

”ہاں صاحب۔“ چاچا جیسے کچھ سوچنے لگے۔

”میرا سلا ساتھ ولے گاؤں میں رہتا ہے۔ بے چارہ ہے تو غریب آدمی اور بچے بھی بہت سارے ہیں لیکن اپنی ناز سے بہت پیار کر رہا ہے۔ مائے اور مائی کے پاس خوش بھی رہے گی۔“ چاچا گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

کی اذان ہونے لگی۔ ناز کے ساتھ پیچھے کیا کچھ پیش آیا وہ تو اگلے روز ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ لیکن ناز کے کچھ بتانے سے پہلے ہی چاچا سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ پیڑ کے نیچے کچھ پریشان سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میرے خود ہی پوچھ لیا۔

”خیریت چاچا۔ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“

”بس صاحب۔ اپنے نصیب کو رو رہا ہوں۔“

”کیا بات ہے چاچا۔ بتائیں شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔“ میرا کو بے چینی ہونے لگی کہ بتا نہیں ایسا کیا ہو گیا۔

”اپنے بیٹے کے ہاتھوں پریشان ہوں صاحب۔ پتا نہیں اس کے سر سے مکان کا بھوت کب نکلے گا۔ خواخواہ میری معصوم بچی کے پیچھے بڑا ہوا ہے اس غریب کو پاگل بنانے کے لیے ایک جعلی پیر بلا لایا تھا۔ میں بھی اتنے دن یہی سمجھتا رہا کہ ناز پر کوئی سایہ ہو گیا ہے لیکن ابھی شام کو وہ ڈھونگ پیر خود روتا چلاتا واپس آگیا۔ حشمت نے اسے پیسے دیے تھے کہ سب سے کم ناز پر جن کا سایہ ہے۔“

”پھر تو خوشی کی بات ہے چاچا کہ اصل بات سامنے آگئی۔“

”ہاں صاحب“ اس بات پر تو خوش ہوں لیکن حشمت کا کیا کروں۔ کہتا ہے کچھ بھی ہو جائے ناز کو مزار پر بھیجے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ بہت ڈھیٹ ہے میرا صاحب۔ آپ ہی بتائیں بچی کو لے کر کہاں جاؤں کل کو میں مر مر آگیا تو یہ خبیث مکان کی خاطر اسے جان سے بھی ہار سکتا ہے۔“

”چاچا آپ بیٹی کو کہیں اور نہیں بھیج سکتے۔ میرا مطلب ہے کسی عزیز رشتہ دار کے ہاں۔“

”ہاں صاحب۔“ چاچا جیسے کچھ سوچنے لگے۔

”میرا سلا ساتھ ولے گاؤں میں رہتا ہے۔ بے چارہ ہے تو غریب آدمی اور بچے بھی بہت سارے ہیں لیکن اپنی ناز سے بہت پیار کر رہا ہے۔ مائے اور مائی کے پاس خوش بھی رہے گی۔“ چاچا گہری سوچ میں ڈوب گئے۔



”تو بس چاہا۔ سوچیں مت اور اللہ کا نام لے کر اسے وہاں چھوڑ آئیں۔ اگر حشمت ایسے ہی اٹھے سیدھے پیروں والے ہتھکنڈے اپنا تار ہا تو یقیناً ”نازکی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”ہاں صاحب، وہ تو اس بے چاری کو بڑھنے بھی نہیں دیتا۔ وہاں اپنے امتحان کی تیاری تو کر سکے گی۔“ چاچا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو میرے گہرا سکون کا سانس لیا۔ بھلے وہ اس سے دور جا رہی تھی لیکن معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ بہت ضروری تھا۔ ناز نے جانے سے پہلے ایک آخری خط لکھا تھا۔

السلام علیکم صاحب  
”کل وہ جھوٹا پر شاید آپ کے بھیجے پر آیا تھا۔ آپ نے تو بہت بڑی مشکل منٹوں میں حل کر دی۔ آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے بابا کو مشورہ دیا کہ ناز کو ماموں کے گھر بھیجا جائے۔ کل میں وہاں جا رہی ہوں۔ آپ بہت اچھے ہیں، ہمیشہ اپنے سے زیادہ میرے بھلے کا سوچتے ہیں۔ لیکن میرا دل بہت اداس ہے۔ پتا نہیں آپ کے بغیر وہاں دن کیسے گزر رہے گے۔ یہاں ہونی تھی تو آپ کے بغیر صرف ہفتہ اور اتوار کا دن گزارنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ صاحب میں بہت خوش قسمت ہوں جو آپ میری زندگی میں آئے۔ اماں کے بعد اگر میرا کسی نے بہت خیال رکھا تو وہ آپ ہیں۔ میرا دل کرتا ہے کبھی ہم ساتھ بیٹھ کر بہت ساری باتیں کریں۔ آپ جب بولتے ہیں تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ کاش میری زندگی میں ایک دن ایسا ضرور آئے جب میں اور آپ بہت ساری باتیں کریں۔ آپ اپنا بہت خیال رکھنا۔ میں آپ کے لیے بہت دعا کروں گی۔ اللہ آپ کی سب مرادیں پوری کرے۔ آمین۔“

\*\*\*

فضا میں سردی کی شدت کافی بڑھ گئی تھی۔ ناز کو دیکھے اسے ملے بہت سارے دن بیت گئے تھے۔ وہ اس دوران تین بار گھر آیا تھا۔ ان دنوں ناز کی شدت

سے محسوس ہو رہی تھی جب سے گئی تھی ایک بار بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں اس کا وقت بھی کیسے کٹ رہا ہو گا۔ وہ نہایت بے دلی سے کتاب ہاتھ میں لیے پیپل کے نیچے آ بیٹھا۔ چاچا کے گھر کے بند دروازے پر نظر پڑی تو ناز کا مسکراتا چہرہ تصور میں در آیا۔ میرے لب مسکرا اٹھے۔

وہ دیر تک دروازے کو دیکھتا رہا جہاں سے کبھی کبھار وہ اپنا خوبصورت چہرہ سامنے لا کر میرے محبت بھری نظروں سے دیکھتی تھی۔ میرے اس کی چمکتی براؤن آنکھیں، پتلی سی ناک میں پڑا چھوٹا سا گہرا سبز لونگ اور بھرے بھرے گہرے کناروں والے ہونٹ اور پتلا سا کتابی چہرہ بہت شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہ بہت کھلے ہوئے رنگ کی تھی لیکن بجائے گلابی سفید کے عجب سنہرا رنگ تھا جیسے انگریزی تاریخی فلموں کی شہزادیاں۔ لیکن ناز میں ایک خالص دیہاتی رنگ تھا جو اس کی اصل خوبصورتی تھا۔

اس بار وہ گھر آیا تو نیا چیلنج اس کا منتظر تھا۔ ابو نے اس سے توبہ کے بارے میں صاف صاف بات کی، امی بھی اپنی بیٹی کی تعریفوں کے لقمے دینے کے لیے ساتھ موجود تھیں۔ سائرہ اور شہریار کے رشتے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا شاید جان بوجھ کر اس سے بات چھپائی جا رہی تھی لیکن میرے خود ہی یہ ٹاپک چھیڑ دیا۔

”میرا خیال ہے پہلے سائرہ کی شادی ہونی چاہیے۔ میرے بارے میں آپ لوگ بعد میں سوچیں۔“

”تم بڑے ہو بیٹا، پہلے تمہاری شادی ہو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی سائرہ ابھی پڑھ رہی ہے۔“ امی نے بھرپور لگاؤ کا مظاہرہ کیا تو ابو نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔

”لیکن میں نے تو سنا ہے کہ سائرہ اور شہریار کی شادی کی بات بھی چل رہی ہے؟“ میرے صاف بات کرنا مناسب سمجھا۔

”اس سب پر تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس اپنے معاملے پر سوچو اور جلد جواب دو۔“ اباجی نے قدرے سخت لہجہ اپنایا۔

”میرا خیال ہے آپ لوگ فی الحال میری فکر چھوڑیں اور اپنے بھائی سے کہیں کہ رشتوں میں شرطیں نہیں رکھی جاتیں۔ اگر انہیں اپنی بھانجی سے سچی محبت ہے تو اسے اپنی بیٹی کے رشتے سے مشروط نہ کریں۔“ وہ مزید وہاں رکھا نہیں اور باہر چلا گیا۔ شام کو پھپھو سے ملنے چلا گیا اور انہیں بھی پوری بات تفصیل سے بتادی۔ انہوں نے تسلی دی تو میرے کچھ اچھا محسوس ہوا لیکن اس سب کے باوجود گھر والوں کے مطالبے سے فرار کی کوئی راہ اسے بھائی نہیں دے رہی تھی۔ اگر عام حالات میں بھی ناز سے شادی کی بات گھر میں کرتا تو خوب فساد برپا ہوتا تھا اور اب تو معاملہ سائرہ کا آگیا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ امی شہریار سے کسی بھی قیمت پر سائرہ کو بپاہنا چاہتی تھیں اور ان کا بھائی اپنی شرط سے ایک انچ پیچھے ہونے کو تیار نہیں تھا۔ سیدھے لفظوں میں توبہ سے انکار کا مطلب ہمیشہ کے لیے گھر نکالا تھا۔

اسکول میں سردیوں کی آٹھ دس روز کی چھٹیاں ہوئی تھیں وہ گھر آیا تو اباجی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ دو تین دن کے لیے لاہور گئے ہیں۔ وہ شام کو دوستوں کی طرف نکل گیا۔ دل اگرچہ اداس تھا لیکن کسی طور وقت تو کٹتا ہی تھا۔ رات کوئی وی دیکھ رہا تھا جب موبائل پر ایک ساتھ تین چار مسیج موصول ہوئے۔

”اومس۔“ میرے سخت کوفت سے موبائل دور پھینکا۔

”کیا مصیبت ہے۔ پتا نہیں کون بے ہودہ لڑکی تھی بچھے کافی دنوں سے یہی چل رہا تھا۔ پہلے ایک لڑکی نے لیٹ ٹائٹ فون کر کے کہا کہ ”میں گھر میں اکیلی ہوں“ گھبرا رہی ہوں اس لیے پلیز کچھ دیر مجھ سے بات کر لیں۔“ میرا ایسے ڈرامے اچھی طرح جانتا تھا اس لیے فوراً ”کہہ دیا کہ اپنی کسی سہیلی یا کزن وغیرہ سے بات کر لیں میں فارغ نہیں ہوں۔ اسے پتا تھا کہ انکسور کرنے سے ایسے معاملات سے جان چھوٹ جاتی ہے لیکن پتا نہیں اس لڑکی کو کیا باوجود میرے روکھے لہجے کے وہ مسلسل پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ کبھی

غزلیں تو کبھی شعر پتا نہیں کیا کیا بھیجتی رہتی تھی۔ میرے پورا مسیج پڑھنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے بتی، بھائی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا جب اس لڑکی کا فون آگیا۔ بیل لگا تا رہی تھی۔ لیکن میرے نمبر پہچان کر کال انینڈ نہیں کی۔ تین بار جب اس نے ریسو نہیں کیا تو اس کا مسیج آگیا۔ میرے اوپن کیا تو لکھا تھا۔

”میں اس وقت پوسٹ آفس کے پاس اکیلی کھڑی ہوں، کوئی رکشا، ٹیکسی نہیں مل رہی۔ پلیز آپ آجائیں۔“

”اف۔۔۔“ میرے دل چاہا اپنے بال نوچ ڈالے اس نے غصے سے کال ملائی۔

”دیکھو لڑکی، تم جو کوئی بھی ہو۔ میری بلا سے جہنم میں جاؤ میں کہیں نہیں آ رہا۔ دوبارہ مسیج مت کرنا پلیز۔“ اس نے غصے سے موبائل بھی وہیں چھوڑ دیا اور باہر نکل گیا۔

چھٹیوں کے تین دن گزر گئے تھے۔ گھر میں سوائے آرام کرنے کے اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ یا پھر وہ کھسکی ہوئی لڑکی جس کے موبائل پیغامات ایک تو اتر سے جاری تھے۔ اگلے روز اباجی آگئے اور توبہ کا موضوع جو کافی دن سے زیر بحث نہیں آیا تھا پھر سے چھڑ گیا۔ دوپہر کو اباجی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ میرے کو حیرت ہوئی کہ امی کے ساتھ ساتھ وہاں سائرہ اور نیلم بھی تھیں۔ جیسے اسی کا انتظار ہو رہا ہو۔

”جی اباجی۔۔۔“ وہ پلنگ کے کنارے پر ٹک گیا اور انہوں نے دوبارہ وہی قصہ شروع کر دیا۔

”دیکھو بیٹا یہ ٹھیک ہے کہ ان کے ماموں نے شہریار کے لیے سائرہ کا رشتہ مانگا ہے لیکن تمہاری توبہ سے شادی کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم توبہ سوچتے ہیں کہ اچھا ہو گا، بہن، بھائی کا ایک ہی گھر میں رشتہ ہو جائے۔ لڑکی بھی بہت اچھی ہے۔“

”اباجی اگر سائرہ کا رشتہ میرے وہاں شادی کرنے سے مشروط نہیں ہے تو آپ کو مجھے مجبور نہیں کرنا



”کیون اگر تمہاری ٹوسیہ کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہے تو تمہیں شادی سے کیوں انکار ہے؟“

”جی۔۔۔؟“ میر نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

”کس نے کہا میری ٹوسیہ سے کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہے؟“

”ارے بیٹا۔۔۔ ہمیں ٹوسیہ نے سب بتا دیا ہے اب ہم سے کیا چھپانا۔“ امی ہنسنے لگیں۔

”شیراؤ مت میرا کو بتا دو۔“ اور میر حیران حیران سا ان کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ امی کیا کہہ رہی تھیں اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ٹوسیہ ایسا کیوں کہنے لگی؟

”میں نے تو کبھی اس سے بات نہیں کی۔ کبھی یہاں آپ لوگوں سے ملنے آ جاتی ہے تو بس سلام کر لیتا ہوں اس سے زیادہ تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”جھوٹ مت بولو میر۔“ امی نے لہجہ سخت کیا۔

”وہ کہتی ہے کہ میر اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ہمارے بیچ فون پر لمبی لمبی باتیں ہوتی ہیں۔ مسیح ہوتے ہیں۔“

”مسیح۔۔۔“ میر کے پہلی بار کان کھڑے ہوئے۔

”اس کا نمبر کیا ہے؟“ میر نے سارے طرف دیکھا۔

”ارے واہ ہم سے پوچھ رہے ہو۔ اپنا موبائل چیک کرو اسی کے پیغامات سے بھرا پڑا ہے۔“ سارے نے منہ بنایا اور باہر چلی گئی۔

”دکھاؤ۔۔۔“ اباجی نے ہاتھ بڑھا کر موبائل مانگا تو میر نے بنا کچھ کہے موبائل ان کو دے دیا۔ اس کا دماغ اس وقت گھن چکر بنا ہوا تھا۔ لیکن اتنی تسلی ضرور تھی کہ اس کا دامن صاف تھا۔ البتہ اس بات پر اسے ضرور پچھتاوا ہوا کہ اسے وہ پیغامات اپنے موبائل سے مٹا دینے چاہیے تھے۔ اباجی ابھی کچھ دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک اور مسیح ریسو ہوا۔ اسے اباجی نے خود ہی کھولا اور بڑھ کر میر کی طرف بڑھا دیا۔

”اب بھی کہو گے کوئی تعلق نہیں؟“

”میں پارک میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ

کب آئیں گے۔“

”دیکھیں اباجی۔۔۔ یہ لڑکی بہت دن سے مجھے پریشان کر رہی ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ کون ہے اور نہ مجھے جاننے میں کوئی دلچسپی تھی۔“ اب لوگ ہی بتا رہے ہیں کہ یہ ٹوسیہ ہے۔ میں نے اسے کبھی بڑھاوا نہیں دیا، کبھی کسی مسیح کا جواب نہیں دیا۔ آپ خود چیک کر لیں۔“ میر نے موبائل دوبارہ ان کی طرف بڑھایا۔

”اب تم اتنے بھی بھولے نہیں کہ اپنے جوابات بھی محفوظ رکھو گے؟“ امی نے لقمہ دے کر اباجی کو خود ہی جواز فراہم کر دیا۔ میر بنا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب مزید انکار کی تمہارے پاس کوئی گنجائش نہیں نکلتی میر۔ اگر تم ایک معصوم لڑکی کے ساتھ محض وقت گزاری کر لو میں جلد ہی انہیں نکاح یا شادی کی تاریخ دینے والا ہوں۔“ اباجی نے اپنا فیصلہ سنا کر گویا اسے چلے جانے کی اجازت دی اور وہ بھی بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں آ گیا۔ برآمدے میں سارے فون پر بڑی نظر آئی تھی اور میر کو دیکھ کر خاموش بھی ہو گئی جس سے میر کو شک ہی نہیں بلکہ یقین ہو گیا کہ آخری مسیح کے آنے میں اسی کا ہاتھ تھا۔

میر سمجھ گیا کہ اس کے خلاف یہ سازش کیوں بنائی گئی تھی۔ یقیناً ”ان سب کا یہی خیال تھا کہ میر موبائل پر بننے والے تعلق کے چکر میں آسانی سے پھنس جائے گا جیسا کہ عموماً ایسے معاملات میں ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں یقیناً ”میر ایک دن خود ان سے کہتا کہ وہ ٹوسیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میر کی قسمت اچھی تھی کہ ایسا ہو نہیں سکا اور نہ وہ آگے مزید اس سازش کا شکار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اباجی اس کی بات پر یقین نہیں تھا۔“

”او۔۔۔“ میر نے اپنا سر ہاتھوں پہ گرایا اور ڈھیلا سا چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”پتا نہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔ سب کچھ خلاف توقع پیش آ رہا تھا۔ جیسے ستارے اچانک گردش میں آجائیں۔“ موبائل کی گھنٹی بجی تو میر نے نہایت بے

دلی سے فون اٹینڈ کیا لیکن آگے کوئی اور نہیں بلکہ ناز اس سے مخاطب تھی۔

”ناز۔۔۔“ میر نے جیسے اندر تک سکون اترتا محسوس کیا، پہلی بار ایک احساس جاگا کہ ابھی وہ اتنا اکیلا بھی نہیں ہے کہ جینے کی امنگ ہی چھوڑ دے ”کیسی ہو نا۔۔۔؟“

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔ لیکن آپ۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رکی تو میر ہنسا۔

”اچھا تو اب تم میرا لہجہ بھی پہچاننے لگی ہو۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ تم بتا بتائے میرے دل کی بات سمجھ لو۔“

”میں تو ہمیشہ ہی آپ کے دل کی بات سمجھ جاتی ہوں لیکن کبھی بتائی نہیں۔“ وہ بھی شرارت سے ہنسی

”جیسے کب۔۔۔؟“ میر کے دل سے جیسے کوئی دھند چھٹنے لگی تھی لہجہ خود بخود شوخ ہو گیا۔

”جیسے۔۔۔“ وہ سوچنے کے لیے رکی۔

”جیسے پہلی بار جب آپ نے میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھا ہوا تھا اور پھر نروس ہونے کے لیے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور جب رجب کی شادی سے واپس آ رہے تھے تو سارا راستہ بنا کچھ کہے آپ نے مجھ سے جتنی باتیں کیں وہ سب مجھے سمجھ آ رہی تھیں۔ اور چھٹیوں میں جب میرے بلانے پر گاؤں آئے تھے اور پھر جان بوجھ کر رات کو یہیں رک گئے تھے۔“ اس نے ”جان بوجھ“ پر خصوصی زور دیا تو میر کا تقہ بلند ہوا۔

”بس بس۔۔۔ تم تو واقعی بہت کچھ جانتی ہو۔ اب اور نہ شرمندہ کرو اور یہ بتاؤ اتنے عرصے بعد کہاں سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔“

”یہ ماموں کا موبائل ہے۔ ابھی بابا کا فون آیا تھا۔ ان سے بات کرتے کرتے دور نکل آئی اور سوچا آپ سے بات کر لوں۔ ابھی تو ماموں بھی باہر چلے گئے ہیں۔“

”اچھا تم بند کرو۔ میں کل کرتا ہوں۔“ میر نے خود

ہی کل کلٹ کر دوبارہ نمبر ملایا۔

”ہاں جی تو اور سناؤ بابا سے کیا باتیں ہوئیں؟“

”وہ جی۔۔۔ اصل میں بابا ہسپتال میں ہیں۔ آپ کے شہر میں؟“

”خیریت کیا ہوا چاچا کو؟“

”بابا کو کالا برقن ہو گیا تھا۔ لالے سے کہتے رہے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ لیکن وہ گاؤں کے حکیم سے دوائی لاتے رہے۔ مجھے پتا چلا تو میں نے ماموں کو بھیجا۔ وہی پرسوں بابا کو داخل کروا آئے تھے۔ پرسوں شہر آنے پر ہی بیماری کا پتا چلا۔“

”اوہ یہ تو بہت بری خبر ہے۔ تم بھی اب بتا رہی ہو۔ سرکاری ہسپتال میں ہیں کیا؟“

”جی ہاں۔۔۔“

”اچھا میں ابھی ان کے پاس جاتا ہوں اور آگے کے لیے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں ان کی پوری دیکھ بھال کروں گا۔“ میر نے فون بند کیا اور اسی وقت ہسپتال کے لیے نکل گیا۔ چاچا کا بیڈ جنرل وارڈ میں لگا تھا۔ کالی کمزور اور اداس لگ رہے تھے۔ میر کو دیکھ کر البتہ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی میر نے اپنے وہاں آنے کا یہ جواز بتایا کہ وہ کسی دوست سے ملنے آیا تھا اور اتفاقاً ”انہیں دیکھ لیا۔ کیونکہ ناز کے فون کا وہ چاچا کو نہیں بتا سکتا تھا۔ جنرل وارڈ کا ماحول تو ہرگز صحت بخش نہیں تھا۔ میر نے فوری طور پر ان کے لیے اسپیشل وارڈ کا بندوبست کیا۔“

”کیوں تکلیف اٹھاتے ہو بیٹا میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“

”اگر جلد از جلد ٹھیک ہو کر گھر جانا چاہتے ہیں تو چپ چاپ میری بات ماننا ہوگی۔ آپ بس زیادہ نہ سوچیں۔“ میر نے ان کی ایک نہیں سنی اور اسی شاہدہ اسپیشل وارڈ میں شفٹ ہو گئے۔

میر اگلے صبح ان کے لیے کچھ ضروری سامان اور پھل وغیرہ لے کر آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

”طبیعت کیسی ہے چاچا۔ رات تو ٹھیک گزری۔“



”ہاں صاحب۔۔۔ یہاں تو اتنا سکون ہے۔ مجھے لگ رہا ہے آدھی بیمار رخصت ہو گئی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے صاحب۔“ چاچا جذباتی ہونے لگے تھے۔ میرے ان کے ہاتھ یہ اپنا ہاتھ رکھا۔

”کیسی غیروں والی باتیں کرتے ہیں چاچا۔۔۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں بس دعا دیا کریں۔“

”آج کل تو اپنے بھی اتنا خیال نہیں رکھتے صاحب۔“

”تو آپ سمجھ لیں کہ میری بھی کوئی غرض ہوگی۔“

میرے ہنس کر کہا تو چاچا بھی مسکرائے لگے۔

”نہیں صاحب ایسا میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔“

اسکول کھلنے میں دو روز باقی تھے۔ میرا اس شام چاچا سے ملنے آیا تو وہ کافی خاموش اور بچھے بچھے سے لگے۔

”کیا بات ہے چاچا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”لگتا تو ہے کہ بہتر ہو رہی ہے۔“

”آپ شاید یہاں الگ کمرے میں بوری ہو جاتے ہیں۔ وہاں جنرل وارڈ میں کافی رونق لگی رہتی تھی۔“

”نہیں صاحب۔۔۔ وہاں تو سونے کے لیے بھی ترس جاتا تھا۔ آپ نے اتنی مہربانی کی۔ جانے کتنا خرچہ اٹھ گیا ہو گا۔ بس دن رات یہی دعا کرتا ہوں کہ جلدی یہاں سے فارغ ہو جاؤں۔“

”ہاں صحت کی دعا ضرور مانگا کریں، لیکن اس لیے نہیں کہ میرا خرچہ ہو رہا ہے۔ اچھا حشمت یا کوئی اور ملنے والا بھی آیا تھا۔“ میرے موضوع بدلا لیکن چاچا نے نہایت افسردگی سے آہ بھری۔

”نہیں صاحب۔ وہ کیوں پوچھنے آئے گا اس کے خیال میں تو اب میری عمر ہی بستر پر پڑنے کی ہے۔ ہسپتال آنے کو وہ میرے چونچلے سمجھ رہا تھا۔ وہ تو ناز نے خادم حسین کو بھیجا صاحب سوچتا ہوں ایک طرف۔ حشمت کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ آج نہیں تو کل۔۔۔ جانے کا وقت تو اب قریب ہے۔ لیکن اپنی فکر کسے ہے۔ مجھے تو اپنی بیٹی کا خیال آتا ہے۔ میرے بعد تو ایک دن بھی حشمت اسے خادم حسین کے گھر رہنے نہیں دے گا۔ خادم بتا رہا تھا بار بار فون کر کے دھمکیاں

دیتا ہے کہ کسی بھی وقت آکر اپنی بہن کو واپس لے جائے گا یا مزار پر بٹھائے گا یا جان سے مار دے گا۔“

”چاچا آپ کے ذہن پر زیادہ زور دینا اچھا نہیں ہے۔“ میرے اپنی تشویش دبا کر انہیں تسلی دی۔

”سوچوں سے نجات نہیں مل سکتی صاحب۔۔۔ بس یہی فیصلہ کیے بیٹھا ہوں کہ آج خادم حسین آئے۔ اس کے ذمے ناز کی شادی کا کام لگاؤں۔ وہ اپنے گاؤں میں کوئی اچھا شریف لڑکا دیکھ کر اس کو بیاہ دے تو میرے سکون سے مر سکوں گا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی حشمت چھین سے نہیں بیٹھ سکتا۔“ چاچا جیسے اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہے تھے اور میرے سونے انداز میں لب چبا رہا تھا بات تو چاچا کی بلا شک و شبہ درست تھی۔ ناز جن حالات کا شکار تھی ان میں شادی ہی سب سے مناسب حل تھا۔ اس کی کہیں شادی جاتی تو حشمت اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

”کب آتا ہے خادم حسین نے۔۔۔“ میرے سوچوں سے باہر آیا۔

”شہر تو پہنچ چکا ہے۔ ٹرک چلاتا ہے۔ یہاں۔۔۔ سامان دو سری جگہوں پر لے جاتا ہے ابھی سامان لو کروا رہا ہو گا۔ پھر فارغ ہو کر مجھ سے ملنے آئے گا۔“

”چاچا اگر۔۔۔“ میرے بڑی مشکل سے ہمت بجن کر کے کہنا شروع کیا۔

”اگر۔۔۔ آپ مجھے کسی قابل سمجھتے ہیں تو میں نا سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میر صاحب۔ کیوں اتنی بڑی بات کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہماری ہمدردی کے چکر میں اپنی زندگی تباہ نہ کریں۔ پہلے تو آپ کے اتنے احسانات ہیں۔“

”حسن کی بات نہ کریں چاچا۔۔۔ اور نہ ہی زندگی تباہ ہوگی کیونکہ جتنا تباہ حال اب ہوں تو شاید اس اقدام سے تھوڑی زندگی سنور جائے مجھے تو خود سہا چاہیے۔ چاہے تو اسے میری خود غرضی سمجھ لیں لیکن میں اس وقت واقعی بہت اکیلا ہوں۔“

”یہ تو آپ کا بڑا پین ہے صاحب جو آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ باقی میری کیا مجال جو آپ کے لیے انکار کروں مجھے سوائے ناز کے کسی سے مشورہ کرنا ہے اور نہ پوچھنے کی ضرورت ہے۔“

”نہیں اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر آیا ہوں اس لیے پہلے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کوئی شادی میں شریک نہیں ہو گا آگے آپ کی مرضی آپ کا فیصلہ آخری ہو گا۔“

صاحب جس طرح میں ناز کے سگے بھائی کو شادی میں نہیں بلا سکتا، آپ بھی اپنی مجبور یوں کو بہتر سمجھتے ہیں، اللہ کی یہی رضا ہے تو بسم اللہ کریں۔۔۔“ چاچا نے اتنا ہی کہا تھا کہ خادم حسین اندر داخل ہوا۔ میرے مصافحہ کر کے اس نے چاچا کی طبیعت پوچھی۔ میرے دونوں سے تھوڑی دیر کی اجازت مانگی اور کمرے سے چلا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ چاچا آرام سے خادم حسین سے مشورہ کر لیں۔ جب وہ واپس آیا تو چاچا خادم حسین سے بات کر چکے تھے۔ وہ انہیں مشورہ دے رہا تھا کہ حشمت تک کسی صورت بات نہیں پہنچنی چاہیے اور جو بھی کرنا ہے جلد کیا جائے۔

”اُمیں صاحب، آپ کا کیا کہنا ہے۔“ چاچا نے اپنے قریب میرے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

”جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے لیکن کب اور کہاں کا فیصلہ آپ لوگ بہتر کر سکتے ہیں۔“

”مجھے تو صبح سات بجے سامان لے کر نکلنا ہو گا۔ آپ یہاں آجائیں تو لالے سے مل کر نکل جائیں گے۔“ خادم ماموں نے چاچا کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں صبح چھ سے سات کے درمیان یہاں پہنچ جاؤں گا۔“

حالات کی پیچیدگی کبھی محبت کی الجھی گریہوں کو ایسے بھی سلجھاتی ہے۔ اس نے آج صبح سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جن حالات کو وہ ستاروں کی گردش سمجھ رہا تھا ان حالات نے تو نصیب ہی جگا دیے تھے میرے فیصلہ کر لینے کے بعد اس دل میں جہاں ایک طرف اطمینان محسوس کیا تھا وہیں زندگی

کے اتنے بڑی فیصلے پر اباجی کی لاعلمی پر عجیب سا بوجھ بھی محسوس کیا لیکن جس قسم کے حالات سے وہ دوچار تھا اباجی کو بتانا ممکن نہیں تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے میرے نے پھپھو کا نمبر بلایا اور انہیں ساری سچویشن بتائی فوری طور پر وہ بھی بالکل خاموش ہو گئیں، لیکن پھر نا صرف اجازت دے دی بلکہ ڈھیر ساری دعاؤں سے بھی نوازا میرے کسی حد تک سکون محسوس کیا اور مارکیٹ کا رخ کیا۔ وقت اگرچہ بہت کم اور تقریب نہایت سادہ بلکہ ایمر جنسی جیسی تھی لیکن بہر حال سچویشن اتنی ٹف بھی نہیں تھی کہ وہ خالی ہاتھ چل پڑتا۔ اس نے ناز کے لیے دو ریڈی میڈ سوٹ اور چھوٹا موٹا ضروری سامان جو پسند آتا گیا لے لیا۔ گھر آکر اس نے چھوٹا سا بیگ تیار کیا کیونکہ آگے ایک ہفتے کے لیے اسکول بھی جانا تھا۔ سونے سے پہلے صرف نیلم کو بلا کر بتایا کہ پرسوں کے بجائے وہ کل ہی کسی ارجنٹ کام کی وجہ سے اسکول چلا جائے گا۔

آٹھ بجے وہ ناز کے ماموں کے ساتھ ان کے گاؤں پہنچا۔ وہ اسے ایک چھوٹے اور سادہ سے گھر میں لے آئے۔ بیٹھک نما اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کھلی میں اور ایک اندر گھر میں کھلتا تھا۔ جہاں میرے کو بٹھایا گیا۔ خادم ماموں چند منٹ کے لیے اندر گئے اور پھر واپس آ گئے۔

”صاحب۔ مجھے ایک ضروری کام کے لیے نزدیک ایک جگہ جانا ہے۔ آدھے گھنٹے تک واپسی ہوگی۔ ناشتے کا میں نے کہہ دیا ہے۔ بس ناز سے بات کرنا باقی ہے۔ اس کے بعد ہی نکاح کا بندوبست ہو سکے گا۔“

”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔۔۔ میں خود ناز سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میرے سنبھل کر مدعا بیان کیا۔

”کیوں نہیں صاحب۔۔۔ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ بات کا ڈھنگ ہم سے زیادہ جانتے ہیں اور ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ وہ راضی ہو جائے۔ میں اس کی مائی سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ ناز کے ہاتھ ناشتا بھجوا دے گی۔ تب آپ اس سے بات کر لیں۔“

www.pdfbooksfree.pk



”بہت شکریہ۔ لیکن آپ سے ایک درخواست ہے کہ صاحب کے بجائے مجھے بیٹا کہا کریں۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ انہوں نے بے ساختہ کہا اور ساتھ ہی ہنس دیے۔ میر نے بھی ہنس کر سر ہلایا۔ ماموں اس سے اجازت لے کر چلے گئے۔ میر کو بیٹھے قریب پندرہ منٹ ہوئے جب دروازے کا پردہ ہٹا اور نازنہ شے کی ٹرے لیے اندر آئی۔ حقیقی حسن واقعی کسی زیور کا محتاج نہیں ہوتا وہ اس وقت ہلکے فیوزی رنگ کے سادہ سے سوٹ میں تھی۔ بالوں کی دور تک نکالی سیدھی مانگ کے ساتھ کھینچ کر باندھی لمبی چوٹی اور بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں گہری کالی کاجل کی لکیر لگائے وہ سیدھی دلی میں اتری جارہی تھی میر اس کے چہرے پر پھیلی واضح گھبراہٹ کی پروا کیے بنا تسلی سے اسے دیکھتا رہا۔

”اسلام علیکم۔“ وہ دو قدم چل کر آگے آئی۔

”وعلیکم السلام کیسی ہو ناز؟“ میر پوری طرح اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس لیے انداز خاصا معصوم رکھا۔

”آ۔۔۔ آپ یہاں کیسے آئے؟“ اس نے بنا نظر اٹھائے سوال کیا۔

”خادم ماموں کے ٹرک پر۔“ میر نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔

”بیٹا کو پتا ہے آپ کے آنے کا۔۔۔ اور ماموں سے کیا بیانہ بنایا؟“ اس کی سوئی میر کی یہاں موجودگی پر اٹکی تھی۔

”اچھا تو میں بہانے بناتا ہوں؟“ میر اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

”کیا بچ بول کر نہیں آسکتا۔۔۔؟“

”بچ۔۔۔؟“ ناز نے آنکھیں پھیلائیں۔ ”کون سا بچ۔۔۔؟“

”وہی جو میرے اور تمہارے بچ ہے۔“ میر نے آرام سے سینے پہ ہاتھ باندھے اور دیوار سے ٹیک لگلی۔

”بتائیں نا کیا کہہ دیا۔۔۔ کیسے سب نے یہاں آنے

دیا؟“ ناز کی پریشانی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

”پہلے کچھ کھالی تولوں پھر آرام سے بتاتا ہوں۔“ میر نے اس سے ٹرے لینا چاہی اس نے فوراً ہاتھ پیچھے کئے۔

”نہیں پہلے بتائیں۔“ اس نے گھور کر کہا تو میر ہنس دیا۔

”اچھا بیٹا ٹھیک ہے۔ لاؤ اسے یہاں رکھ دو۔“ میر نے ٹرے چھوٹی میز پر رکھی اور اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔

”بات ذرا سیریس ہے نازو حوصلے سے سنتا۔“ میر نے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”دراصل۔۔۔ تمہارے بابا اور ماموں نے یہ طے کر ہے کہ حشمت کے عزائم کو قیل کرنے کے لیے جلد از جلد تمہاری شادی کہیں کر دی جائے۔ تمہارے ماموں نے یہاں اپنے جاننے والوں میں کچھ اچھے رشتے دیکھے ہیں۔ چاچا کی طبیعت تو ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ خود آتے۔ میں نے کہا میں چلا جاتا ہوں۔ سوچا تمہیں سمجھانا بھی تو ہے۔۔۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔“ میر نے ذرا اٹک اٹک کر بات مکمل کی تو ناز تنہے پھلا کر پیچھے ہوئی۔

”جی ہاں۔۔۔ اچھی طرح سمجھ رہی ہوں کہ آپ نے اتنی دور تک آنے کی تکلیف کیوں کی۔“

”ارے بات تو سنو۔۔۔ تم تو غصہ ہو گئیں۔۔۔ ہمیں مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا۔“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کسی شادی نہیں کرنی۔ جائیں آپ۔“ وہ باقاعدہ روٹ گئی۔

”لیکن کبھی نہ کبھی تو کرنی پڑے گی۔ کسی سے کر لو۔“ میر نے مزید چلایا۔

”نہیں۔۔۔ کبھی نہیں کسی سے نہیں۔“ وہ غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔

”مجھ سے بھی نہیں۔“ میر نے مسکرا کر کہا تو میر نے بار بار اس نے سوچنے والے انداز میں نظریں اٹھائیں۔

”بہت بری ہو قسم ہے۔۔۔“ میر اس کے نزدیک آیا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

”جس جیلے کو سننے کی خاطر اتنی دور تک آیا وہ تو تم نے بولا نہیں۔ لگتا ہے تمہارے فیصلے سے چاچا کو آگاہ کرنا ہی پڑے گا۔“ میر نے لہجے کو ازید افسردہ بنایا۔

”کون سا فیصلہ۔۔۔؟“ ناز سمجھ چکی تھی۔ اس لیے انداز بھی کچھ کچھ شرمایا ہوا سا تھا۔

”وہی۔۔۔ کسی سے شادی نہ کرنے والا۔“ میر نے یو سی سے کندھے اچکائے۔

”تو میں بھی کہہ دوں گی صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے تو ان کو کوئی اور ہی فیصلہ سنایا تھا۔ انہوں نے خود ہی بدل دیا۔“ وہ اب مسکرا رہی تھی۔

”تب تو چاچا پوچھیں گے کہ۔۔۔ وہ ”کوئی اور فیصلہ“ کیا تھا۔“ میر نے ایک شوخ نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

”وہ تو میں انہی کو بتاؤں گی؟“

”ارے یہ غضب نہ کرنا۔۔۔ ان کو بتانے بیٹھیں تو حشمت لیٹ ہو جائیں گے اور تمہارے ماموں تو نکاح خوان کو بلانے گئے ہیں۔“

”نکاح خوان۔۔۔ ابھی؟“ ناز نے سرے سے حیرت میں مبتلا ہو گئی۔

”جی جناب۔۔۔ آج ہمارا نکاح ہے؟“

”مجھے تو کسی نے نہیں بتایا اتنی جلدی کیوں؟“ ناز نے بے یقینی سے میر کا چہرہ دیکھا تو میر نے اسے چاچا سے ملنے کے بعد کا سارا احوال بتا دیا۔

”اور ہاں۔۔۔ یہ تھوڑی سی شاپنگ بھی کی تھی تمہارے لیے۔ اور یہ موبائل اور سم لایا ہوں۔ اب میں آرام سے پورے حق کے ساتھ اپنی بیوی سے باتیں کیا کروں گا۔ ان شاء اللہ اور اب تم ماہی کے پاس جاؤ۔ وہ بے چاری کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ انہیں اپنی رضامندی کے بارے میں بتا دو۔“

عصر کی نماز کے بعد نکاح کا وقت رکھا گیا۔ خادم ماموں نے اپنے ساتھ قریبی مسجد لے گئے۔ جہاں ان دونوں کے علاوہ پانچ افراد اور موجود تھے۔ مولوی

صاحب کچھ دیر کے لیے خادم حسین کے ساتھ اندر گھر میں گئے۔ ناز سے اس کی مرضی جان لینے کے بعد باقاعدہ نکاح پڑھوایا گیا۔ سب نے اسے مبارکباد دی۔ خادم حسین نے مٹھائی بانٹی۔ کچھ دیر بعد جب سب رخصت ہو گئے تو ماموں اسے لے کر گھر واپس آ گئے۔ وہ بیٹھک میں تھا جب پہلی بار ناز کی ممانی اس سے ملنے آئیں۔ سر پر ہاتھ رکھ کر مبارک دی اور منہ بھی میٹھا کرایا۔

”ماموں اب میں بھی جاؤں گا۔ کچھ دیر میں تو شام بھی ہو جائے گی۔“

”کیوں بیٹا۔۔۔ اسکول تو کل کھلے گا۔ اور ادھر سے تو ایک گھنٹہ بھی نہیں لگتا اور بندہ پہنچ جاتا ہے۔ پھر اسکول کی چابی بھی حشمت کے پاس ہو گی۔ خواجواہ سب سوال کریں گے کہ شام کو کیسے آتا ہوں۔“

”جی ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ لیکن“ میر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

”آج آرام کریں“ میں نے خود کل صبح ٹرک لے کر کوہاٹ نکلنا ہے۔ آپ کو راستے میں چھوڑ سکتا ہوں۔“ خادم حسین نے اصرار کیا تو اس بار میر نے بھی سر ہلایا۔ ماموں چلے گئے تو وقت گزارنے کے لیے میر نے اپنی کتاب نکال لی لیکن اس میں ناز کا چہرہ نظر آیا تو میر نے مسکراتے ہوئے کتاب بند کی اور وہاں سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ ایک پٹ ہٹایا تو سامنے نظر ماموں کے چہرے میں کھلے پنک اور سرخ گلابوں پر بڑی۔ میر کے لب مسکرائے دروازے پر آہٹ ہوئی تو میر چونک کر پلٹا۔

”ارے تم۔۔۔“ ناز کی آمد بالکل ہی غیر متوقع تھی۔ میر نے نکاح کے بعد اس سے ملنے کی امید باندھی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ بات ہسپتال میں خادم ماموں کے سامنے ہی طے پا گئی تھی کہ جب تک حالات رخصتی کے حق میں نہیں ہو جاتے ناز ان کے پاس ہی رہے گی۔ اس لیے جب تک رخصتی نہ ہو جاتی میر کا ناز سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”وہ۔۔۔ ماموں گھر پر نہیں تھے تو ماہی نے کہا آپ

95



سے مل آؤں۔“ ناز کی سنہری رنگت مارے شرم کے سرخ ہو رہی تھی۔

”زبے نصیب۔۔۔“ میرا مسکرا کر آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سامنے چارپائی پر بٹھادیا۔ اپنے لیے بھی قریب پڑی کرسی کھینچی اور ناز کے سامنے بیٹھ گیا۔ ناز وہی میروں سوٹ پہنے ہوئے تھی جو میرا لایا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیر اور ہونٹوں پر لپ اسٹک سجائے وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

”تیار ہونے کو مامی نے کہا تھا؟“ میرے سوال کیا تو ناز نے شرما کر سر ہلایا۔

”آج تم واقعی دلہن لگ رہی ہو۔ لیکن افسوس میں اپنی دلہن کو ساتھ نہیں لے جاسکتا۔“

”آپ کے گھر والوں کو معلوم ہے کہ۔۔۔“

”نہیں۔ میں نے سوائے اپنی پھپھو کے کسی کو نہیں بتایا لیکن تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ بس دعا کرتی رہنا کہ حالات جلد ہمارے حق میں ہو جائیں اور ہم ساتھ رہیں۔ اللہ تمہاری دعائیں دیے بھی جلدی سنتا ہے دیکھو ناں تم نے اس دن خط میں لکھا کہ ہم دونوں کبھی بہت ساری باتیں کریں اور آج ہم آمنے سامنے بیٹھے ہیں لگتا ہے شادی کی دعا بھی جیکے جیکے مانگا کرتی تھیں“ میرے ہنس کر چھیڑا تو ناز مسکراتے لگی۔

”جی ہاں۔ دعا تو مانگی تھی، لیکن یہ نہیں سوچا تھا شادی ان حالات میں ہوگی۔“ وہ سیریس ہو گئی۔

”ہمیں تو شکر کرنا چاہیے۔ بتاؤ اگر حالات ایسے نہ ہو جاتے تو ہم اتنے جلدی ایک ہو سکتے تھے۔“

”لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پہلے مجھے صرف اپنا ڈر تھا۔ اب یہ فکر بھی لگی رہے گی کہ اگر لالہ کو پتا چل گیا تو خدا نا خواستہ وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ آپ تو رہتے بھی وہیں ہیں۔“ ناز کی آنکھیں اندیشوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے بے ساختہ میرا ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔ میرے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہنسی دی۔

”سب سے بڑا ڈر تمہیں کھونے کا تھا۔ آج میری ہو گئیں۔۔۔ باقی سب ڈر بھی بے معنی ہو گئے۔ تم بھی ہر وہم دل سے نکال کر آنے والے وقت کے اچھے اچھے سینے دیکھا کرو۔ وہ وقت جو بہت جلد ہمارا ہو گا۔“ میرے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ لیکن سے نظر نہیں اٹھائی گئی۔ آنکھیں معلوم نہیں کیوں بھر آئی تھیں۔ میری ہنسی پر چند آنسو گرے تو اس نے ناز کو اپنے ساتھ لگایا۔

”مجھے خوش ہونے سے بھی ڈر لگتا ہے صاحب۔۔۔ جیسے ابھی یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ آپ صبح جا جائیں گے اور میں ایک ایک لمحہ خوفزدہ ہوتی رہوں وہ ابھی بھی رو رہی تھی، میری سمجھ رہا تھا کہ ناز کے خدشے بے جا نہیں ہیں لیکن وہ جان بوجھ کر اس بحث سے گریز کر رہا تھا۔ وہ اپنی طرف سے کچھ بول کر اس کے ڈر کو بڑھاوا نہیں دینا چاہتا تھا۔

”چلو بس۔ اب رونا بند کرو اور جاؤ شاباش، کب ماموں واپس آگئے تو اچھی بات نہیں ہے۔“ میرے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا تو ناز آنکھیں صاف کر دیتی۔

\*\*\*

رحمان چاچا ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر آگئے تھے لیکن فی الحال گھر پر آرام کر رہے تھے۔ میرا روزانہ شادی کی تیاریاں کرنا تھا۔ ناز سے بھی نو پر بات ہو جاتی تھی۔ اس کا ایک ہی اصرار تھا کہ واپس آنا چاہتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں پاپا یہاں کوئی خیال رکھنے والا نہیں تھا۔ میرا تو مان بھی تھا لیکن چاچا ناز کو واپس بلانے سے ڈر رہے تھے۔ انہیں شہمت پر ذرہ برابر بھروسہ نہیں تھا۔

”لیکن چاچا۔ اگلے مہینے ناز کے سالانہ امتحان ہر پھر تو اسے یہاں آنا ہی ہے۔ تو اب بلانے میں کیا حرج ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کے آنے سے آپ کی طبیعت جلدی بہتر ہوگی۔“

”اچھا صاحب دیکھتا ہوں۔ بس ذرا اس کے امتحان

اور نزدیک آجائیں پھر بلائیں گے۔“ چاچا نے بالا خر باہر بھری۔

گھر میں وہی مستقل سرد مہری کا ماحول تھا جیسے سب نے ٹھان لی تھی کہ میرا ثوبیہ سے شادی کرے گا تو اس گھر میں قابل قبول ہو گا۔ اما جی بھی ناراض ناراض سے رہتے تھے۔ میرے الگ گھر کے لیے کچھ دوستوں کے ذمے کام لگایا ہوا تھا اس بار گھر واپس آیا تو اسی کام میں مصروف رہا۔ اس کا ارادہ باپ سے ناراض ہو کر جانے کا نہیں تھا نہ ہی اس نے ایسا امپریشن دیا۔ جب اسے ایک گھر پسند آگیا تو اما جی سے کہا کہ ”چند دوست مل کر اسٹڈی کی خاطر الگ گھر لے رہے ہیں۔ وہ بھی کچھ دن کے لیے وہاں شفٹ ہو رہا ہے۔“ ویسے بھی فی الحال وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ الگ گھر کا تجربہ اس کے لیے بہتر رہتا ہے یا نہیں اور یوں وہ چھوٹے سے نئے گھر میں آگیا۔ میرے جب ناز کو بتایا تو بجائے خوش ہونے کے وہ پریشان ہو گئی۔

”آپ اپنے اسکول والوں میں سے کسی کو الگ رہنے کا مت بتائیں۔“

”کیوں۔۔۔ خیر تو ہے نا اس سے کیا ہو گا؟“

”وہ۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ لالہ کو آپ کے الگ رہنے کا پتا چلے۔ مجھے بابا نے بتایا ہے کہ جس جعلی پیر کو آپ نے پیسے دے کر لالہ کی اصلیت بتانے کا کہا تھا اس نے لالہ کو آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ لالہ کل آپ کے پر پیل سے بھی ملے تھے۔“

”اے۔۔۔“ میرا اس اچانک اطلاع نے فوری طور پر ڈسٹرب کر دیا۔

”اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں سنبھال لوں گا۔ تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔ میں نے سنا ہے ڈیٹ شیٹ آئی ہے۔“

”جی ہاں پڑھائی تو کر رہی ہوں اور پرسوں ماموں کے ساتھ واپس گھر بھی آرہی ہوں؟“

”اچھا۔۔۔“ میرے اس کی آمد کا سن کر خوشگوار حیرت محسوس کی۔

”چلو دیکھتے ہیں۔ جدائی نے تمہیں کتنا کمزور کیا

ہے۔“

”کمزور تو ہو گئی تھی، لیکن پرسوں آنے کی خوشی نے دوبارہ وزن بڑھا دیا ہے۔“ ناز کے بے ساختہ جواب پر میرے قہقہہ لگایا۔

”ہاں ہاں۔ اب بہانے بناؤ۔ اچھا ٹھیک ہے۔ اب رکھتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔“

پر پیل صاحب نے اسے اگلے روز بلا لیا۔ لیکن گفتگو کافی اچھے ماحول میں ہوئی، وہ صرف جانتا چاہتے تھے کہ حشمت نے اس کے خلاف ایسی شکایت کیوں لگائی تھی۔ انہی کی زبانی پتا چلا تھا کہ حشمت نے کہا میرا صاحب ان کے گھریلو معاملات میں دخل اندازی کر رہا ہے۔ میرے جواباً ”اتنا کہا کہ حشمت کی شکایتوں کا وہ فی الحال کھل کر جواب نہیں دے سکتا البتہ رحمان چاچا اس معاملے میں انہیں صحیح جواب دے سکتے ہیں کیونکہ رحمان چاچا کو میرے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میری بات پر پر پیل صاحب نے تائید کے انداز میں سر ہلایا۔

”ہاں حشمت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ کیسے مزاج کا آدمی ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ جب رحمان نے تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کی تو حشمت کی شکایت کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور رحمان تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔ میں صرف تمہارے علم میں لانا چاہتا تھا میرے۔ اور کوئی بات نہیں ہے۔“ پر پیل صاحب نے مسکرا کر وضاحت کی۔

”تھینک یو سر۔ میں جانتا ہوں۔“ میری بھی اجازت لے کر باہر آگیا۔

ناز کے پیپر میں صرف دس دن رہ گئے تھے۔ اسے گھر واپس آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ میری اس سے بات بہت ہی کم ہو پا رہی تھی۔ کیونکہ حشمت اور بھابھی کی وجہ سے اسے موبائل چھپانا پڑ رہا تھا۔ میرے اسے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں جذبات سے زیادہ وہ احتیاط کو مد نظر رکھے۔ ویسے بھی وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اسے اپنا دھیان پڑھائی پر لگانا چاہیے۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اگلے روز چھٹی کے بعد گھر واپس



جانا تھا۔ معلوم نہیں کیوں رات کو اس کی طبیعت عجیب ہو جھل سی ہو گئی تھی۔ آدھی رات گزر جانے کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے سرہانے رکھی کتاب بنادیکھے کھولی۔

کون تھا جس کی آہوں کے غم میں ہوا سرد تھی شرکی کس کی دیران آنکھوں کا لے کے اثر چاند خاموش تھا کل کہیں پھر خدا کی زمیں پر کوئی سانحہ ہو گیا میں نے کل رات جب بھی اٹھائی نظر چاند خاموش تھا میرے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کروٹ بدلی۔ ناز کی یاد بہت شدت سے آرہی تھی۔ طبیعت پر عجیب سی بے سکونی طاری تھی۔ اس نے لائٹ آف کر کے زبردستی سونے کی کوشش کی، باقی کی رات اٹنے سیدھے ہو جھل قسم کے خواب دیکھتے گزر گئی۔ صبح اٹھا تو سر بھی بہت بھاری تھا۔ کسی طور خود کو مسجد تک جانے کے قابل بنایا۔ نماز پڑھ کر دیر تک خیر اور سلامتی کی دعا کرتا رہا۔

شروع کے دو پیریڈ لگاتار ساتویں جماعت میں تھے۔ تیسرے پیریڈ میں جب وہ دسویں جماعت میں داخل ہوا تو بھی لڑکوں کو چہ میگوئیوں میں مصروف پایا۔ میرے ڈپٹ کر سب کو چپ کرایا اور پڑھانا شروع کیا۔ ”سر آج پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔“ پیچھے سے کسی نے شوخی کی لیکن میرے نوٹس نہیں لیا۔

”سر آپ کو پتا چلا آج ہمارے گاؤں میں کیا ہوا؟“ پھر کسی کے پیٹ میں درو ہوا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ کیا ہوا؟“ میرے نہایت اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”سروہ اپنے رحمان چاچا ہیں نا۔ ان کی بیٹی۔“ میرے ہاتھ سے لکھتے لکھتے چاک چھوٹ گیا۔ فوراً چونک کر پلٹا۔

”کک۔ کیا ہوا ان کی بیٹی کو۔“

”سروہ اس کے گھر والے اسے مزار کی خدمت پر نہیں لگا رہے تھے نا۔ تو پیر نعمت شاہ کی روح کو جلال آگیا آج صبح چاچا کی بیٹی مزار پر بے ہوش پڑی ملی۔ سب کہہ رہے ہیں رات کو پیر بابا کی کرامت سے وہ خود

بخود مزار پر پہنچ گئی کیونکہ اسے خود نہیں پتا کہ کیسے پہنچی۔“

”اوہ۔“ میرے دیر سے رکنا سانس بحال ہوئے پیشانی کا پسینہ صاف کیا۔ تھوڑی دیر پہلے اور پھر کتاب کھول کر جلدی جلدی بورڈ پر کچھ لکھے۔

”جاوید اور رحمت اللہ۔ تم دونوں یہاں آؤ۔ ان سب سے نظر رکھو۔ یہ سربراہ تیسرے پیریڈ میں حل کر گئے دو۔ مجھے ذرا پر پزل صاحب پاس کام ہے۔“ میرے انہیں کام میں مصروف خود باہر نکل آیا۔ پر پزل صاحب سے گھٹنے اجازت لی اور چاچا کے دروازے پر آیا لیکن وہاں تھا۔

میرے بنا وقت ضائع کیے مزار کی راہ لی۔ کچھ پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے مزار تک کا سفر نہ بھاگتے ہوئے طے کیا۔ دماغ جیسے پھٹنے کے قریب آگے کیا پیش آنے والا تھا۔ اس کے بارے میں سوچ کر اسے ہول اٹھ رہے تھے۔

مزار کے احاطے میں مروتوں بس چند ایک تھے ایک سائیڈ پر عورتیں کافی ساری جمع تھیں۔ چار نظر میر پر پڑی تو خود ہی اس کی طرف بڑھے اور کھینچتے ہوئے اسے مزار سے باہر ایک سائیڈ پر آئے۔

”یہ سب کیا ہے چاچا۔ ناز کو مزار پر کون لایا؟“ بہت بڑا گناہ ہو گیا صاحب۔ بڑی بھول ہمنے۔ پیر بابا کا جلال دیکھا؟“

”کیا مطلب چاچا۔ ناز کیسی ہے۔ پلیز مجھے بات بتائیں۔“

”آج صبح جب ہم جاگے تو میری بہو نے سب پہلے بتایا کہ ناز گھر میں نہیں ہے۔ میں تو صاحب سے نکل کر آپ کی طرف ہی آ رہا تھا کہ مزار آوی دکھائی دیے۔ انہوں نے مجھے آواز دے کر اور بتایا کہ جب متولی نے مزار کا دروازہ کھولا تو اندر بے ہوش پڑی تھی وہ تو شور مچاتا ہوا آیا کیونکہ راہ

دس بجے وہی سارے کنڈیاں دروازے بند کر کے گیا تھا اور صبح کھولے بھی اپنے ہاتھوں سے تھے۔ دیکھا صاحب۔ یہ کھلی نشانی ہے۔ خود ناز کو نہیں پتا وہ کب اور کیسے مزار پہنچی۔ بس صاحب اسی وقت سے لوگ زیارت کو آرہے ہیں۔ اس کو اچا اور اوڑھادی ہے۔ اندر کوئی مرد نہیں جاسکتا۔ بس عورتیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چاچا۔ وہ میری بیوی ہے۔“ میرا ضبط جواب دے گیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چاچا اس طرح ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

”آہستہ صاحب۔ شکر برہیں اپنے گاؤں میں کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔ جو غلطی ہم سے بھولے میں ہو گئی تھی اسے ہمارے بیچ ہی رہنے دیں اور توبہ کریں ورنہ پیر بابا کا غضب مجھے اور آپ کو بھی لے ڈوبے گا۔ جلد از جلد اسے آزاد کر دیں اب وہ پیر بابا کی امانت ہے۔“ چاچا بولے جارہے تھے اور میر کا بس نہیں چل رہا تھا اپنے بال نوچ ڈالے۔ فی الحال چاچا کو سمجھانا ناممکن لگ رہا تھا ناز سے ملاقات کی بھی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھی اور کیا سوچ رہی تھی۔ میرے تھکے قدموں سے اسکول واپس آیا۔

چھٹی کے بعد ٹیچرز شہر واپس جا رہے تھے۔ لیکن میر اسکول میں ہی رک گیا۔ پر پزل صاحب شاید اسے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن دوسروں کی موجودگی یا پھر کسی مصلحت کے تحت چپ ہی رہے۔ میر اب اسکول میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ذہن میں کوئی پلاننگ تھی نہ کوئی رہنمائی کرنے والا بس اتنا معلوم تھا کہ ناز مصیبت میں ہے اور اسے یہیں رہنا ہے۔ اس کے قریب وہ اسکول سے نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈی پر چلتا چلا گیا اور بالا آخر تھک کر وہیں بیٹھ گیا۔

خیال و خواب ہوا برگ و بار کا موسم چھڑ گیا تیری صورت پیار کا موسم وہ نرم لہجے میں کچھ تو کہے کہ لوٹ آئے سماعتوں کی زمیں پر پھوار کا موسم

میر نے ایک آہ بھرتے ہوئے گہرے کالے بادلوں پر نگاہ کی۔ ”کہیں تو کچھ گڑبڑ تھی۔ ناز مزار کے اندر کیسے پہنچی ہوگی؟ کاش کوئی ایک بار مجھے اس سے بات کرنے دیتا۔“ گھاس نوچتے ہوئے وہ برابر اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا اس نے پہلا فون یا سمین کو کیا۔ چاچا نے بتایا تھا کہ عورتوں کو ناز کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ یا سمین یقیناً اس کی مدد کر سکتی تھی۔ میر نے اسے کہا کہ وہ آج ہی کسی طرح ناز کے پاس جائے۔ شاید وہ کچھ بتانا چاہتی ہو اور مزید اپنی طرف سے یہ پیغام بھی دیا کہ وہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گا اس لیے وہ حوصلے اور صبر سے انتظار کرے۔ دو سہری کل میر نے خادم ماموں کے نمبر پر ملائی۔ اسے یقین تو نہیں تھا لیکن ایک امید ضرور پیدا ہوئی کہ شاید وہ چاچا کی طرح تو ہم پرست نہ نکلیں اور میر کی امید اس وقت خوشی میں تبدیل ہو گئی جب ماموں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میر نے انہیں یہاں بلایا، انہوں نے بتایا کہ وہ فی الحال سفر میں ہیں اور اگلی صبح دس بجے تک پہنچ جائیں گے۔

میر کا ارادہ خادم ماموں کو ساتھ لے کر زمیندار صاحب کے پاس جانے کا تھا۔ وہ چاہتا تو اسی روز اکیلا ہی نکاح نامہ لے کر ان سے ملنے جاسکتا تھا لیکن اس طرح وہ یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ شاید نکاح چوری چھپے ہوا ہو۔ خادم حسین کی موجودگی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی کہ نکاح باہمی رضامندی سے ہوا تھا۔ شام کو یا سمین کا فون آیا اس نے بتایا کہ ناز کو حشمت پر شک ہے وہ کہتی ہے شاید اسے نیند کی گولی کھلائی گئی تھی، اسے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ نیل گاڑی میں مزار تک آئی تھی اور نیل گاڑی لالہ کے ایک قریبی دوست رب نواز کے پاس بھی ہے۔ شاید لالہ نے اس کی مدد لی ہو۔

اگلی صبح خادم ماموں دس بجے سے پہلے ہی آگئے۔ میر انہیں لیے مخدوم صاحب کے ڈیرے پر آیا، وہ اس وقت تقریباً ”فارس“ ہی بیٹھے تھے۔ میر نے جب کہا کہ وہ اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے ان دو



چار افراد کو بھی رخصت کر دیا جو اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے۔ سب کے جانے کے بعد میر نے زمیندار صاحب کو نہایت سلجھے ہوئے انداز میں ناز سے اپنے نکاح کی بات بتائی اور نکاح نامہ بھی دکھادیا۔ انہوں نے بھی بڑے تدریس سے میر اور خادم حسین کی بات سنی۔ میر نے انہیں ناز کے پچھلے روز والے بیان کے بارے میں بھی بتادیا جس میں اس نے حشمت اور رب نواز کی بیل گاڑی کا ذکر کیا تھا۔

”ہو نہ۔“ زمیندار صاحب نے سر ہلایا۔

”حشمت کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ وہ اپنا مکان حاصل کرنے کے لیے برسوں سے دیوانہ ہوا پھر رہا ہے۔ لیکن استا صاحب آپ بتا رہے ہیں کہ رحمان بھی اب آپ کا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہے بلکہ آپ کو طلاق کے لیے بھی کہہ رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا وہ میرے سمجھانے سے اپنا ارادہ بدل دے گا۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن آپ گاؤں کے بڑے ہیں، میں آپ سے مشورہ کرنے بلکہ مدد مانگنے آیا ہوں۔“

”صاحب، مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے لیکن میں بھی کل صبح سے یہی قصہ سن رہا ہوں۔ گاؤں والوں کا اعتقاد پیر بابا پر بڑا پاک ہے۔ میں نے کچھ کہا تو سب میرے بھی خلاف ہو جائیں گے۔ میں لاکھ گاؤں کا بڑا سہی لیکن پیر بابا کے سامنے میری کیا اوقات، اگر میں معاملہ پنچائیت میں لے جاؤں تو رہی سہی امید بھی گئی کیونکہ پنچائیت بی بی کو مزار پر بٹھانے کے حق میں ہی فیصلہ دے گی اور اگر میں نے اپنی طرف سے آپ کے حق میں فیصلہ سنایا تو مجھے گاؤں والوں کی بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ میر کی امید ایک بار پھر دم توڑنے لگی۔

”سوچتے ہیں۔ شاید کوئی راہ نکلتی ہو۔“ مخدوم صاحب کا جواب میر کو محض تسلی دیتا ہی لگا۔ اس نے اجازت لی اور خادم ماموں کو لیے باہر آگیا۔ ماموں کو اتنی دور تکلیف دینے پر بھی اسے کافی افسوس ہوا۔ ان سے

معذرت کر کے میر نے انہیں واپس بھیج دیا۔ پھر انہوں نے جاتے جاتے کہا کہ اگر آگے بھی ضرورت پڑے تو وہ آجائیں گے۔

پیر سے اسکول کی روٹیں پھر شروع ہو گئی۔ میر اس دوران رب نواز کے بارے میں معلوم کرنا کوشش کی لیکن پتا چلا صبح کے بعد سے اس کی کچھ نہیں ہے۔ میر کو اباجی کی بہت یاد آ رہی تھی۔ ار شدت سے احساس ہوا کہ شاید وہ ان کا دل دکھا باعٹ بنا تھا۔ میر نے بنا سوچے ان کا نمبر ملا دیا۔

”کیسے ہیں اباجی؟“

”ٹھیک ہوں بیٹا۔ تم سناؤ۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس آپ کی یاد آ رہی۔“

”اس بار ویک اینڈ پہ ملنے بھی نہیں آئے۔ تم گھر کیا بدلا ملنا بھی چھوڑ دیا۔“ ان کے چھوٹے شکوے نے میر کو ڈھیر ساری خوشی دی۔

میں اس بار گاؤں میں ہی رک گیا تھا۔ شہر آنا نہیں ہوا۔ اگلی بار ضرور آؤں گا۔ ان شاء اللہ۔“

”تم چاہو تو گھر واپس آ سکتے ہو میر۔ شاید ٹوہیہ سے شادی کے لیے تم پر دیاؤ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔“

”نہیں اباجی۔ میں آپ سے خفا ہو کر نہیں ہوں بلکہ اپنے دل میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کا صرنا ایک حکم بھی مان نہیں سکا۔“

”میر۔ تم جوان اور خود مختار ہو مجھے تم پر زبردستی کوئی حق نہیں۔ کل ہی تمہاری پھپھو سے میری بل ہوئی اس نے مجھے بتایا کہ تم ٹوہیہ میں انٹر سٹڈ نہیں بلکہ سب مل کر تمہیں ٹریپ کر رہے تھے اور تم پر الزام غلط تھا۔“ اباجی نے وضاحت کی تو میر نے آ تک سکون محسوس کیا۔

”جی ہاں میں واقعی اس معاملے میں بے قصور ہوں۔ اصل اباجی۔“ وہ کہتے کہتے رکا۔

”میں نہیں اور کھٹکھٹ ہوں۔“

”کیسے گاؤں میں تو نہیں۔؟ ویک اینڈ پہ آنا

چھوڑ دیا ہے۔“ ابانے ہلے سپنے انداز میں پھیرا تو میر جھینپ گیا۔

”جی، اباجی۔ اس بار میں آؤں گا تو آپ سے تفصیل سے بات ہوگی۔“

”او کے بیٹا اپنا خیال رکھنا۔ اللہ کی امان میں رہو۔“ انہوں نے فون بند کر دیا۔ میر نے ان سے بات کر کے بے حد سکون محسوس کیا۔

ظہر کی نماز اور کھانے کے بعد باقی ٹیچرز آرام کر رہے تھے۔ میر بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا جب رحمان چاچا اس کے کمرے میں آئے۔ نا صرف یہ بلکہ آتے ہی میر کے پیروں پہ گر گئے۔

”مجھے معاف کر دو بیٹا، میں پھر حشمت کے دھوکے میں آگیا تھا۔“ وہ باقاعدہ رو رہے تھے۔

”ارے۔۔۔“ میر نے فوراً انہیں اٹھایا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا ہوا سب خیریت تو ہے؟“

”بس بیٹا آنکھوں پہ پٹی بندھ گئی تھی۔ میں سمجھا پیر بابا آپ کے اور ناز کے نکاح پر جلال میں آگئے اور یہ سب ہوا؟“

”چاچا آپ آرام سے ساری بات بتائیں۔ بلکہ پہلے یہ بتائیں ناز کہاں ہے۔ اور کیسی ہے؟“ میر کو چاچا کی بے سرو پا گفتگو سے کچھ بھی اخذ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ ناز کے پاس گاؤں کی سب عورتیں جمع تھیں تو اچانک اسے وجد سا آیا اور پیر بابا اس کے اندر حلول کر گئے اور وہ بھاری آواز میں ناز کی زبان کہنے لگے کہ ناز کے مزار آنے پر وہ بہت خوش ہیں۔ لیکن اس کا بدنیت بھائی مزار کے آس پاس بھی نظر نہ آئے اور مزار کے ساتھ والے مکان کو ہمیشہ کے لیے مزار کا حصہ بنا دیا جائے۔ وہ اب کسی کی ملکیت نہیں رہے گا۔ بس صاحب یہ سننا تھا کہ میری بہو جو وہاں عورتوں میں بیٹھی تھی اس نے شور مچا دیا کہ ناز جھوٹ بول رہی ہے۔ اس پر پیر بابا کا نرول نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے حشمت رات کو مزار پر

پھوڑ لیا تھا اور بے ہوش ہی اسوں لے لیا تھا۔ بڑا تماشا لگا صاحب۔۔۔ اور سے متولی بھی آگیا، مجھے اور حشمت کو بلایا گیا۔ پھر تو حشمت نے سب سچ بتا دیا کہ اس نے ناز کو نیند کی گولی دی تھی اور رب نواز کی بیل گاڑی پر ڈال کر مزار لے گئے۔ وہاں چھوٹی دیوار پھاند کر اسے مزار کے اندر لٹایا اور واپس آگئے۔ اگلی صبح مشہور کر دیا کہ یہ سب پیر بابا کی کرامات تھیں۔ حشمت سے سچ اگلوانے کے لیے ناز نے وجد آنے کا ڈرامہ کیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔“ میر نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اب ناز کہاں ہے؟“

”وہ تو ابھی اوہر ہی ہے۔ عورتیں حشمت کو برا بھلا کہتی وہاں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ اب تک مزار خالی ہو گیا ہو گا۔“

”تو اب آگے کیا کرنا ہے چاچا۔ آپ کو نہیں لگتا ناز کو گھر لے آنے میں خطرہ ہے۔“

”ہاں بیٹا۔ میں تو کہتا ہوں۔ آج ہی اپنی امانت لے جاؤ۔ میں یہاں سب کو بتا دوں گا۔“

”لیکن اس کے امتحان۔۔۔ دو روز بعد اس کا پہلا پیپر ہے؟“ میر کا دماغ الجھنے لگا۔

”اچھا خیر فی الحال سب سے بڑی خوشی کی بات یہی ہے کہ سچ سامنے آگیا۔“ میر چاچا سے باتیں کرتا اسکول سے باہر آگیا۔

مزار پر آئے تو واقعی اب وہاں کوئی رش نہیں تھا۔ ناز کے پاس صرف متولی کی بیٹی بیٹھی ہوئی تھی جو میر اور چاچا کو دیکھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ چاچا نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں رک گئے۔ ناز اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میر نے اسے صحیح سلامت دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس نے واقعی نہیں سوچا تھا کہ حالات اتنے جلدی اس کے حق میں ہو جائیں گے۔

”کیسی ہونا نہ۔؟“ میر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔

”تم نے بڑی ہمت دکھائی ناز۔ آج تمہاری وجہ سے ہم پھر ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔“



ہیں صاحب۔ میری عقل کہاں اتنا کام کرتی ہے۔ وہ تو کل بی بی جی آئی تھیں۔ سمجھانے انہوں نے سکھایا تھا سب کچھ۔“

”بی بی جی۔۔۔“ میر نے حیرت سے دہرایا ”وہ کون ہیں؟“

جی وہ اپنے زمیندار صاحب کی گھر والی۔“ ناز نے وضاحت کی تو میر بری طرح چونکا پھر ایک دم ہنس پڑا۔ مخدوم صاحب تو بڑے اسماٹ آدمی نکلے تھے۔ بنا خود پر نام لائے اس کی اتنی بڑی مشکل حل کر دی تھی۔

”یعنی مدد کے لیے زمیندار صاحب کا انتخاب کرنا میری بھول نہیں تھی۔“ وہ بڑبڑایا۔

”جی؟“ ناز نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میر کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

”کچھ نہیں فی الحال تمہارے کہیں رہنے کا بندوبست کر آؤں۔“

”رہنے کا۔۔۔ کیا مطلب؟“ وہ پھر اسے دیکھنے لگی۔

”ارے میری بھولی سی دلہن۔۔۔ لالہ سے اتنا بڑا پیٹنگا لے کر کیا سمجھتی ہو وہاں رہ سکتی ہو؟“ میر نے بھنویں اٹھا کر سوال کیا تو ناز نے ہنس کر نفی میں سر ہلایا۔ میر نے ناز اور چاچا کو وہیں انتظار کرنے کا کہا اور مخدوم صاحب سے بات کرنے چلا گیا۔ انہوں نے بڑی گرجوٹی سے میر کو گلے لگایا تھا، میر نے ان کا شکریہ ادا کیا، انہیں ناز کے امتحانوں کے بارے میں بتایا اور چند دن کسی محفوظ جگہ پر رکھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے میر کو تسلی دی اور بتایا کہ انہوں نے حشمت کو تھوڑی دیر میں اپنے ڈیرے پر بلایا ہے انہوں نے پنچائیت سے مشورہ کر لیا تھا سب کا یہی خیال تھا کہ حشمت کو پیر بابا کے مزار کی خدمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے صرف ذاتی مکان سے سروکار ہے۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسکول کے ساتھ والے مکان کو چاچا کے نام کر دیا جائے۔ ویسے بھی مزار والا مکان ان کے باپ دادا کی جاگیر تھا اس لیے ذاتی مکان پر ان کا حق بنتا تھا۔ مزید انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ حشمت سے وعدہ لیں گے کہ ناز کو کسی قسم کا

نقصان نہ پہنچے۔

”اوہ۔۔۔“ میر نے ایک گونہ گو سکون محسوس کیا۔ مطلب اب ناز اپنے گھر جاسکتی ہے۔ میں آپ کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں کر سکتا۔

”نہیں استاد صاحب میں سمجھتا ہوں ہماری سس کی وجہ سے بچی نے اتنے سال تکلیف میں گزارے اب تو بس ولیمہ کھلائیں۔“ زمیندار صاحب نے چہرہ تو میر ہنس دیا۔

ضرور۔ بس میری بیگم ذرا امتحانوں سے فار ہوئے۔“ میر نے ان سے اجازت لی۔

\*\*\*

آیت جاں سے در دل کو اجالے رکھوں  
مثل تعویذ گلے میں اسے ڈالے رکھوں  
آ میرے چاند نہ کھا جائے ستاروں کو نظر  
میں تیرے گرد مناجات کے ہالے رکھوں  
ناز اور میر کھڑکی میں کھڑے بارش کا نظارہ کر رہے تھے۔ شادی ہال میں ولیمہ کی تقریب ختم ہوئی تو لہذا نے گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ کوئی ات گھر تک ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ البتہ صرف اس شہر پر کہ وہ چند دن ہی اپنے نئے گھر میں رہ سکتا ہے۔ اسے ان کی بہو کو اپنے گھر لے آنا ہو گا۔

”جی ابا جی۔۔۔ میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ۔“ میر نے آگے بڑھ کر ان کو گلے لگایا۔

”کیسا لگ رہا ہے ناز۔۔۔“ میر نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر بارش کو اپنے ہاتھوں پر محسوس کیا۔

”یہیں نہیں آ رہا۔“ ناز نے شیشے کے کھلے پٹ سر نکالیا تو میر رخ موڑ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

نے گہرے جامنی اور سبز رنگ کی پشوا زپنی پہنی ہوئی تھی سلیقے سے کیے خوب صورت میک اپ اور کھلے بال کے ساتھ وہ آج بے حد حسین لگ رہی تھی۔ میر اس کے خوب صورت روپ کو آنکھوں میں بسا۔

ہوئے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

”جانتی ہو یقین کب نہیں آتا؟“ میر نے اس

ہاتھ اپنے دل پر رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”جب محبت خوشی دیتی ہے تو دل خوش بعد میں ہوتا ہے اور ہزاروں وہم پہلے لاحق ہو جاتے ہیں۔ تمہاری بے یقینی میں جو محبت چھپی ہے وہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ تم نے کہا تھا ماں کے بعد اگر کسی نے تمہارا بہت خیال رکھا ہے تو وہ میں ہوں۔ اور یہی ماننا میرا بھی ہے۔ جس دن پہلی بار تم سے ملا تھا اس سے پچھلی رات میری امی نے خواب میں مجھے پھول دیے تھے۔ میں امی کے خواب کے بارے میں سوچتا ہوا آ رہا تھا جب تم نالے کے پار بالکل میرے سامنے آکھڑی ہوئیں۔“

اچھا سنو۔ تمہیں تو بہت برا لگا ہو گا جب میں نے تمہارا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔“

”نہیں۔۔۔“ ناز شرمیلے انداز میں ہنسی۔ ”آپ کو گھبراہٹ میں خودیہ نہیں تھا کہ کیا ہوا۔ ہاتھ تو مجھے چھڑا لیتا چاہیے تھا لیکن۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”لیکن۔۔۔“ میر نے بھرپور دلچسپی سے اس کی مسکراہٹ پر غور کیا۔

”میں تو سوچ رہی تھی یہ فرشتہ کہاں سے اچانک نمودار ہوا۔ آپ کو پہلے کبھی دیکھا بھی تو نہیں تھا۔“

”اور پتا کب چلا کہ فرشتہ تو اپنے اسکول میں ٹیچر ہے۔“ میر نے چھیڑا تو اس کی جھہنپی جھہنپی ہنسی نکل گئی۔

”جب آپ نے نالے پر تختہ ڈلوایا تو بابا نے گھر میں صرف اتنا بتایا تھا کہ میر صاحب راستہ ٹھیک کروا رہے ہیں اس وقت مجھے صرف شک ہوا کہ شاید آپ ہی میر صاحب ہوں، لیکن جب دیوار سے دیکھا تب یقین ہو گیا۔“

”اور کیا سوچا تھا دیکھ کر۔۔۔؟“

”بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ سانپ والے واقعے کے بعد سے ہر وقت آپ کو ہی سوچتی رہتی تھی۔ جب آپ کو گھر کے اتنے پاس دیکھا تو یقین ہی نہیں آیا۔ شروع کے دنوں میں تو اپنے حالات کے بارے میں

جیسے سوچتا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن بار بار سامنا ہونے پر جب احساس ہوا کہ آپ بھی میرے بارے میں سوچنے لگے ہیں تو پہلی بار ہوش آیا اور یہ خیال بھی کہ آپ کو اپنے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ اگر وہ کچھ کہتے کہتے جیسے جھک کر رک گئی۔

”ہاں بولو۔۔۔“ میر دلچسپی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

”اگر میں آپ کو خط لکھ کر پہل نہ کرتی تو کیا ہوتا؟“ ناز نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو میر ہنس پڑا اور پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”کیوں ان وہموں میں خود کو پریشان کریں۔ تم خط نہ لکھتیں تو کوئی اور وسیلہ بن جاتا، کیونکہ اوپر والے نے یہ چاند میرے ہی گھر میں اتارنا تھا۔“ میر نے محبت سے کہا تو ناز نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

اسی میں خوش ہوں میرا دکھ کوئی تو سہتا ہے چلی چلوں کہ جہاں تک یہ ساتھ رہتا ہے زمین دل یونہی شاداب تو نہیں اے دوست قریب میں کوئی دریا ضرور بہتا ہے

\*\*\*

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

# گوئی ایسا اہل دل ہو

فیصلہ شدہ

قیمت --- 250/- روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 - اردو بازار، کراچی۔



# اصولِ حیات

رکھنی چاہیے جہاں جو خوشی ملے اسی پر خوش ہو جانا  
چاہیے۔ اماں سارا دن فریم پر سر جھکائے کڑھائی  
کرتے میں مگن رہتیں۔ ان کے ہاتھ میں بہت  
نفاست تھی اور وہ ماشین پر جھکی دھڑا دھڑکیڑے سے  
جاتی۔  
ابا کو مشین کی گھر گھر سخت ناپسند تھی۔ اس لیے  
ان کے گھر میں قدم رکھتے ہی مشین ایک طرف رکھ  
کر گھڑی دو گھڑی کے لیے اسے بھی ابا کے طفیل کمر



دھاڑ اماں کے ساتھ ساتھ ندا آپا اور ردا کو تھر تھر کانپے  
پر مجبور کر دیتی۔

جبکہ وہ ان کے برعکس ابا کی ٹیڑھی باتوں کے  
جواب اس قدر ”ٹیڑھے پن“ سے دیتی کہ وہ اکثر دان  
کچکا کر رہ جاتے۔ اسے اپنی کم گو، سلیقہ شعار اور  
خدمت گزار ماں پر بہت ترس آتا تھا اور کبھی کبھی  
کی کم ہمتی اور بزدلی پر بے انتہا غصہ بھی۔

”آپ ابا کو ٹوکتی کیوں نہیں ہیں کہ وہ غلط ہیں اور  
طریقہ غلط ہے، ان کی سوچ غلط ہے، انہیں کہتی کی  
نہیں ہیں کہ وہ ہمیں سکون سے عزت کی زندگی کیل  
نہیں گزارنے دیتے؟“ کبھی کبھی وہ ان کے سامنے  
پھٹ پڑتی تھی۔ وادی اس کی ایسی باتیں سن کر اکڑ  
اپنے گل پیٹ ڈالتیں۔

”توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے اب بیٹیاں اپنے باپ  
کے بارے میں ایسے ایسے الفاظ استعمال کریں گی۔“  
”وادی! باپ جس ”شان“ کا ہے یہ آپ بھ  
جانتی ہیں یہ اور بات ہے کہ اپنے ”بیٹے“ کے خلاف  
کچھ سننا نہیں چاہتیں۔“ وہ صاف گوئی سے کہتی د  
سے اٹھ جاتی۔

ایک بیوی کمزور ہو سکتی ہے، ایک بیٹی کمزور ہو  
سکتی ہے، ایک بہن بھی کمزور ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک  
کیسے کمزور ہو سکتی ہے؟ وہ ساری زندگی ایک  
سے نہ تو اپنی ذات منوائیں اور نہ ہی اپنی اولاد کا وجہ  
اسے ساری زندگی اپنی ماں سے یہی لگے رہا۔  
زندگی سے کبھی بہت زیادہ خوشیوں کی توقع نہ

اس کے نزدیک دنیا کی سب سے خوش نصیب  
عورت وہ تھی جس کا خاوند اس کے حق میں بہتر ثابت  
ہو۔ جو بنا کہے اس کے اندر تک کا حال جان لے، جس  
کی ذات اپنی بیوی کے لیے زمانے کی پتی دوپہر میں  
گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہو اور جو اس کی غیر  
موجودگی میں بھی زندگی کے ہر موڑ پر۔ اس کا دفاع  
کر سکے اور اگر یہ سچ ہے تو پھر اس کی ماں دنیا کی سب  
سے بد نصیب عورت ٹھہری۔

وہ بچپن ہی سے بہت حساس تھی۔ اکثر معمولی  
معمولی باتوں پر گالیاں بکتے، توڑ پھوڑ مچاتے اور اماں کو  
زید کو ب کرتے ابا کو دیکھ کر وہ ہاتھ روم میں بند ہو جاتی  
تھی اور اس وقت تک باہر نہ نکلتی جب تک چیخنے  
چنگھاڑتے ابا ڈبوڑھی بار نہ کر جاتے۔

ابا کے باہر نکلتے ہی ندا آپا بھاگ کر پانی کا گلاس اماں  
کے منہ سے لگا دیتیں اور ردا انہیں اپنی بانہوں میں بھر  
کر اپنے ساتھ لگا کر دھیرے دھیرے چھپتی رہتی۔  
جبکہ پورے صحن میں ٹوٹے ہوئے گلاس کی  
کرچیوں، آوندھی بڑی میز اور یہاں سے وہاں تک  
پھیلے کھانے کے داغ دھبوں کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا کہ  
وہ بھی ابا کی دکان کی ساری چیزوں کو جا کر یو سی الٹ  
پلٹ کر دے۔ نہ جانے انہیں اتنا غصہ کیوں آتا تھا؟

کوئی بھی خلاف مزاج بات ان کا پارہ ساتویں آسمان  
پر چڑھا دیتی اور پھر ان کے مزاج بھلا ملتے ہی کہاں تھے۔  
گھر کے اندر قدم رکھتے ہی ان کے ماتھے پر ہمہ وقت  
پڑے بلوں میں ایک دم اضافہ ہو جاتا۔ ان کی ایک ہی



سیدھی کرنے کا نام مل ہی جاتا۔

”بڑا مشکل وقت آن پہنچا ہے۔ مجھ سے ”تعاون“ کرو گے تو ٹھیک ورنہ مجھ سے اب یہ جنجال نہیں پالا جاتا۔ بہت عیش کروائے تم لوگوں کو۔“ ابا اکثر ہاتھ جھاڑ کر بے نیازی سے کہتے تو اس کے منہ میں نوالہ پھنس کر رہ جاتا۔ کریانے کی اچھی خاصی چلتی دکان سے آنے والا پیسہ وہ اپنے دوستوں اور اللہ تلے میں اڑا دیتے۔

ندا آیا کی شادی ہوئی تو وہ بہت خوش تھی کہ چلو کسی ایک کو تو اس کھٹن زدہ ماحول سے نجات ملی۔ لیکن

بہت قلیل عرصہ میں آپا کی آنکھوں کے بجھتے ستارے اور پھکی پڑتی مسکراہٹ نے اسے بادور کرا دیا کہ ریاض بھائی ابا جیسے نہ سہی پر ان سے کچھ مختلف بھی نہیں ہیں۔ آیا آئے دن ان کا ”فرمانشی پروگرام“ لے کر ہڈی ہال سی حاضر ہو جاتیں۔ ابا سے توقع رکھنا عبث تھا۔ چنانچہ اماں ہی پانی پانی جوڑ کر جمع کیے ہوئے پیسوں میں سے کچھ آیا کے ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ کبھی یہ تو بھی وہ ان کی فرمائشوں اور دھمکیوں کی کوئی حد نہیں تھی وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت کڑھتی تھی۔

”آپا! یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے اسی دن ان کا منہ توڑ دینا تھا جب وہ آپ سے پہلی بار اس قسم کا تقاضا کر رہے تھے کم از کم انہیں کچھ تو غیرت آتی۔“

آپا کی زرد پڑتی رنگت اور شرمندگی کے مارے جھٹکا سر دیکھ کر اس کا دل چاہتا کہ ریاض بھائی کا منہ نوج لے اسی لیے اپنی بیویوں کو پیروں کی جوتی سمجھنے والے میروں کو وہ اپنی جوتی کی دھول کے برابر بھی نہیں سمجھتی تھی۔ اور اماں کو اس کی انتہا پسندی سے بہت خوف آتا تھا۔

☆ ☆ ☆

”سمجھا دو اپنی صاحب زادوں کو میرے گھر میں یہ بے ہودگی نہیں چلے گی۔ اپنی حد میں رہیں ورنہ جوتی سے پکڑ کر سب کو نکال باہر کروں گا۔“ ابا کی تنفر بھری آواز

رخصت ہوتی زرد شام کو مزید اس کر رہی تھی۔ ”تم نے ابا سے کچھ کہا ہے؟“ حنا نے ویڈیو کھیلے احد سے پوچھا۔

”آپا! وہ! احد ایک دم گڑبڑا گیا۔“

”سچ سچ بتاؤ تم نے ابا سے کیا کہا ہے؟“ حنا بڑبڑا

”ابا نے پوچھا تھا کہ میرے گھر سے باہر جانے کے بعد تمہاری جنمیں اکیلے کمرے میں بیٹھ کر کیا کرنا ہیں۔ اگر تم مجھے سچ سچ بتاؤ گے تو میں تمہیں تمہارا پسند کی آس کریم کھلاؤں گا۔“

”پھر میں نے ابا سے کہا کہ چھوٹی آپا کی وی رجا سینا کی ریلنگ دیکھتی ہے اور۔۔۔“ وہ خالی خالی نظروں سے اپنے دس سالہ بھائی کو دیکھ گئی۔ باہر ابا اس ذات کے پرچے اڑا رہے تھے۔ وہ کاتوں پر ہاتھ رکھ وہاں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔

ابا کے کلف لگے سوٹ کو جما جما کر استری کرتی رہنے بہت دکھ سے اسے دیکھا اسے بھی اس وقت اندازہ اتنی ہی تو بہن محسوس ہوتی جب وہ ڈیوڑھی کے کمرے میں بڑی بالٹی کے ارد گرد بکھرا کوڑا اکٹھا کرنے میں مگن ہوئی تو ابا بہت اچانک دروازہ کھول کر گلی میں جھانک کر اسے ”رنگے ہاتھوں“ پکڑنے کے لیے چھلے مارتے۔ ”نہ جانے لوگوں کے ذہن میں اتنا گند کہاں سے آجاتا ہے؟“ وہ گند اگلتی بالٹی پر نظر جمائے سوچتی چلا جاتی۔

☆ ☆ ☆

اسے اپنی نظروں پر دھوپ کے کاگمن ہوا۔ یا شاید یقین ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عدیل بھائی کسی الزام ڈرن لڑکی کے ساتھ عین اس کی آنکھوں کے سامنے موٹر بائیک زن سے اڑاتے ہوئے گئے تھے وہ دھول اڑاتے رستے پر نظریں جمائے ساکت کھڑی رہی آند اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے آگے بڑھی ان کے روٹ کی وین آگئی تھی۔

”گھر پہنچ کر چپرس اٹھا بیچ کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن جب غصہ کسی طور پر کم نہ ہوا تو ردا کے سامنے پھٹ پڑی۔“

”آج میں نے عدیل بھائی کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔“ مشین پر جھکی ردا ذرا انگلی پھر اپنے کلام میں مصروف ہو گئی۔

”پھر؟“

”پھر؟ یعنی کہ تمہیں یہ بات سن کر کوئی شاک نہیں لگا؟“ صدے کے مارے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ”ان کی ایک نہیں بلکہ کئی ایک گرل فرینڈز ہیں اور یہ بات میں بہت پہلے سے جانتی ہوں۔“ ردا بے تاثر لہجے میں کہتی دانتوں سے دھاگہ توڑنے لگی۔ حنا بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے وہ شادی کے بعد چیخ ہو جائیں گے؟“ اس کے لہجے میں پھر سے آس کھل گئی تھی۔ ”نہیں، مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ مرد کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔“ نہ جانے عورتیں اتنے اہم معاملے میں بے حس کیوں ہو جاتی ہیں؟ یا شاید جو بات ان کے بس میں نہیں ہوتی اس کے متعلق بے حسی کی ردا اوڑھ کر یونہی لا لعلق ہو جاتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

حنا بہت دکھ سے اپنی بہن کی غم آلود لرزتی پلکیں دیکھ گئی۔ جن عورتوں کو باپ کی شفقت، بھائیوں کا ملن اور شوہر سے عزت و محبت نہ ملے ان کی ذات کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند ہوتی ہے جسے ہوا جہاں چاہے اڑا کر لے جائے۔

سے ٹیک لگائے بے نیازی سے کھانا کھاتے رہے گویا ان کی بات سنی ہی نہ ہو۔



”بس کر دس اماں! اور کتنا ذلیل کروائیں گی خود کو ہمارے لیے؟ مجھے ایسا جیز نہیں چاہیے۔“ ردا سے برداشت نہ ہوا تو اماں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر سک اٹھی۔

”کچھ سنا میری بیٹی کیا کہہ رہی ہے؟ اسے جیز میں کچھ نہیں چاہیے۔ ارے وہ بھی تو لوگ ہوتے تھے جو دو کپڑوں میں بیٹیوں کو رخصت کر دیتے تھے اور تم ویسے تو بڑی صوم و صلوة کی پابند بنتی ہو اور دنیا داری کا اتنا خیال ہے؟“ ابا اپنے مطلب کی بات نکال کر مسخرانہ لہجے میں بولے۔

حنا نے اپنے ایم اے انگلش کی ایڈمیشن فیس اور ٹیوشنز سے ملنے والی رقم بہت خاموشی سے لا کر اماں کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ابا کی غیر جانبداریت اور اکلوتے

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

## میں عبد القادر ہوں

شروع و تہ

قیمت - 225 روپے

12 کا پتہ

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021



بیٹے کی کم سنی کی بنا پر اماں نے فرنیچر پسند کرنے اور خریدنے کی ذمہ داری ریاض بھائی کے سپرد کر دی۔  
 ”خالہ جی! ندا کی دفعہ تو آپ نے اتنا سامان نہیں دیا تھا جو ردا کو دے رہی ہیں۔“ ریاض بھائی بظاہر ہنس کر بول رہے تھے لیکن اماں ان کی بات میں چھپے مفہوم سے اچھی طرح واقف تھیں۔ حنا نے چائے پیونے کے سے انداز میں ان کے سامنے رکھی۔ ندا آیا دہل کر اسے دیکھنے لگیں۔ اس کی ایسی جذباتی حرکتیں اکثر بعد میں ان پر بہت بھاری بن کر گزرتی تھیں۔  
 ”ریاض بھائی! آپ نے بچپن میں وہ والی کہانی تو سنی ہوگی؟“ اس نے اماں کی مہجی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سے اچانک پوچھا۔

”کون سی؟“

”وہ جس میں ایک درویش کسی مفلس کو سرمہ دے کر کہتا ہے کہ اگر ایک آنکھ میں ڈالو گے تو دنیا جہاں کے خزانے نظر آئیں گے۔ لیکن دوسری آنکھ میں مت ڈالنا ورنہ اندھے ہو جاؤ گے۔ لیکن مفلس نے لالچ میں آکر دونوں آنکھوں میں سرمہ ڈال دیا نتیجتاً ”اندھا ہو گیا کیونکہ لالچ کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے“ ہے نا؟“ وہ معصومیت سے بولتی انہیں بہت کچھ جتا گئی تھی جبکہ بد مزاج شوہر کے ماتھے پر پڑتی سلوٹیں ندا آپا کو اپنی پیشانی کا نا دیدہ پسینہ پونچھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

اور بہت چپکے سے ردا اس گھر سے رخصت ہو گئی اور اپنے پیچھے ڈھیر ساری اداسی چھوڑ گئی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید بیٹیوں کے چلے جانے کے بعد ابا کو ان کے وجود ان کی اہمیت کا احساس ہو جائے لیکن ردا کی شادی کے دوسرے روز جب اماں بہت خاموشی سے اس کی مشین پر انگلی پھیر کر اس کے لمس کو محسوس کر رہی تھیں کہ ابا نے پھر سے کسی معمولی بات پر ہنگامہ کھڑا کر کے ان کے خیالات اور حنا کی خوش فہمی کا شیرازہ بکھیر دیا۔

\*\*\*

ایسے ہی روکھے پھیکے دنوں میں خالہ رشیدہ کے

توسط سے اس کے لیے ایک متمول گھرانے کا رشتہ آیا۔ اماں عجب شش و پنج میں گرفتار تھیں۔ بیٹی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں اور زمانے کی ریت رواج سے بھی۔ اور مشکل میں تو وہ خود بھی گرفتار تھی جو کسی حاکم پسند مرد کی ”محکوم“ بن کر زندگی بسر کرنے سے نا عمر کنواری رہنا بہتر سمجھتی اور وہ ایسا کر بھی گزرتی لیکن ابا اب کسی ”بوجھ“ کو مزید اپنے سینے پر مونگ دلتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک طرف کنواں دوسری طرف کھالی اس نے سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا اور پھر سارے معاملات یکے بعد دیگرے بطریق احسن طے ہوتے چلے گئے۔

رخصت ہوتے سے اس کاشت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابا کے سینے سے لگ کر ڈھیر سارے آنسو بہا دے اور وہ کسی شفیق باپ کی مانند اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعاؤں کے سنگ اسے رخصت کر دیں۔ آہ! لیکن ابا سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس دولہا والوں کے ساتھ آنے والے مووی میکر سے مختلف پوز بنا بنا کر مووی بنواتے اور تصویریں کھنچواتے رہے۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر سارے آنسو اندر اتار لیے۔

گزرتے ماہ و سال میں اپنے آپ کو ایک خول میں مقید کرنے کے باوجود وہ اتنا تو جان چکی تھی کہ ”اسد رحمان“ اس کی زندگی میں آنے والا سب سے مختلف سب سے منفرد اور سب سے خاص انسان ہے۔ جو بنا کہے اس کے دل کی ہر بات جان لیتا ہے۔ جس کی موجودگی اس کے لیے کسی گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہے اور جو اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کی ذات کو ڈیفنڈ (Defend) کر کے اسے اپنی ہی نظروں میں معتبر کر دیتا ہے۔ لیکن وہ پوجے جانے کے لائق اپنے شوہر کو یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ اس پر ”اعتبار“ کرتے ہوئے اب بھی ڈرتی ہے۔ لیکن اس سے محبت کرنے سے بھی خود کو روک نہیں پارہی۔

\*\*\*



خون ہی خون تھا قاتل کے ہر اک گوشتے میں  
ڈر کے قاتل سے میں سر اپنا کدھر رکھ دیتا  
اذان کے دل و دماغ میں ایک چھٹکا سا ہوا تھا۔  
جیسے اچانک کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ ایک عجیب سی گونج تھی۔  
جس نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔  
فہیم کی آواز اسے صدائے بازگشت کی طرح  
چاروں طرف سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔  
الفاظ اس کی سماعتوں کو مجروح کر رہے تھے۔ اس کے  
پورے وجود کو زخمی گئے تھے۔ اذان نے اپنی اس  
بے ساختہ کیفیت پر غور کیا تو اسے ایک عجیب سے احساس  
نے آگھیرا۔ خوف کا احساس۔ ایک عجیب سا ڈر  
تھا۔ کسی کو کھودینے کا ڈر۔ ڈر جو ایک سائے کی طرح  
انسان کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔  
نئی نئی خواہشیں، نئے نئے اندیشے پیدا کرتی ہیں۔  
نئے نئے اندیشے، نئی نئی خواہشیں تخلیق کرتے ہیں اور  
خواہش کے اوجہ وارہ جانے کا پورا نہ ہونے کا ڈر تو ہر  
خواہش کے باطن میں چھپا ہوتا ہے۔ لیکن ڈر اور  
خوف کے باوجود انسان خواہش کا دامن نہیں چھوڑتا  
یہ انگ بات ہے کہ چھن جانے کا احساس اسے خوف  
زدہ کرتا ہی رہتا ہے وہ خوف جو ایک مفروضہ ہے۔ وہ  
الہیہ جو ابھی رو نما ہی نہیں ہوا۔ اندیشہ ہی تو کھلائے  
مگ مستقبل صرف خواب ہی تو ہے۔ خوف ناک ہو یا  
حسین، محتاج تعبیر ہے۔ ماضی کتنا ہی بھیاں کیوں نہ  
ہو ایک تصویر ہی تو ہے، بے جان تصویر۔ حقیقت  
صرف حال ہے۔ حال زندگی ہے۔ جو ہوا سو ہو چکا اور  
جو ہونا ہو وہ ہو جایا کرتا ہے۔ خوف کسی خطرے کو ٹال تو

نہیں سکتا؟  
صرف خوف زدہ رہنے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں  
ہوتا؟ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عمل کے لیے  
خوف سے نجات کی تو اذان نے کبھی عمل کیا۔ اپنے  
آپ کو سنبھالنے کا عمل۔ اور جلد ہی وہ اپنے اس عمل  
میں کامیاب ہو گیا۔  
اس کے لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آکر  
معدوم ہو گئی۔ پھر وہ اپنے اسی مخصوص دلکش لہجے  
میں فہیم سے مخاطب ہوا۔  
”مائی ڈیر رانا فہیم! سجدے سے انکار کرنے والا  
حسن آدم سے بے خبر ابلیس محبت سے محروم تھا۔ وہ  
رحمت الہی سے مایوس ہوا تو مردود قرار دے دیا گیا۔  
ابلیس کا محبوب تو تھا۔ مگر محبوب کوئی نہیں تھا اور کعین  
ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ انسان کی محبت کے بغیر  
اللہ کا سجدہ انا کا سجدہ ہے۔“  
انسٹی ٹیوٹ کے ریسکون ماحول میں صرف اذان کی  
گہیر آواز گونج رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں جو  
مقتناطیسی کشش تھی اور اس کی ذات کے گرد جود لکشی  
کا ہالہ تھا۔ اس سے وہاں موجود ہر شخص متاثر تھا۔ اس  
کی شخصیت بڑی مغلوب کر لینے والی تھی۔ فہیم نے  
اس کی شخصیت سے خائف ہوتے ہوئے اس کی بات  
توجہ سے سننے کا پوز دیا۔ جو اپنے اسی دلکش لہجے میں  
بول رہا تھا۔  
”بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تو انسان سے محبت  
کرتا ہے۔ ابلیس اور اس کے پیروکار انسان سے محبت  
نہیں کرتے اور کبھی کیسے سکتے ہیں۔ انسان سے محبت

وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ کی محبت ہو اور  
جس پر اللہ مہربان ہو۔“  
فہیم جو بظاہر بڑے انہماک سے اذان کی گفتگو سن رہا  
تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر عجیب سے انداز میں گویا

ہوا۔  
”دھت تیرے کی۔ پھر فلسفہ۔ آدھا گھنٹہ لیکچر  
جھاڑا ہے۔ مجال ہے جو ذرا سمجھ آئی ہو۔ گل بیتی  
ہے۔ آخر تم کتنا کیا چاہتے ہو۔“  
اس کی بات سن کر اذان پھر مسکرایا اور بولا۔  
”مطلب سمجھ میں آتا تو آج تم اذان فیضی کی جگہ  
کھڑے ہوتے۔ خیر میں ایک اور کوشش کرتا ہوں  
اور تمہیں ایک لطم سنا تا ہوں۔ شاید تم سمجھ سکو۔“  
خلوص سجدہ سجود عنقا  
محببتوں کا وجود عنقا  
وہ سچے جذبے سے ملنے والے  
خوشی کے پنچھی چمکنے والے





جواب تو نایاب ہوئے ہیں  
اندھیری راتوں میں کھو گئے ہیں  
وہ آرزو میں دھنک میں لپٹی  
وہ صورتیں چاندنی میں سمٹی  
انہرستی کی زد میں آکر  
منافقت کی سناں کے نیچے  
ہر ایک لمحہ  
سک رہی ہیں  
تمام سوچیں  
دبک رہی ہیں  
تو کاش کوئی پیام لائے  
محبوبوں کے سلام لائے  
کہیں سے بارہ و جام لائے  
کوئی سہانی سی شام لائے  
تو پھر شکستہ وجود میرا  
بنام چاہت دوام پائے  
مگر یہ ممکن نہیں ہے شاید  
کہ دور حاضر کی نفسا نفسی میں  
معجزوں کا ظہور عنقا  
بتوں کی صورت میں نور عنقا  
اذان کی آواز گونج کر خاموش ہو گئی تھی۔

ایک گہری خاموشی انسٹی ٹیوٹ کی دیواروں پر چھا  
گئی۔ لگتا تھا کسی نے جادو کی چھتری گھما کر سب کو پتھر کا  
کر دیا ہو۔ اس سکون میں صرف وال کلاک کی مدھم  
سی ٹک ٹک اس خاموشی کو مجروح کر رہی تھی کہ  
اچانک ماحول جاگ گیا۔  
”واہ! واہ! واہ! کیا کہنے۔ کیا ہی خوب  
صورت نظم ہے۔“ عبداللہ علی اور ولیکا نے  
بے ساختہ داد دی۔ اذان نے استفہامیہ نظروں سے فہیم کی  
طرف دیکھا جو برا سامنہ بنائے میں نہ مانوں کی پالیسی پر  
عمل پیرا ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا۔  
”بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ اذان نے ایک طویل  
سانس لی اور اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔  
”ہاں میں جانتا ہوں۔“

مرد ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر  
پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے چہر  
لمحوں کو رکاوٹ بولا۔  
”پنجابی میں کسی نے کیا خوب کہا ہے۔“  
”کل سمجھ لئی تے رولا کی؟“  
ایسہ رام رحیم تے مولا کی؟  
اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

\*\*\*

”اس وقت کون آگیا؟“ زارا جو ابھی بھی گھر کی  
صفائی وغیرہ سے فارغ ہوئی تھی اور کھانا پکانے کے  
ارادے سے کچن کی طرف بڑھی تھی کہ بیرونی  
دروازے کی دستک پر چونک کر رکی اور خود سے سوال  
کیا۔

بڑوسیوں میں سے کوئی اب تک ان کے گھر نہیں  
آیا تھا۔ فرزان کے آنے کا یہ وقت نہیں تھا۔ وہ رات  
گئے ہی گھر واپس لوٹا تھا۔ ابھی وہ اسی خیال میں گم تھی  
کہ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس دفعہ دستک میں تیزی  
تھی۔

”اوہ شاید امی ہوں۔ اتنی گرمی میں باہر کھڑی  
ہوں۔“ اس خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے دروازے  
کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً  
پوچھا۔  
”کون؟“

”حنانو۔“ باہر سے سر ملی سی آواز سنائی دی اور  
زارا نے حیرت زدہ سے انداز میں دروازہ کھولا تو حنانو  
اور ہمانور کے چہرے نظر آئے۔ زارا کو حیرت اس بات  
پر تھی کہ دونوں کو اس جگہ کا پتا کیسے چلا اور اس کی حیرانی  
اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔

”کیا ہمارے سینک نکل آئے ہیں؟“ ہمانو نے اپنے  
سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے ساختہ سوال کیا۔  
”نک۔ کیا مطلب۔“ زارا نے گھبرا کر پوچھا۔  
”اوہ ہوسہ مطلب یہ کہ اتنی حیران پریشان کیوں  
ہو؟ ایسے دیکھ رہی ہو جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو؟ یا

یادداشت گم ہو گئی ہے کیا؟ اگر تھوڑی دیر اور دروازے  
پر اسی طرح ظالم سانج بنی کھڑی رہیں تو اس گرمی سے  
ہمارے دماغ ضرور پکھل جائیں گے۔“ ہما کے بجائے  
حنانے اپنے مخصوص شرارتی انداز میں کہا۔  
”اوہ سوری۔ دراصل تمہاری اچانک آمد نے  
مجھے حیران ہی اتنا کر دیا کہ میں۔۔۔ آؤ آؤ اندر آؤ۔“  
زارا نے شرمندہ سے انداز میں ایک طرف ہٹ کر  
انہیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔

کمرے کے ٹھنڈے ماحول میں ان دونوں کے  
اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو انہوں نے بیڈ پر بیٹھ کر  
ٹانگیں پھیلا لیں۔ زارا ان دونوں کو ہٹھا کر کچن کی  
طرف چلی گئی تھی۔ ہمانو دوپٹہ سے ماتھے پہ آیا پسینہ  
پونچھ کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔

”یہ لو ٹھنڈا ٹھنڈا شربت پی کر خود بھی ٹھنڈی  
ہو جاؤ۔“ زارا تین گلاسوں میں شربت لے آئی تھی۔  
ان دونوں کی طرف بڑھا کر خود بھی اپنا گلاس لے کر  
کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اچھا باقی باتیں کرنے سے پہلے میری الجھن دور  
کرو۔ یہ بتاؤ اس گھر کا ایڈریس تمہیں کس نے بتایا۔“  
زارا نے شربت کے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے  
پوچھا۔

”قمر بھائی چھوڑ کر گئے ہیں۔ جس دن تمہارا سامان  
اس گھر میں شفٹ ہوا تھا تو سامان شفٹ کرنے والوں  
میں قمر بھائی بھی شامل تھے۔“

ہمانو نے تفصیل سے جواب دیتے ہوئے ایک لمحے  
کے لیے توقف کیا تو زارا نے ایک طویل سانس لی۔ قمر  
فیضان فیضی کا شکر د تھا اور فرزان کا دوست بھی۔

”اصل میں ہم لوگ بلوچستان جا رہے تھے۔ سوچا  
تم سے الوداعی ملاقات کر لیں۔“ ہمانو نے اپنے آنے کی  
وجہ بیان کی۔

”خیر سے جا رہی ہو بلوچستان۔“ زارا نے استفہامیہ  
انداز میں پوچھا۔

”ہم دونوں کی وہاں جاب ہو گئی ہے۔ تعلیم  
فاؤنڈیشن گرلز اسکول میں بطور ٹیچر دونوں نے اپلائی کر

رکھا تھا۔ وہاں سے کال لیٹر آگیا ہے۔“ حنانے فخریہ  
انداز میں کہا۔

”گڈ نیوز۔ یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ وہاں جا کے  
سیٹل ہونے کے بعد مجھے بھی بتانا۔ وہاں کا ماحول،  
مرامات وغیرہ۔ شاید فرزان مجھے اجازت دے دیں تو  
میں بھی اپلائی کروں۔“ زارا نے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ تم اپنا سیل نمبر وغیرہ دے دو۔  
وہاں جا کے فوراً ہی تم سے رابطہ کریں گے۔“ ہمانو نے  
تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ زارا اٹھ کر کانڈ پین  
تلاش کرنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک  
سنائی دی۔

”اوہ اب کون آگیا۔۔۔ آج تو لگتا ہے مہمانوں کا اور  
میرے حیران ہونے کا دن ہے۔“ زارا نے مسکرا کے  
کہا۔

”یار حیران بعد میں ہونا پہلے جا کر دروازہ کھولو۔ اتنی  
گرمی میں باہر کھڑا ہونا ایک امتحان ہے۔“ حنانے زارا  
کو ٹوکا تو زارا کانڈ تلاش کرنے کا ارادہ چھوڑ کر  
دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی  
ذکیہ بیگم کی آواز سنائی دی۔  
”دروازہ کھولو بیٹا۔“

زارا نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ان سے  
سلام دعا کر کے پیار لے کر وہ انہیں بھی اسی کمرے میں  
لے آئی۔

”السلام علیکم آنٹی۔“ حنانے ہمانو کے کھڑے ہوتے  
ہوئے ایک ساتھ سلام کیا۔ ذکیہ بیگم نے قریب آکر  
دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں دعاؤں سے  
نوازا۔

”باہر بہت گرمی ہے نا؟“ حنانے ذکیہ بیگم کے  
سرخ چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں بیٹا جون، جولائی کے مہینے میں تو آگ ہی برسا  
کرتی ہے۔ شام میں ٹھنڈک ہو جاتی ہے تو سکون ہوتا  
ہے۔“

زارا ان کے لیے بھی شربت بنا لائی تھی۔ انہوں  
نے مسکراتے ہوئے گلاس لے کر زارا کو دعا دی۔



”اللہ جزائے خیر دے۔“ اور گلاس ہونٹوں سے لگالیا اور گھونٹ گھونٹ شربت پیتی رہیں۔  
 ”چھا زار اب ہمیں اجازت دے۔ ابھی ہمیں بہت سارے کام کرنے ہیں۔“  
 ”ارے یہ کیا بات ہوئی۔ میں آئی اور تم لوگ اٹھ کھڑی ہوئیں، بیٹھو تم لوگ۔“ ذکیہ بیگم نے شفقت سے کہا۔

”ہاں نا! میں بس کھانا پکانے ہی جا رہی تھی کھانا کھا کے جانا جب تک گرمی بھی کچھ کم ہو جائے گی۔“ زار نے محبت سے کہا۔  
 ”نہیں آئی ہم لوگ بہت دیر سے آئے ہوئے ہیں۔ آپ لوگ باتیں کریں۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ ہمارے شائستگی سے کہا۔

”او کے زار! تمہارا کھانا ادھار رہا۔ اگلی بار آئیں گے تو ضرور تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے مزے دار کھانے کھائیں گے۔“ حنا نے زار کے گلے لگتے ہوئے شرارت سے کہا۔ زار ابھی مسکرا دی۔  
 ”میں پیچ کے رابطہ کروں گی۔ اپنا نمبر تو لکھوا دو۔“ حنا نے یاد دلایا اور زار اجلدی جلدی کاغذ پر اپنا اور ان کا نمبر نوٹ کرنے لگی۔

ان دونوں کو رخصت کر کے زار اندر آئی تو ذکیہ بیگم کو دیکھ کر اسے خیال آیا۔ وہ اس وقت غیر متوقع طور پر کیسے آگئیں۔ کچھ دن پہلے ہی تو وہ ہو کر گئی تھیں۔ سامان وغیرہ دے کر۔

”می آپ آرام سے یہاں بیٹھ جائیں میں کھانا پکانے جا رہی تھی یہ بتائیں کیا کھائیں گی۔“  
 ”ارے کھانے والے کو چھوٹے۔ تم یہاں میرے پاس بیٹھو میں تو ترس گئی ہوں لوگوں سے بات کرنے کو۔ تنہائی سی تنہائی ہے۔“ ذکیہ بیگم بھرائے لہجے میں بولیں۔

”چھا ٹھیک ہے۔ مگر کھانے کا نام ہو رہا ہے مجھے پتا ہے آپ نے کچھ نہیں کھایا ہے میں بس دو منٹ میں سالن چڑھا کے آتی ہوں پھر دھیر ساری باتیں کروں گی آپ سے؟“ زار نے ان کا ہاتھ پیار سے

سہلاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔  
 ”اف اتنی گرمی میں پچی چولہے کے آگے کھڑی ہوگی۔“ وہ بیڑا میں۔  
 ”ایک تو اس گرمی نے برا حال کر دیا ہے۔ انہوں نے پتھے کی طرف دیکھا جو ست رفتاری سے چل رہا تھا۔“



گرمی لگی تو خود سے الگ ہو کے سو گئے سردی لگی تو خود کو دوبارہ پہن لیا بیدل لباس زیست بڑا دیدہ زیب تھا پر ہم نے اس لباس کو الٹا پہن لیا

”ہی از فرزانش۔“ شاہ رخ نے فرید خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا تو فرید خان نے پہلی مرتبہ نظر بھر کر بغور فرزانش کی طرف دیکھا۔

سڈول اور مضبوط جسم کا مالک۔ بغیر کنگھی کے بکھرے ہوئے بال، ستواں ناک، فراخ پیشانی، سرخ و سفید رنگت، سرو قد گہری آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک تھی۔ مجموعی طور پر فرزانش ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ لیکن فرید خان کی نظر میں یہ سب کچھ اہم نہیں تھا۔ اس کی دلچسپی کی وجہ اس کے الفاظ اور اس کا لب و لہجہ تھا۔

چائے پینے کے لیے فرزانش استاد اچھو اور شاہ رخ کے ہمراہ ”بابو کینٹین“ میں داخل ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ رات دو بجے ”چائے“ پورے شہر میں سوائے بابو کینٹین کے اور کہاں ملتی؟ یہ واحد شاپ بھی جو چوبیس گھنٹے کھلی رہتی تھی۔

سرشام ہی شاہ رخ آپہنچا تھا۔ جب وہ لوگ کام سے فارغ ہو کر گھروں کو جانے ہی والے تھے باقی سب تو اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ لیکن فرزانش استاد اچھو اور شاہ رخ کا ڈیرہ اسی مخصوص زیر تعمیر عمارت میں جم گیا۔ جوان کی سنگ روم بھی تھی اور گیسٹ روم بھی۔ شاہ

رخ، فرزانش کا کالج کے زمانے کا دوست تھا اور ان دنوں لاہور میں ایک ریسٹورنٹ میں بطور مینجر جاب کر رہا تھا۔ کبھی کبھار گھر آتا تو فرزانش سے ملنے ضرور آتا اور جب بھی آتا ان کی محفل اسی طرح ساری رات جیتی تھی۔

آج بھی چائے کا موڈ بنا تو تینوں بابو کینٹین آہنچے، لیکن جوں ہی وہ لوگ ہال میں داخل ہوئے شاہ رخ کی نظر سائیڈ پر بنے کینن میں براجمان ایک شناسا چہرے پر پڑی تو اس کے قدم رک گئے۔ پھر وہ فرزانش سے مخاطب ہوا۔

”آؤ آج تمہیں تمہارے جیسے ایک اور سر پھرے سے ملو نا ہوں۔“

پھر دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے سائیڈ میں بنے کینن کی قطار میں سے ایک کینن میں داخل ہو گئے۔ فرید خان نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور نہایت شائستگی سے مخاطب ہوا۔

”اور کیسی گزر رہی ہے آپ سب لوگوں کی۔“ اور اس کے جواب میں فرزانش نے بیدل حیدری کے دو شعر سنائیے۔

ساتھ ہی شاہ رخ نے اس کا تعارف کروایا تو فرید خان چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

”اچھا تو یہ ہیں فرزانش فیضی صاحب۔“ اور اس مرتبہ چونکنے کی باری فرزانش کی تھی۔ اس نے حیرت سے فرید خان کی طرف دیکھا پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”میرے خیال میں ہم اس سے پہلے کبھی نہیں ملے۔“

فرید خان کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی جو غالباً ”اس کی شخصیت ہی کا حصہ تھی پھر وہ بولا اور اس کی مسکراہٹ کی طرح اس کے الفاظ بھی پراسراریت لیے ہوئے تھے۔

”لیکن اس کے بعد ضرور ملتے رہیں گے۔“ فرزانش نے ایک لمحے کے لیے اس کے الفاظ پر غور

کیا پھر مرکز شاہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں دریافت کیا۔  
 ”ان کا تعارف نہیں کرواؤ گے شاہ رخ۔“ شاہ رخ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مسکرا کے جواب دیا۔

میں اس کا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں گے کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔  
 ”بھئی میں ان کا تعارف کیا کرواؤں۔“

فرید خان نے ہاتھ اٹھا کر شاہ رخ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”زیادہ کھبے پر نہیں چڑھاؤ مجھے میں خود اپنا تعارف کروا دیتا ہوں۔“ پھر اس نے فرزانش کی طرف دیکھا اور کہا۔

”نام فرید خان ہے اور تین ترقیاتی تنظیم کی یوتھ ایسیجینج فورم میں بطور والنٹیر کام کرتا ہوں دنیا کے اس ایسیج پر شاید میرا اتنا ہی کردار ہے جو میں بساط بھر ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

فرزانش نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیسے نظروں ہی نظروں میں اسے تولاد۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں اس احتمالہ بات پہ اتفاق نہیں کرتا مسٹر فرید خان۔ یہ دنیا ایک ایسیج ہے نہ ہی ہم کوئی کردار۔ یہ ہم دنیا میں کوئی کردار لے کر نہیں آتے ہم مکمل طور پر بے کردار پیدا ہوتے ہیں ایک سادہ کاغذ۔

جسے ہم اپنا کردار کہتے ہیں وہ دوسروں کی تحریر ہوتی ہے۔“

فرزانش کی بات مکمل ہوئی تو شاہ رخ نے گھبرائے ہوئے انداز میں فرید خان کے چہرے کی جانب دیکھا جو پوری توجہ فرزانش پر مرکوز کیے بیٹھا تھا اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کسی بھی قسم کے تاثرات سے یکسر عاری۔

شاہ رخ نے فرزانش کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ بھی سپاٹ تھا۔ ایک واحد استاد اچھو تھا جو مسلسل خاموش تھا لیکن اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ اس بات



کاشوت تھی کہ وہ ارد گرد سے بے نیاز نہیں تھا۔  
فرید خان یک لخت اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور فرزان کی  
طرف دراز کرتے ہوئے بولا۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی فرزان صاحب۔“  
ایک لمحے کی تاخیر کے بعد فرزان نے بھی اپنا ہاتھ  
برسھایا اور فرید خان کا برسھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔  
لالی میرے لعل کی جت دیکھو تب لال  
لالی دیکھن میں گئی میں بھی ہو گئی لال

☆☆☆

”انسان فطرتاً جلد باز ہے ابھی اس کے خاکی وجود  
میں روح پھونکی ہی گئی تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔  
یہ جلد بازی اس کے خمیر میں ہے وہ فوری طور پر اپنی  
زندگی کو مکمل کرنا چاہتا ہے وہ جلدی جلدی اسے بناتا  
ہے بناتے بناتے بگاڑتا ہے اور زندگی اس کے ہاتھ سے  
یوں نکل جاتی ہے جیسے ہاتھ آیا کبوتر۔ انسان میانہ  
روی کو برداشت نہیں کرتا ایک ہی دن میں بہت  
سارے کام ختم کرنا چاہتا ہے کیا زندگی کمانے کھانے  
پینے اور سونے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کیا زندگی کے  
تقسیم میں فرصت نہیں۔ کیا ہمارے پاس کسی کے  
آنسو پونچھنے کا بھی وقت نہیں۔“

ہم ہر انسان کو اپنی ضرورت اور فائدے کی حد تک  
جانتے ہیں۔ کیا انسان انسانوں کو انسانیت کے حوالے  
سے کبھی نہیں پہچانے گا۔ وہ کون لوگ تھے جو خود پیاس  
سے مر جاتے تھے اور پانی اپنے دو سرے پیاسے بھائی کو  
دے جاتے تھے۔ کیا وہ لوگ تھے بھی یا یہ صرف ہمارا  
وہم ہے۔ آخر ہم کب سمجھیں گے کہ جو چیز چلنے سے  
حاصل نہیں ہوتی وہ ٹھہرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔  
آخر ہم کیوں نہیں سمجھتے کہ مصروفیت غلامی ہے اور  
فرصت آزادی۔“

اذان درتے میں کھڑا بہت دیر سے گہری سوچ میں  
گم تھا۔ دن بھر کی سخت گرمی کے بعد ایک گرم گرم  
زروری مائل دم کھونٹ سینے والا دھواں سا چاروں  
طرف پھیلا ہوا تھا۔

آسمان صاف تھا ایک بھی ستارہ نظر نہیں آ رہا تھا نہ  
ہی کوئی پرچھائیں پڑ رہی تھی جب وہ درتے میں کھڑا  
ہوا تھا تو رات میں تبدیل ہوتی شام خاموش اور افسردہ  
تھی اسے کھڑے کھڑے اور خیالوں میں کھوئے نہ  
جانے کتنی دیر ہو گئی تھی چاروں طرف پھیلے خوابیدہ  
سکوت نے اسے احساس دلایا تھا کہ رات گہری ہو گئی  
ہے اس نے خیالات کی ڈور وہیں سے باندھنی چاہی  
جہاں سے ٹوٹی تھی کہ ہلکی سی دستک پر اس نے بے  
ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا اور پھر بڑھ کر دروازہ  
کھول دیا۔

ذکیہ بیگم کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ مگر  
خاموشی سے اس نے ایک طرف ہو کر انہیں اندر  
آنے کا راستہ دیا۔ رات کے اس پہر ذکیہ بیگم کی اس  
کمرے میں آمد خلاف معمول تھی اسے تشویش  
ہوئی تھی مگر خاموشی سے ان کے بیٹھنے کا انتظار کرنے  
لگا۔

ذکیہ بیگم بیڈ کے ایک طرف بیٹھ کر اذان کی طرف  
دیکھنے لگیں۔ اذان کو ان کی خاموشی سے الجھن ہوئی۔  
پھر وہ خود ہی ان سے مخاطب ہوا۔

”خیریت امی؟ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی  
ہیں۔“  
ذکیہ بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر دھیرے  
سے بولیں۔

”فرزان نے تو گھر چھوڑ دیا۔ لیکن تم تو گھر میں  
ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے میرا پریشان ہونا تو فطری  
سی بات ہے۔“

ذکیہ بیگم کی بات پر اذان شرمندہ سا ہو گیا۔  
”اوہ۔ معاف کیجیے گا میں آج کل کچھ زیادہ ہی  
مصروف تھا جب ہی آپ کو شکایت ہوئی۔ آئندہ میں  
خیال رکھوں گا۔“

”میں یہاں تمہیں شرمندہ کرنے نہیں آئی۔ میں  
کسی اور مقصد سے آئی تھی۔“  
اس بار اذان نے ذکیہ بیگم کی طرف غور سے دیکھا  
جہاں پریشانی کے گہرے سائے لہراتے نظر آ رہے

تھے۔  
”کیا ہوا ہے امی کچھ بتائیں تو۔“ اذان نے تشویش  
سے پوچھا۔ ذکیہ بیگم نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا  
اور بولیں۔  
”کچھ دن پہلے لاہور سے پروین کا فون آیا تھا کہ اس  
کے شوہر کی طبیعت خراب ہے تمہارے ابو اس کا پتا  
کرنے گئے تھے۔“  
”اوہ۔ مجھے پتا نہیں تھا۔ اب کیسی طبیعت ہے ان  
کی۔ خیریت تو ہے نا؟“

اذان نے شرمندہ سے انداز میں دریافت کیا۔ وہ  
جانتا تھا کہ پروین کی طرح اور بہت سارے لوگ بھی  
فیضی صاحب کے عقیدت مند تھے اور مختلف  
معاملات میں ناصرف ان سے دعا کے خواستگار رہتے  
تھے بلکہ اکثر امور میں ان سے مشاورت بھی کرتے  
تھے۔ وہ ابھی ان ہی خیالات میں گم تھا کہ ذکیہ بیگم کی  
آواز سن کر دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”ان کی طبیعت کا تو پتا نہیں۔ میری پریشانی کی وجہ  
کچھ اور ہے۔“

ذکیہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔ اذان کی سوالیہ  
نظریں ان کے چہرے پر ٹپک گئیں۔

”تمہارے ابو دو تین دن میں آنے کا کہہ کر گئے  
تھے۔ لیکن آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں وہ واپس  
آئے ہیں نہ ان کے بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے۔  
ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ تمہارے پاس پروین  
کا نمبر ہو گا تم کل فون کر کے اپنے ابو کی خیریت معلوم  
کر لو۔“

ذکیہ بیگم کا لہجہ نرم ہو گیا۔ اذان نے اپنی بے خبری پر  
خود کو لعنت ملاست کی۔ وہ اٹھ کر ذکیہ بیگم کے قریب  
بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر دیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی فون کر لیتا مگر یہ  
وقت مناسب نہیں میں صبح ہوتے ہی سب سے پہلا  
کام یہ ہی کروں گا۔“ اذان نے انہیں تسلی دیتے ہوئے  
کہا تو ذکیہ بیگم دھیمے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

”خالص مال“ کا گاڑھا اور خالص دھواں پورے  
کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا۔ جس نے ماحول کو بو جھل  
بنار کھا تھا۔ آواز دھویں کے تعاقب میں تھی یا دھواں  
آواز کے تعاقب میں۔ لیکن بہر حال کمرے میں صرف  
فرزان کی آواز گونج رہی تھی۔

دل بے مدعا ہے میں نہیں ہوں  
کوئی دم کی ہوا ہے میں نہیں ہوں  
گلستاں ہے گھٹا ہے میں نہیں ہوں  
نسیم جاں فزا ہے میں نہیں ہوں  
بقید ابدیت مشتاق میں ہوں  
با اطلاقا خدا ہے میں نہیں ہوں

فرزان خاموش ہوا تو کمرے میں کچھ دیر چاروں  
طرف کھوکھلی سی خاموشی رقص کرتی رہی اس خاموشی  
کو دروازے پر ہونے والی دستک نے مجروح کیا تھا۔

محبوب خان کے اس کمرے میں محبوب خان کے  
علاوہ اس وقت فرید خان، فرزان اور استاد اچھو بھی  
موجود تھے۔ ان دنوں فرزان اور محبوب خان کی  
ملاقاتوں میں کافی ”برکت“ پیدا ہو چکی تھی۔ اگر  
محبوب خان اس سے ملنے نہیں آتا تو فرزان خود اس  
کے پاس آ جاتا تھا بہر حال میل ملاقات میں کچھ افاقہ  
ضرور ہوا تھا۔

کمرے میں چاروں طرف کثیف سا دھواں چکراتا  
پھر رہا تھا۔ دستک کی آواز پر مشتبہ نظروں سے سب ہی  
نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا سب کے چہروں پر عجیب  
سے تاثرات تھے۔ ان میں فکر اور پریشانی کا عنصر نمایاں  
تھا۔ اس بے وقت دستک کے بارے میں کوئی بھی یہ  
اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ آنے والا کون ہے۔

”کون ہو سکتا ہے اس وقت؟“ استاد اچھو نے  
پریشانی سے کہا۔ فرزان نے چونک کر استاد اچھو کو دیکھا  
پھر اس کی نظر فرید خان پر پڑی جس کے ہونٹوں پر ایک  
پراسرار مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ فرزان کا ہاتھ  
ٹھنکا۔ ایک واحد فرید خان تھا جو مکمل طور پر پرسکون تھا  
باقی سب ہی حواس باختہ دکھائی دے رہے تھے۔ فرزان  
کی سوالیہ نظریں فرید خان کے چہرے پر جم گئیں۔ فرید



خان کی نظریں فرزان کی نظروں سے ٹکرائیں تو اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ شاید وہ فرزان کی خاموش نظروں میں چھپے ہوئے سوال کو سمجھ چکا تھا۔

”مس نیلم شیراز ہوں گی۔“ فرید خان نے پرسکون انداز میں کہا۔

فرزان کا دل غمگین ہو گیا۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ تلخ لہجے میں بولا  
 ”ان کا یہاں کیا کام؟“

”میں نے بتایا تھا کہ آج محبوب خان کے ہاں ہم لوگ بیٹھیں گے۔ تم نے تو ملاقات سے انکار کر دیا۔ مگر مس نیلم کو تم سے ملنے کا اشتیاق ہی اتنا تھا کہ شاید وہ خود یہاں پہنچ گئی ہیں۔“

فرزان کے ذہن میں فرید خان کی باتیں گونجنے لگیں۔ جب کیمین میں بیٹھتے ہوئے فرزان نے فرید خان سے سوال کیا تھا کہ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں تو جواب میں فرید نے کہا تھا۔

صرف میں ہی نہیں بلکہ ہماری تنظیم کی پوری باڈی آپ کو جانتی ہے۔ ہماری ڈسٹرکٹ کو آرڈینیشن مس نیلم بہت عرصے سے اس بات کی خواہش مند ہیں کہ کسی بھی طرح آپ کو تنظیم میں شامل کیا جائے اور یہ ہی نہیں تنظیم کے ہیڈ سرورڈاری تک بھی آپ کے حوالے سے کالی سفارشات پہنچی ہیں اور بحیثیت ایک رائٹروہ بھی آپ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔

پچھلے دنوں ہماری ایک میننگ میں شاہ رخ بھی شریک ہوا تھا۔ جہاں معاشرے کی فلاح و بہبود کے حوالے سے ایک سیمینار منعقد کیے جانے کے حوالے سے ڈسکشن کی گئی تھی۔ تو شاہ رخ نے بتایا تھا کہ اس حوالے سے ایک بہت اچھے رائٹروہ ہمارے اپنے ہی شہر میں موجود ہیں جو بہت اچھا فیچر بھی لکھ سکتے ہیں اور نیو جنریشن کی اصلاح کے لیے خاصا کڑی ایڈوورک کر سکتے ہیں۔ تو مس نیلم کی نظریں شاہ رخ کے چہرے پر جم گئی تھیں اور ان کے ہونٹوں سے ایک ہی جملہ سرسرا تا ہوا نکلا تھا۔

”آپ کا مطلب ہے فرزان فیضی۔“

اور اس بات نے شاہ رخ کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا کہ مس نیلم فرزان کیسے جانتی ہیں۔

”مزا تم سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ ٹیک اے ام دیکھتا ہے۔“ محبوب خان نے کہا اور فرزان نے اپنے خیالات سے چونک کر محبوب خان کو دیکھا جو دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد محبوب خان کے پیچھے داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر سب کا سانس جیسے سینے میں ہی رک گیا تھا۔

قیامت خیز سراپے سے اٹھنے والے امپورٹڈ فریوم کی خوشبو نے کمرے میں پھیلی چرس کی بدبو کو کم کر دیا تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ صراحی دار گرن میں پڑی سونے کی چین کو اپنی نرم و نازک مخروطی انگلیوں سے بل دیتے اس نے مسکرا کر مدھم سی آواز میں بغیر کسی کو دیکھے ہیلو کہا تھا۔ جواب میں کوئی کچھ نہیں بول سکا تھا۔

سب ہی کی نظروں میں اشتیاق تھا اور وہ مبہوت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نیلم کو بخوبی احساس تھا اسی قسم کی پذیرائی کا۔ وہ ایک انداز سے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ سامنے میں ڈھلا گداز جسم سیاہ مشکبودراز کیسو قدرت کا وہ حسین شاہ کا۔ پری نعمت فرزان کے قریب جا کے رک گئی۔ اسے کھڑا دیکھ کر فرزان اپنے اسی مخصوص لہجے میں گویا ہوا۔

”مس نیلم کہتے ہیں شہر میں ایک مرتبہ مست بابا آگئے۔ آتے ہی انہوں نے حکم دیا کہ ایک بہت بڑی دیگ لائی جائے۔ لوگ دوڑ پڑے، دیگ لائی گئی، پھر حکم دیا اب اس دیگ کے سائز کے مطابق چولہا بنایا جائے۔ چولہا بن گیا۔ حکم ہوا لکڑیاں رکھ کر آگ جلا دی جائے۔ چولہا جل گیا۔ مست بابا نے حکم دیا۔ دیگ میں پانی بھر کر ڈھکنا لگا دیا جائے اور اسے چولہے پر رکھ دیا جائے۔ اگلی صبح ڈھکنا اٹھایا گیا تو دیگ پلاؤ سے بھری ہوئی تھی۔ سارے شہر میں اعلان کیا گیا کہ حاجت مند آئیں، انہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ اس اعلان پر سارا شہر تھالیاں اٹھا کر پہنچ گیا۔ کھانا تھالیاں بھر بھر کر تقسیم کیا جانے لگا۔ اگلے روز جب دوبارہ دیگ کا ڈھکنا

فرزان نے اس بار تحمل سے پوچھا۔ اذان کو فرزان کے جملے زیادہ اس کے گل پر غصہ آگیا۔

”میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بابا کے پاس اس وقت ہم میں سے کسی کا ہونا ضروری ہے۔ میں شاپ اور امی کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ ان کی خرابی طبیعت کے باعث۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت بابا کے پاس تمہارا ہونا بہت ضروری ہے اور ہو سکتا ہے اس وقت تمہارے وہاں پہنچنے سے ان کی ناراضی بھی ختم ہو جائے۔“

اذان نے اپنے غصے پر قابو پا کر اس بار نرمی سے ساری بات کی۔ فرزان نے کام روک کر اذان کی ساری بات بغور سنی۔ پھر اس کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

شکریہ آئے گردشِ دوراں عنایت ہے تری  
 زخمِ تازہ ہو گئے ہیں ٹھوکریں کھانے کے بعد  
 غم نہ ہوتا تیز لہروں میں جو کشتی ڈوبتی  
 ناؤ ڈوبی دوستو! دریا اتر جانے کے بعد

”میرے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے گھر سے نکالنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب ان کا ایک ہی بیٹا ہے اور اس کا نام ہے اذان فیضی۔ فرزان اب پھر فرزان ہے فرزان فیضی نہیں۔ بہتر ہو گا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے تم خود کرو۔ میں تم لوگوں کے لیے مرجھا۔“

اور ہمارے بابا۔۔۔ وہ تو ہمارے بابا ہیں نا۔“  
 فرزان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ”بابا سے کون پوچھے۔“

جس کی خاطر مجھے لوگوں نے نکالا گھر سے  
 اس نے رہنے کے لیے آنکھ میں گھر بخشا ہے  
 قتل کرتے ہوئے احساس نہ ہونے دے گا  
 تو نے قاتل کو بڑا ذوق ہنر بخشا ہے

ایک دن تجھ سے میری دربدری پوچھے گی  
 زندگی دے کے مجھے کیسا سفر بخشا ہے  
 ”سمجھ مسٹر اذان فیضی۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔“

اٹھایا گیا تو دیکھا دیگ جوں کی توں بھری ہوئی ہے۔ شہر میں مست بابا کی دھوم مچ گئی۔ پیروکار اور عقیدت مند تھالیاں بھر بھر کر بانٹتے، گرد دیگ جوں کی توں بھری رہتی۔

حاجت مندوں میں مجھ جیسا ایک فقیر بھی تھا جو خالی ہاتھ آتا اور سارا دن کھڑا تماشا دیکھتا۔ عقیدت مند کہتے ”میاں تم کیوں خالی ہاتھ کھڑے ہو۔ برتن لاؤ اور چاول لے جاؤ۔“ وہ کہتا میں حاجت مند نہیں ہوں۔“  
 عقیدت مند اس بات پر بہت حیران ہوتے کہ کھڑا بھی رہتا ہے۔ دیدے بھاڑ بھاڑ کر دیکھتا بھی ہے۔ مگر چاول لیتا ہے نہ ہی کچھ کھاتا پیتا ہے۔ انہوں نے مست بابا سے بات کی۔ بابا نے کہا ”اس شخص کو میرے پاس لایا جائے۔“

میرے جیسے غریب فقیر کو بابا کے سامنے پیش کیا گیا۔

بابا نے پوچھا۔ ”میاں کیا بات ہے۔ سارا دن دیگ کے سامنے کھڑے رہتے ہو۔ لیکن دیگ کے چاول نہیں کھاتے۔“

فقیر بولا ”میں یہاں دیگ کو دیکھنے نہیں آتا، نہ ہی چاول کھانے آتا ہوں۔“

بابا نے پوچھا تو پھر تو یہاں کیوں آتا ہے۔“  
 فقیر بولا ”میں تیری زیارت کرنے آتا ہوں۔“

”میری زیارت؟ وہ کیوں۔“ بابا نے اچنبھے سے پوچھا۔ تو فقیر بولا ”تو جو اس شہر کا رب بنا ہوا ہے اور لوگوں کو رزق تقسیم کر رہا ہے۔ تیری زیارت تو کرنی ہی چاہیے۔“ یہ سن کر مست بابا کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ چہرے پر بدحواسی کے تاثرات پھیل گئے۔ پھر وہ تلخ لہجے میں بولا۔

”دیگ کو الٹ دو، چولہے پر پانی پھیر دو۔“ اذنا کہہ کر مست بابا نے لاشمی اٹھالی اور شہر سے باہر نکل گیا۔



فرزان چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا تھا۔ نیلم نے جو مسلسل فرزان کی طرف متوجہ تھی۔ اپنی ریشمی پلکوں کو جنبش دی اور مسکراتے ہوئے اپنی گنگنائی ہوئی آواز میں بولی۔

”لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں فقیر نہیں بلکہ مست بابا خود چل کے آئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پھر حاجت مند بھی ہم خود ہیں۔ تیسری بات یہ کہ مست بابا کو تو فقیر کی مچی ہوئی دھوم یہاں پہنچ لانی ہے۔ مست بابا تو شہر سے نکل گئے۔ لیکن ہم جانے والوں میں سے نہیں۔“

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ یہ کہہ کر وہ پرسکون انداز میں فرزان کے مقابل بیٹھ گئی۔

اس دوران کوئی کچھ نہیں بولا۔ پھر فرید خان ہی گلا کھنکھار کے گویا ہوا۔

”دیگ کا اشارہ کہیں ہمارے ملک کی طرف تو نہیں ہے۔ یہاں بھی تو یہ ہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک گروپ آتا ہے۔ کھاتا ہے، چلا جاتا ہے۔ پھر دوسرا گروپ آتا ہے تو اس کے جفاکش دیگ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ لیکن دیگ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ اور۔۔۔“

فرزان نے ہاتھ اٹھا کے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں فرید خان ایسا نہیں ہے۔ یہاں سب دیکھنے میں ہی زبوں حالی کا دور دورہ ہے۔ وگرنہ سڑکوں پر بیش قیمت گاڑیوں کی لائنیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ دکانوں میں سامان کے انبار بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہوٹلوں کی رونقیں عروج پر ہیں۔ شاپنگ مال خواتین سے بھرے ہوئے ہیں۔ خواتین کے چہرے گلال ہو رہے ہیں۔ ان کی بھوری، کالی آنکھوں سے کرنیں پھوٹی ہیں۔ اسٹیشن کے درجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ انسان اب انسان نہیں بلکہ اسٹیشن انیمل بن چکا ہے۔ آپ میری مثال نہیں سمجھ سکے۔“

فرزان کی بات پر نیلم مسکرائی۔ اس کے دانت موتیوں کی مانند چمک اٹھے تھے۔ اس کی مسکراہٹ

اس کی شخصیت کی طرح دلکش تھی۔ پھر وہ فرید خان سے مخاطب ہوئی۔

”فرید خان دنیا میں جو بھی بڑا آدمی پیدا ہوا ہے۔ عالم، محقق، سائنس دان، ڈاکٹر، سوشل ورکر، وہ ہمیشہ غریبوں میں سے ابھرا ہے۔“

آج تک دولت مندوں نے بھی بڑا آدمی پیدا کیا؟

نہیں۔۔۔ دولت مندی نے ہمیشہ صرف عیاش لوگ پیدا کیے ہیں۔ غربت ہی ہے جو ایک دوسرے سے ہمدردی کا درس دیتی ہے۔ یہی غریب ہیں جن کی بدولت ہمارے یہاں خاندان قائم ہیں۔ یورپ میں تو خاندان کی بجگی کچھ باقیات پر بھی جھاڑو پھر چکی ہے۔“

فرزان نے پہلی بار دلچسپی سے نیلم کا چہرہ دیکھا۔ شاید اس کی باتیں اس کے دل کو لگی تھیں۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔

”سنئے ہیں غربت میں اللہ قریب آجاتا ہے۔“

پھر نیلم کے جواب کا انتظار کیے بغیر ادھر ادھر دیکھ کر نظریں جھکا کر چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

جنت کی آرزو ہے نہ دوزخ کا خوف ہے پروردگار کیا میں مسلمان نہیں رہا

\*\*\*

اذان نے موٹر سائیکل لاک کی اور کی چین ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو کے کچھ دیر ورکشاپ کی طرف پر سوچ نظروں سے دیکھا۔ پھر مضبوط قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ ورکشاپ میں ٹھک ٹھک کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لیکن جوں ہی اذان نے قدم اندر رکھا خاموشی طاری ہو گئی۔

استاد اچھو، کھاری اور خلیل کام روک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اذان نے سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا اور ورکشاپ کے آخری کونے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ جہاں فرزان کتیدہ اٹھائے فولادی چادر کو کاٹنے میں مصروف تھا۔ اذان قریب جا کے رکاوٹ فرزان نے کام کرتے کرتے ایک نظر اٹھا کر اس کی

جانب دیکھا اور دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔

”کیسے ہو فرزان۔۔۔“ اذان نے خائف ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جیسا تھا، ویسا ہی ہوں۔“ فرزان نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

”وہ میں۔۔۔ تم سے کچھ بات کرنے آیا تھا۔“ اذان نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”تو کرو رو کا کس نے۔“ فرزان کا انداز ہنوز تھا۔

”وہ دراصل چند دن پہلے بابا لاہور گئے تھے۔“ اذان نے زمین پر اکڑو بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جانتا ہوں، اکثر جاتے رہتے ہیں۔“ فرزان نے لا پرواہی سے کہا۔

”لیکن اس مرتبہ کچھ عجیب بات ہوئی۔ بابا دو تین دن کا کہہ کر گئے تھے۔ لیکن پورے آٹھ دن گزر جانے کے بعد بھی وہ واپس نہیں آئے۔ ان کا فون بند مل رہا ہے اور ان کی طرف سے کوئی اطلاع بھی نہیں ملی۔“

”تو۔۔۔؟“ فرزان نے کام روک کر اذان کو گھورتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

”تو لازمی سی بات ہے کہ ہم پریشان ہو رہے ہیں۔ امی جان نے مجھ سے کہا کہ پروین خالہ سے فون کر کے پتا کروں۔“ اذان نے اس بار برہمی سے کہا۔

”تو میں کیا پروین خالہ ہوں؟ جاؤ، جا کے پتا کرو۔“

فرزان نے اسی کھردرے لہجے میں کہا۔

”یا ر ایک تو تم بات کو سنئے، سمجھتے نہیں ہو۔ بیچ میں ہی بول پڑتے ہو۔“

اذان نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں پتا کر چکا ہوں۔ پروین خالہ نے بتایا کہ دو دن رکنے کے بعد وہ ان کی بہن مختاراں کی طرف چلے گئے۔ پھر میں نے خالہ مختاراں کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ بابا بخار کی حالت میں گھر سے نکلے تھے اور ان کے ہاں جاتے ہوئے راستے میں بارش ہو گئی۔ بخار کی حالت میں بارش میں بھیگنے کی وجہ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر روزانہ گھر آ کے چیک کر رہا

ہے۔ لیکن کوئی افاقہ نہیں ہو رہا۔ انہوں نے ہم لوگوں کے نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نہ جانے کیا مسئلہ تھا کہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ شکر ادا کر رہی تھیں کہ اچھا ہوا تمہاری کال آگئی۔ میں تو یہ سب سن کر پریشان ہو گیا ہوں۔ امی جان کو یہ سب کیسے بتاؤں؟ وہ تو پہلے ہی بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ ان کی طبیعت بھی بہتر نہیں رہتی۔“

”مجھے یہ ساری رام لیلیا سنانے کا مقصد کیا ہے؟“

فرزان سخت انداز میں کہہ کر دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اذان کو اندازہ تو تھا کہ فرزان ضدی اور سرکش ہے اس کا خیال تھا بابا کی بیماری کا سن کر شاید وہ اپنے رویے میں کچھ لچک پیدا کر لے۔ لیکن فرزان کے انداز نے اس کے خیال کی نفی کر دی تھی۔ اسے غصے کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہو رہا تھا وہ کچھ دیر کھڑا تاسف سے اسے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا۔ فرزان نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا اسے۔

اذان نے فرزان کا سارا غصہ کک مار کر نکالا تھا موٹر سائیکل کے اشارٹ ہوتے ہی اس نے طوفانی رفتار سے بایک آگے بڑھالی۔ اذان، فرزان کی باتوں کو سوچتا چلا جا رہا تھا اسے فرزان کا لب و لہجہ اور اس کے الفاظ پسند نہیں آئے تھے۔ لیکن فرزان کو احساس تک نہیں تھا ظاہر ہے اگر ان باتوں کی پروا اگر فرزان کو ہوتی تو فیضی صاحب اسے ”دیس نکالا“ کیوں دیتے۔ اذان کے جذبات اپنی جگہ مگر فرزان۔۔۔ فرزان تھا۔

اذان سوچوں میں گم بایک اڑائے جا رہا تھا سگنل ہونے پر کچھ دیر ٹریفک رک گیا تھا۔ اذان نے لاشعوری انداز میں اپنے ارد گرد دیکھا اور اس کی نظریں ایک شناسا چہرے پہ جم گئیں۔ اس نے بایک کا رخ موڑ لیا۔ اسکول کے پروگرام ختم ہوئے پندرہ بیس دن گزر چکے تھے ماہم دو چار پروگرام کرنے کے بعد ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اذان نے اقبال صاحب سے ایگریمنٹ کیا تھا تو بقیہ پروگرام کرنے ہی تھے لہذا ان



پروگرامز کے لیے اذان کو ایک پروفیشنل ایکٹریس کی خدمات حاصل کرنی پڑیں جو کہ اذان کو کافی "پیکسینو" بڑی۔ لیکن ظاہر ہے جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اسے پایہ تکمیل تک تو پہنچانا تھا۔ طوبا "کہا" باقی پروگرام بھی کر لیے گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں اذان پہلے جیسی دلچسپی برقرار نہ رکھ سکا بس فرض ادا کرنے والی بات تھی اور جیسے تیسے اس نے یہ فرض ادا کر دیا تھا اور اب بیس تیس دن کے وقفے کے بعد اس کی ٹیم کا ایک لڑکا آج پہلی مرتبہ اسے نظر آیا تھا۔

"آہا! اذان صاحب بڑے دنوں بعد دیدار ہو رہے ہیں کہاں غائب تھے۔" نعیم خرم جو اس دوران اذان کو دیکھ چکا تھا قریب آتے ہوئے بولا۔

"ہم نے کہا جانا ہے۔ یہیں ہیں۔ تم سناؤ کیسے ہو؟" اذان نے بانیگ لاک کی اور اتر کر نعیم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں یار۔ آؤ کچھ دیر بیٹھتے ہیں چائے پیتے ہیں۔" نعیم اذان کا ہاتھ تھامے قریب ہی موجود ہوٹل کی اندرونی سمت کھینچ لے گیا۔

"اور سناؤ کیا ہو رہا ہے آج کل۔" اذان نے دریافت کیا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہال کمرے میں داخل ہو گئے اور ایک میز کے گرد رکھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"بس یار ہونا کیا ہے۔"

وہی ہے چال بڑھتی جو پہلے تھی سوا ب بھی ہے

"صبح اسکول اور شام ٹیوشن کلاسز ایک ٹیچر کی زندگی میں اس کے علاوہ ہوگا بھی کیا۔"

"چھل۔" اذان نے نعیم کی بات پر دھیسے سے مسکراتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر کو چائے کا آرڈر دے کر اذان پھر نعیم کی طرف متوجہ ہوا جو پوچھ رہا تھا۔

"آپ سنا میں اذان صاحب کوئی نیا پروجیکٹ ہاتھ نہیں لگا۔" نعیم نے پوچھا۔

"نہیں یار ترقی الحال تو نہیں۔ اگر ہوتا تو تم ہی لوگوں سے رابطہ کرت۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بات ہے اذان صاحب کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟" نعیم نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا۔

"ہاں یار آج کل واقعی پریشان ہوں۔" اذان نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے۔" نعیم نے خلوص سے پوچھا۔

"اصل میں بابا بچھلے دنوں لاہور گئے تھے اور وہاں جا کے ان کی طبیعت نامساز ہو گئی ہے۔ میں اسی پریشانی میں ہوں اور ویسے بھی وہ کام تو خود چل کے میرے پاس آگیا تھا ورنہ تم تو جانتے ہو تمہاری طرح میری بھی اپنی روٹین ہے میں بھی اپنی شاپ میں مصروف رہتا ہوں۔"

"اوہ۔ پریشان نہیں ہوں آپ۔ موسمی بخار ہوگا ٹھیک ہو جائیں گے۔" نعیم نے تسلی دی تو اذان نے بھی سرانبات میں ہلادیا۔

ویٹر چائے رکھ کے جا چکا تھا۔ دو منٹ کے لیے دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

"بہت اچھے دن تھے۔ بہت انجوائے کیا۔ خاص طور پر نعیم کی "ہٹاؤ یار گل بنتی ہے" کو۔" ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے نعیم کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اذان بھی مسکرا دیا۔

"یار اذان! ایک بات یاد آئی وہ ہمارے ساتھ ایک لڑکی کام نہیں کر رہی تھی شروع میں۔ کیا نام تھا اس کا۔" نعیم نے یاد کرنے کو شش کرتے ہوئے دو انگلیوں کی مدد سے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

اذان نے غور سے نعیم کے چہرے کی طرف دیکھا اور گویا ہوا۔

"ماہم کی بات کر رہے ہو۔"

"ہاں وہی۔ ماہم کی بات کر رہا ہوں یار بڑی عجیب لڑکی ہے وہ۔" نعیم کے انداز میں بے ساختگی یہی۔

اذان کی تمام حیات سمٹ کر جیسے کانوں میں آگئی تھیں اس کی پوری توجہ نعیم کے الفاظ پر مرکوز ہو گئی تھی لیکن بظاہر لائق کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں کیا ہو گیا اسے؟"

"تمہیں تو پتا ہی ہوگا کہ اس نے ٹیم کے تمام لڑکوں کو اپنا سیل نمبر دیا تھا۔" نعیم ذرا دیر رکھا تو اذان بولا۔

"ہاں جانتا ہوں۔ تو۔"

"تو کیا یار۔ بس میں نے بھی بات چیت کرنے کی کوشش کی کچھ دن تک تو بڑے دوستانہ ماحول میں بہت اچھے انداز میں گپ شپ ہوتی رہی لیکن پھر بات بگڑ گئی۔"

نعیم ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گیا اس بار اذان کو نعیم کی خاموشی سے الجھن ہوئی تھی اور اس کا اظہار بھی اس نے کر دیا۔

"ہوا کیا یار۔ پسلیاں کیوں بوجھوا رہے ہو کھل کے بتاؤ۔" اذان نے جھنجھلا کر کہا۔

"یار ہونا کیا ہے اچھی خاصی روز بات ہوتی تھی اور تم تو جانتے ہو جب دو لڑکا لڑکی آپس میں بات کرتے ہیں تو ظاہر ہے تن ملاقت پر ہی آکر ٹوٹتی ہے حسب دستور جب میں نے ماہم سے ملاقات پر اصرار کیا تو موصوفہ ہتھ سے اکھڑ گئیں کہنے لگیں ہم نے فیملی نمبر کی طرح ایک ساتھ نعیم ورک کیا تھا اور آپ کو اچھا انسان سمجھتے ہوئے اپنا سیل نمبر دے دیا اب اگر آپ مجھے کل کرتے ہیں تو اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ میں آپ کی بات سنوں اور سادہ بھر آپ کی باتوں پر توجہ بھی دوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز بھی نہیں کہ میں آپ سے سڑکوں اور پارکوں میں ملاقات کروں اگر میں نے آپ کو ایک اچھا انسان سمجھتے ہوئے دوستانہ انداز میں آپ سے بات چیت کر لی تو اس کا یہ مطلب تو ہرگز بھی نہیں کہ اب ہم باقاعدہ سے ٹائم سیٹ کریں اور ڈیٹ ماریں۔" یہ سب بتاتے ہوئے نعیم کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اذان اندازہ نہیں لگا سکا کہ اسے اتنا غصہ کیوں آیا ہے مگر نعیم کی اگلی بات سن کر اس کی یہ الجھن دور

ہو گئی۔

"ہو نہ۔ محترمہ فرما رہی تھیں ایک بات کان کھول کر سن لیں مسٹر نعیم میں کوئی لوز کرکٹر لڑکی نہیں۔ آپ نے میرے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے بہتر یہ ہوگا کہ آئندہ میرے نمبر پر فون مت کیجیے گا۔ یہ انداز ہیں ان لڑکیوں کے پہلے نمبر پر منتی ہیں پھر خرے دکھاتی ہیں کہ فون نہیں کیجیے گا۔" نعیم نے ماہم کے انداز کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" اذان کے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ آزاد ہوا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات۔ یہاں میرا خون جل رہا ہے اور آپ قہقہے لگا رہے ہیں۔" نعیم تلملائے ہوئے انداز میں بولا۔

"اوہ سوری۔" اذان نے جلدی سے معذرت کی پھر تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"یار اس میں اتنا خون جلانے کی کیا بات۔ اس نے صحیح تو کہا تم نے اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ ہر لڑکی اس مزاج کی نہیں ہوتی ضروری نہیں ہے کسی بات سے کسی کی شخصیت کا جو امیج آپ بنائیں وہ ویسا ہی ہو۔" کہہ کر اذان نے چائے کا کپ جو رکھ دیا تھا دوبارہ اٹھالیا اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولا۔

"ویسے جو کچھ بھی ہے تمہاری بات سن کر مزا آگیا۔" اذان نے نعیم کی لمبی چوڑی گفتگو سن کر مسکراتے ہوئے کہا اور مزے سے چائے کے سپ لینے لگا۔

\*\*\*

چائے کا کپ جلدی سے ٹیبل پر رکھ کر مختار اس نے صحن کی طرف دیکھا باہر سے ذکیہ بیگم کی آواز آرہی تھی۔

"بسم اللہ بسم اللہ۔ جی آیا ہوں۔" مختار اس نے پہلے تو حیرت سے ان دونوں کو دیکھا پھر لپک کے ذکیہ بیگم کی طرف بڑھی اور گرجوشتی سے انہیں گلے لگا لیا۔

"اللہ کالا کھ لا کھ لا کھ شکر ہے آپ لوگ آگئے میں بہت



پریشان ہو رہی تھی۔ فیضی صاحب کی طبیعت کافی خراب ہے ابھی ابھی غذا ڈاکٹر کو لینے گیا ہے۔  
 ”ہاں فدا نے بتایا ہے اسی نے دروازہ کھولا تھا۔“  
 ذکیہ بیگم نے آہستگی سے کہہ کر ادھر ادھر دیکھا ان کی نظریں فیضی صاحب کو تلاش کر رہی تھیں ان کا انداز دیکھ کر مختار اں بولی۔

”آئیں ادھر آجائیں۔“ مختار اں انہیں لیے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی۔

نرم و گداز بستر پر بے سدھ بڑے فیضی صاحب کو دیکھ کر ذکیہ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبائیں انہوں نے اذان کو دیکھا وہ بھی فیضی صاحب کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا وہ بے حد کمزور لگ رہے تھے۔

”بابا جانی۔ بابا جانی۔“ اذان نے بیڈ پر آہستگی سے بیٹھ کر ان کو پکارا۔ بند پلوں میں کچھ جنبش ہوئی تھی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کل کچھ طبیعت بہتر ہوئی تھی کل ڈاکٹر آیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ بخار کی حالت میں بارش میں بھیگنے سے انہیں ڈبل نمونیا ہو گیا ہے دوا میں لکھ کر دی تھیں مگر خالی پیٹ دوا میں کیا اثر کریں گی آج پھر بخار ہو گیا تو میں نے فدا کو بھیجا ہے کہ ڈاکٹر کو بلا کے لائے ڈاکٹر نے ٹھنڈی چیزوں کا سختی سے منع کیا تھا کہا تھا کہ اندہ بوا مل کر کے دیں مگر فیضی صاحب رات میں بھی ضد کرتے رہے ٹھنڈا پانی مانگتے رہے کہتے ہیں دودھ سوڈا دوا آپ بتائیں کیسے دوا ہمارے لیے تو یہ بہت زیادہ قابل احترام ہیں ہم ان کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کر سکتے۔ سمجھ سے باہر ہے فیضی صاحب کی مائیں یا ڈاکٹر کی اب آپ کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی ہے۔ ہمارا کہا تو وہ یہ مان نہیں رہے آپ کی بات ہی مائیں گے۔“ مختار اں نے آہستہ آہستہ ذکیہ بیگم کو پریشانی سے بتایا۔  
 ”بابا جانی۔“ اس بار اذان نے ان کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دھیرے سے پکارا۔

فیضی صاحب نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا اور اذان کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں انہوں

نے بے ساختہ آنکھنے کی کوشش کی مگر نقاہت کے باعث اٹھ نہیں سکے اذان نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا اور ان کی پشت پر تکیہ رکھ کر انہیں بٹھادیا۔  
 اذان سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں ذکیہ بیگم کی طرف گئیں ان کے ہونٹوں پر لرزش ہوئی پھر لڑکھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

”بیگم۔ تم۔ تم کب آئیں۔“

”بس ابھی ابھی۔ یہ آپ نے اپنی کیا حالت کرا ہے۔“ ذکیہ بیگم نے خفگی سے کہا اور ان کے بیڈ کے قریب کرسی کھینٹ کے اس پر بیٹھ گئیں۔

”ارے واہ ذکیہ بہن آج تین دن بعد فیضی صاحب کی آواز سنائی دی ہے آپ کا چہرہ تو جادو کی حیثیت رکھتا ہے۔“

مختار اں کی بات سن کر فیضی صاحب کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں بھی تو آیا ہوں۔“ اذان نے ان کی توجہ خود پہ نہ پا کر نرمٹھے پن سے کہا۔

فیضی صاحب نے ایک نظر اذان کی طرف دیکھا اور کپکپاتے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اذان نے اس ہاتھ کو چومتے ہوئے پوچھا۔

”کیسی طبیعت ہے بابا؟“

”تم لوگوں کو دیکھ لیا اب کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ اس بار فیضی صاحب کا لہجہ خاصا سنبھلا ہوا تھا۔

”مختار اں بتا رہی ہیں آپ کچھ کھاتے بیٹے نہیں کیوں ٹھیک نہیں ہوتا آپ نے۔“ ذکیہ بیگم کے لہجے میں شکوہ ہی شکوہ تھا پھر وہ پلٹ کر مختار اں سے مخاطب ہوئیں۔

”مختار اں بہن کچھ کھانے کو لائیں۔ دیکھتی ہوں کیسے نہیں کھاتے۔“

”جی ابھی لائی۔“ مختار اں جلدی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی اس کے چہرے پہ مسرت کے اثرات تھے فیضی صاحب کی سنبھلی ہوئی حالت دیکھ

کر اسے بہت سکون ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”یہ لوزکیہ بہن دودھ میں باقر خانی ڈال کے لے آئی ہوں۔“ مختار اں نے پیالہ ذکیہ بیگم کو تھماتے ہوئے کہا۔

ذکیہ بیگم نے چچہ بھر کے فیضی صاحب کے منہ کی طرف بڑھایا فیضی صاحب نے بے چارگی سے اذان کی طرف دیکھا۔ مگر اذان نے کندھے اچکا دیے ناچار فیضی صاحب کو منہ کھولنا پڑا ابھی دو تین تچچے ہی انہوں نے کھائے تھے اسی دوران ہلکی سی دستک دے کر فدا اندر داخل ہو گیا۔

”میں ڈاکٹر صاحب کو لے آیا ہوں۔“ ان لوگوں سے کہہ کر فدا نے باہر جھانکا۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب۔“ فدا نے میڈیکل باکس اٹھا کر بیڈ کی سائیڈ میز پر رکھ دیا۔ ذکیہ بیگم ہٹ کر دور کھڑی ہو گئیں۔

اذان نے کھڑے ہوتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے لیے کرسی کھینچ کر بیڈ کے سامنے کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے بیٹھ کر پہلے ان کی نبض چیک کی پھر ٹمپرچر چیک کیا پھر اسٹیتھسکوپ ان کی پشت پر جماتے ہوئے کہا۔

”لے لے سانس لیں۔“ ڈاکٹر نے چند لمحے اپنی کارروائی مکمل کر لی اور پھر ایک کانڈ پر نسخہ لکھ کر فدا کی طرف بڑھادیا۔

”آج تو ان کی طبیعت کافی بہتر لگ رہی ہے مگر آپ ان کی خوراک کی طرف خصوصی توجہ دیں اور اس کے ساتھ ہی یہ دوا جو میں نے لکھ کر دی ہے انہیں باقاعدگی سے کھلائیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے اسٹیتھسکوپ بیگ میں رکھا اور کھڑے ہو گئے۔ اذان نے فدا کے ہاتھ سے نسخہ لے لیا تھا فدا ایک اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔

”میں یہ دوا لے کر آتا ہوں۔“ اذان نے ذکیہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور باہر جانے کے لیے مڑا۔

”رکواذان۔ ابھی تو آئے ہو اتنی جلدی کیا ہے ابھی میرے پاس بیٹھو۔“ فیضی صاحب کی نقاہت زدہ آواز بلند ہوئی تو اذان جاتے جاتے رک کر بیڈ کے کونے پر ٹک گیا۔

”ایسا کیسے چلے گا نہ آپ کھانا کھاتے ہیں اور اب دوا لینے جا رہا ہے تو اس کو بھی منع کر رہے ہیں ایک بات دھیان سے سن لیں اب آپ کو کھانا پینا بھی بڑے گا اور دوا میں بھی استعمال کرنی پڑیں گی۔“ ذکیہ بیگم نے محبت بھری دھول سے کہا۔

”بس بیگم دوا میں کھا کھا کر زبان پر چھالے بڑ گئے ہیں اور کچھ کھانے کو تولد ہی نہیں کرنا اندر جیسے آگ لگی ہوئی ہے پاس نہیں بچھ رہی لگتا ہے اندر چاول کی فصل آگ آئی ہے۔“ فیضی صاحب کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی ان کی بات سن کر سب ہی مسکرا دیے مختار اں تو جیسے خوشی سے نہال ہو گئی۔ فیضی صاحب مختار اں کے چہرے کی طرف ایک نظر ڈال کر ذکیہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔

”سب سے پہلے تو ان لوگوں کا شکریہ ادا کرو بیگم صاحبہ! ان لوگوں نے میرا بڑا خیال رکھا میری بڑی خدمت کی لیکن سچی بات تو یہ ہی ہے کہ بستر پر لیٹے لیٹے بے زار ہو گیا ہوں میرا یہاں دل نہیں لگ رہا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر گھر پہنچ جاؤں لیکن مجھے اندازہ ہے کہ ابھی میں ٹرین کے سفر کے قابل نہیں۔“

”یہ کون سا مسئلہ ہے اگر آپ گھر جانا چاہتے ہیں تو میں ابھی پرائیویٹ گاڑی کا آرینج کر لیتا ہوں آرام سے چلیں گے۔“ اذان نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے محبت سے معمور لہجے میں کہا۔

”ایسے کیسے چلے جائیں گے ابھی تو آپ لوگوں کی تھکن بھی نہیں اتری ہوگی اور آپ فیضی صاحب کو لے جانے کی باتیں کر رہے ہیں ابھی تو آئے ہیں ایک دو دن رکیں اس دوران فیضی صاحب کی طبیعت بھی مزید سنبھل جائے گی پھر آرام سے جائے گا۔“

مختار اں مہمان نوازی پر اتر آئی لیکن فیضی صاحب



# سلاسلِ محبت

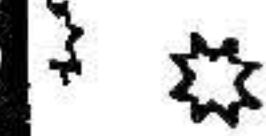


اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ لوگ گھر سے باہر نکلا رہے تھے۔ فیضی صاحب کو دائیں بائیں فدا اور اڑ سہارا دیے باہر لے کر جا رہے تھے۔ ذکیہ بیگم اور مختاراں ست قدموں سے ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔ ڈرائیور نے ان لوگوں کو آتے دیکھ کر تیز سے باہر نکل کر عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اذان اور ذکیہ نے انہیں آرام سے نشست پر بٹھالیا۔ ذکیہ بیگم مختاراں سے گلے ملنے کے بعد فدا کے سر پر ہاتھ بچھو اور گھوم کر دوسری جانب کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

اذان گاڑی کا دروازہ بند کر کے مختاراں کی طرف بڑھا اور ان کے سامنے سر خم کر دیا۔ مختاراں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے دعاؤں سے نوازا۔ اس نے دعاؤں کے ساتھ فدا کی طرف مڑا اور اس سے معاف کر کے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اشارت کی تو مختاراں اور فدا جلدی سے گاڑی سے عقبی دروازے کی طرف پہنچے اور کھڑکی میں سے بیگم صاحب کا کپکپاتا ہوا ہاتھ برآمد ہوا مختاراں نے جلدی سے اپنا سر آگے کر دیا۔ فیضی صاحب نے اپنا دستہ شفقت اس کے سر پر رکھا اس کے بعد فدا نے اچھکایا تو فیضی صاحب اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے  
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے  
اس کے ساتھ ہی سبک روی سے گاڑی آگے گئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔  
”نہیں مختاراں ضد مت کرو کل کس نے دیکھا سارا مسئلہ وقت کا ہی تو ہوتا ہے اور کون جانے دوبارہ وقت ملے نہ ملے اور میں۔ یہ وقت اپنے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“  
فیضی صاحب کے لہجے میں ایک عجیب سی تھکن تھی مختاراں جو ان کے قریب ہی کھڑی تھی ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لرز کے رہ گئی ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی دیرانی اتر آئی۔  
”اللہ نہ کرے فیضی صاحب! ابھی آپ کو بچوں کے ساتھ بھی بہت سا وقت گزارنا ہے اور ہمیں بھی آپ کی دعاؤں کی شدید ضرورت ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو مہمان کو آخر ایک دن جانا ہی ہوتا ہے تم بھی زیادہ اصرار نہیں کرو۔ جاؤ اذان اگر تم کوئی انتظام کر سکتے ہو تو کرو۔“ اذان نے ایک نظر ذکیہ بیگم کی طرف دیکھا پھر چند لمحوں کے لیے اس کی نظریں مختاراں کے چہرے پر رکیں جہاں رنجیدگی تھی پھر وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

بمشکل دس پندرہ منٹ بعد ہی اذان کی واپسی ہو گئی تھی وہ بہت عجلت میں تھا اس نے ذکیہ بیگم کو مخاطب کیا۔

”میں گاڑی لے آیا ہوں ای جان۔ تیاری کر لیں۔“

”تیاری کیا کرنی ہے بس چلو۔“ ذکیہ بیگم اٹھ کر کھڑی ہوتے ہوئے بولیں۔

یہ دیکھ کر مختاراں جلدی سے دروازے کی طرف لپکی اور با آواز بلند پکارا۔

”فدا۔ فدا۔ ذرا ادھر آؤ۔“  
”جی امی۔“ فدا چند لمحوں بعد کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔

”اذان کے ساتھ فیضی صاحب کو سہارا دے کر گاڑی تک لے جاؤ۔“



اوا نکل مارچ کے دن تھے۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ سردی بھی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ صبح سے آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ خنکی میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ موسم اس کا پسندیدہ موسم تھا۔ وہ موسم انجوائے کرنے کے ساتھ ساتھ اسائنمنٹ بنارہی تھی کہ زین اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے ذرا سراسر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ ”سردیوں کی شاہیں کتنی اداس ہوتی ہیں نا۔“ وہ رینگ سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

”اچھا! مجھے تو نہیں لگتا۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

”ان اداس شاموں میں ”کوئی“ آپ کے ساتھ ہو تو پھر یہ رنگین لگنے لگتی ہیں۔ ورنہ تو ان شاموں میں اداسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ اب وہ بارش کو دیکھنے لگا۔

”اب تو سرویاں بھی گزر رہی ہیں اور تمہیں ایسا کیوں فیل ہو رہا ہے؟“ وہ حیرانی سے اس کے بدلے ہوئے انداز دیکھ رہی تھی۔

”کیونکہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔“ زین نے تو جیسے اس کے سر پر دھماکہ کیا۔

”کیا؟ کب؟ کیسے؟ کس سے؟ کہاں رہتی ہے؟ کب ملوؤ گے؟“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر ڈالے۔

”اے۔ اے۔ تیز گام۔ پہلے کسی کی پوری بات تو سن لیا کرو۔“ وہ فوراً اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

”تو پھر بتاؤ نا کون ہے وہ؟“

”نہیں ہوا۔“

”کیا تم کافی عرصے سے اسے جانتے ہو اور مجھے اب بتا رہے ہو۔“ اسے دھچکا لگا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہر بات شیئر کرتے تھے۔

”جنا تو رہا ہوں محبت کا احساس ابھی ہوا ہے اس کا نام عینا ہے۔“ اس کا انداز ہنوز دھیمہ اور گمبیر تھا۔

”میرے آفس میں ہی کام کرتی ہے۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔“

”صرف دعا۔“

”کیوں وہ تمہیں پسند نہیں کرتی؟“

”مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی تم دعا کرو اس کے دل میں میرے لیے بھی وہی احساسات وہی جذبات پیدا ہو جائیں جو میرے دل میں ہیں۔“ وہ رینگ پر ہاتھ رکھے رکھے کہیں کھوسا گیا۔

”دعاؤں پر بہت یقین ہے؟“ عرشہ نے آہستگی سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ اس کا لہجہ اب بھی کھویا کھویا سا تھا۔“

”ٹھیک ہے میں دعا کروں گی۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تائی جان اور تایا جان کو بھیجو اس کے گھر۔“

”اس نے اپنی طرف سے ایک معقول مشورہ دیا۔“

”نہیں جب تک اس کے دل میں میرے لیے محبت پیدا نہیں ہو جاتی تب تک میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔“

”میرے خیال میں تو زین تم تایا جان اور تائی جان کو بھیج دو اس کے گھر یہی مناسب طریقہ ہے اور کیا پتا تمہارے نام سے جڑنے کے بعد اسے تم سے محبت ہو جائے بلکہ یقیناً ہو جائے گی۔“ وہ اسے سمجھانے لگی۔

”نہیں پہلے اس کے دل میں بھی میرے جیسے جذبات پیدا ہونے چاہئیں۔ جیسا میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں ویسا ہی وہ بھی میرے بارے میں سوچے۔“ اس کی سوئی ابھی ایک ہی جگہ انکی ہوئی تھی۔

”تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ بھی تم سے محبت

کرنے لگی ہے۔“ وہ بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

”مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت نظر آجائے گی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو وہ سر جھٹکے ہوئے اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

”عجیب منطق ہے تمہاری بھی۔ میں تمہارے لیے دعا کروں گی اب جاؤ یہاں سے میں نے اسائنمنٹ بنانی ہے۔“ وہ تیزی سے بولتے ہوئے پیپر سمیٹنے لگی۔

☆ ☆ ☆

عرشہ اور زین کزنز ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے دوست بھی تھے مگر زین، عرشہ کو چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

عرشہ کو سب پیار سے عرشی کہا کرتے تھے جبکہ زین اس کو چڑانے کے لیے قرشی کہتا۔ دونوں کی عمروں میں صرف دو سال کا فرق تھا لیکن عرشہ کبھی اس فرق کو خاطر میں نہ لاتی۔

اس نے رو رو کر گریجویشن کر لیا تو زین نے چیلنج کر دیا کہ اب ماسٹرز بھی کر کے دکھاؤ چیلنج زین کی طرف سے اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے زین کا چیلنج قبول کرنا پڑا اور سب سے بڑا عذاب تو تب نظر آتا جب اسے صبح صبح اٹھ کر زین کے ساتھ ہی یونیورسٹی جانا پڑتا کیونکہ زین کے آفس کے راستے میں ہی یونیورسٹی تھی۔

زین کے دو بہن بھائی بڑا بھائی شایان اور چھوٹی بہن زونہ جبکہ عرشہ کا بڑا بھائی کاشان تھا۔ عرشہ کو خاندان کی پہلی لڑکی ہونے کی وجہ سے تایا جان اور تائی جان سے بھی بے حد پیار ملا۔ کاشان اور شایان کی شادی ہو چکی تھی جبکہ بڑوں کا ارادہ زین اور عرشہ کو مضبوط بندھن میں باندھنے کا تھا مگر ان دونوں کے لالچالی پن کی وجہ سے خاموش تھے۔ دوسری طرف جب سے زین نے اسے عینا کے بارے میں بتایا تھا وہ دعا کے لیے جب بھی ہاتھ اٹھاتی تو اس کے لیے دعا کرنا نہ بھولتی آخر کو دونوں اچھے دوست بھی تو تھے۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆



”تس کی تصویر ہے؟“ اسی صوفے پر اس سے  
کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔  
”عینا کی۔“

”اگر ضرورت پڑی تو کروں گی تم پریشان نہ ہو میرے پاس سیل فون ہے۔“ وہ بانیگ پر بیٹھتے ہوئے بیٹا تو زمین ہلکا سا مسکرا دیا اور بانیگ اشارت کر دی بہت آرام سے چلاتے ہوئے یونیورسٹی پہنچا اور اسے

ہو کر بیٹھی تھی اور جب اسپید بریکر آیا وہ گرتے گرتے

”کہہ تو رہی ہوں ٹھیک ہے طبیعت کچھ نہیں ہوا کرلو۔“ امی پریشانی سے بولیں۔



”کیا عینا کی؟ کہاں سے لی ہے؟“ وہ دبی دبی آواز میں چلائی۔

”بس لے لی ہے۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔  
”زین سچ بتاؤ موبائل میں لی ہوگی اور بعد میں۔“  
”جی نہیں میں ایسی حرکتیں نہیں کرتا۔“ وہ اس کی بات سمجھ چکا تھا اسی لیے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”تو پھر۔“  
”تمہیں اس سے مطلب؟“

”زین سچ بتاؤ ورنہ میں تائی جان اور تایا جان کو بتا دوں گی۔“ انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی۔  
”جاؤ جا کر بتاؤ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“ وہ کشن کے نیچے سے تصویر نکال کر لے گیا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہی اسے بہت افسوس ہو رہا تھا اس کے روئے پر لڑائی تو پہلے بھی ہوتی تھی ان دونوں کے درمیان مگر اس نے کبھی اتنا محسوس نہیں کیا تھا بات تو اب بھی معمولی سی تھی مگر وہ زیادہ محسوس کر رہی تھی دل کے انداز جو بدل گئے تھے تو محسوس ہونا لازم تھا۔

وہ رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔  
”زونیہ سرتک کھل اوڑھے بے خبر سو رہی تھی اتنی دیر میں کوئی وردا نہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ عرشہ کی عادت بھی وہ دعا تھوڑی اونچی آواز میں مانگا کرتی تھی۔ عرشہ کی اس کی طرف پشت تھی اس کو دعا مانگتا دیکھ کر وہ چونک گیا۔

”یا اللہ وہ میرا نہیں ہے۔ وہ میرا ہو بھی نہیں سکتا اسے عینا سے ملاوے اے میرے اللہ جی! میرے دل سے اس کا خیال نکال دے وہ میرا کیسے ہو سکتا ہے اس کے دل میں تو عینا بستی ہے پھر میں کیسے۔۔۔ میں کیسے اس کے دل میں جگہ بنا سکتی ہوں ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے عینا کے دل میں زین کی محبت پیدا کر دے اور میرے دل سے اس کی محبت نکال دے پلیز یا اللہ پلیز۔“ وہ روتے روتے سجدے میں چلی گئی اور وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔



وہ زین سے ناراض تھی یونیورسٹی اس کے رہا جاتی مگر صحیح طرح سے بات نہیں کرتی۔ زین نے اس کے روئے کو نوٹ کیا تھا اگر وہ بات کرنے لگتا تو وہ جاتی عرشہ کی غیر معمولی خاموشی کو سب نے نوٹ کر اسی لیے جب شام کو سب بیٹھے تو تایا جان نے پوچھ لیا۔

”عرشی بیٹا کیا بات ہے آج کل آپ کچھ چپ چپ سی رہنے لگی ہیں؟“  
”کچھ نہیں تایا جان بس ایسے ہی ایگزٹ ہوئے والے ہیں تو اس کی ٹینشن ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو پاس بیٹھے زین کو خواجوا کھانسی آگئی کاشان بھلا اور شایان بھائی اس کی شرارت سمجھتے ہوئے مسکرایے۔

”اچھا تو ہمارا قرشی کو پڑھائی کی فکر کب سے ستا گئی۔“ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔  
”تم سے مطلب۔“

”تم دونوں میں ناراضی ہوئی ہے کیا؟“ تائی جان بولیں۔

”ہیں تم مجھ سے ناراض ہو اور حیرت کی بات دیکھ مجھے اوروں سے پتا چل رہا ہے۔“ وہ مصنوعی حیرت سے اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم کرو اپنی اس عینا کی فکر میری فکر کرنے کی کڑی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ دانت چباتے ہوئے بولی اور اس کی آواز صرف زین سن سکا تھا جس کی وجہ سے اس کا تہقہ ابھرا۔

”کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟“ زونیہ بیچ میں ٹپکی۔  
”تمہیں کیوں بتا میں؟“ زین فوراً بولا۔

”اوھر آؤ زونی میں بتاؤں کیا ہوا ہے؟“ وہ اسے چڑانے لگی۔

”خبردار جو تم نے کسی کو کچھ بتایا۔“ وہ اسے وار کرتے ہوئے بولا مگر وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تائی جان کی طرف بڑھی۔ آج وہ اپنے آپ

سب کے سامنے نارمل رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
”تائی یہ جو زین ہے نا۔۔۔“

”ہاں بیٹا کیا ہوا کچھ کہا اس نے تم سے؟“  
”جی تائی جان بہت بد تمیز ہو گیا ہے آج کل بہت جگ کرتا ہے یونیورسٹی لے کر جاتے ہوئے بائیک بھی ایسے چلاتا ہے جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔“ وہ لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”کیوں بھی؟ کیوں تنگ کرتے ہو میری بیٹی کو۔“  
تایا جان نے اس کی سائیڈ لی۔

”نہیں ابوجی میں نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا اس کی تو عادت ہے لڑکا بلیوں کی طرح لڑنے کی اور ہر وقت شکایتیں لگاتی رہتی ہے۔“ وہ اس کے الزام پر تڑپ اٹھا تھا۔

”بھائی جان! آپ کبھی عرشی کے بھی کان کھینچ لیا کریں یہ بھی کسی سے کم تو نہیں ہے۔“ اب کی بار امی بولیں تو وہ برے برے منہ بنانے لگی۔

”امی میں آپ کی بیٹی ہوں یا زین آپ کا بیٹا ہے۔“  
”تو تم کیوں میری امی اور ابو کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہو وہ میرے امی ابو ہیں یا تمہارے چچکو کہیں کی۔“  
زین مقابلے پر اتر آیا۔

”تایا جان اس سے کہیں اپنی زبان بند رکھے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس سے پہلے کہ تایا جان اس کی حمایت میں ایک دفعہ پھر بولتے زین فوراً بول پڑا۔

”تم سے برا اب بھی کوئی نہیں ہے قرشی کی بچی۔“  
”اب مجھے قرشی کہنا تو چھوڑوں گی نہیں۔“

”بس کرو تم دونوں کیا بچوں کی طرح لڑتے رہتے ہو۔“ پاپا ان دونوں کو ڈپٹتے ہوئے بولے تو وہ دونوں خاموش ہو گئے مگر ایک دوسرے کو منہ چڑانا لازمی سمجھا تھا۔ ان دونوں کی یہ حرکت دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔



وہ اپنے روم میں بیٹھی تھی جب زونی عجلت میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”عرشی آئی باہر دیکھو کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے۔“  
”تو میں کیا کروں؟“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”تم آج کل مرچیں چبا کر کیوں بیٹھی رہتی ہو چلو نا ہم زین بھائی سے کہتے ہیں کہ ہمیں آکس کریم کھلانے لے چلیں۔“ وہ خوشی سے چمکی۔

”تم نے جانا ہے تو جاؤ میں نہیں جا رہی میرا ٹیسٹ ہے اس کی تیاری کر رہی ہوں۔“ اس نے بہانہ گھڑا وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے ہی لفظوں میں بری طرح پھنس جائے گی زونی بھی اس سے دو ہاتھ آگے تھی۔

”تو یہ ہاتھ میں موبائل پکڑ کر کون سے ٹیسٹ کی تیاری ہو رہی ہے۔“

”افوہ کیا مصیبت ہے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہو چلتی ہوں۔“ وہ دونوں نیچے آگئیں زین سامنے صوفے پر براجمان تھا۔

”بھائی دیکھو نا کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے۔“ زونیہ نے تمہید باندھی۔

”ہاں تو پھر۔“  
”ہمیں آکس کریم کھلانے لے چلو۔“

”زیادہ فری نہ ہو میں نہیں جا رہا۔“ اس نے صاف انکار کیا تو زونیہ نے عرشہ کو بولنے کا اشارہ کیا۔

”زین لے چلو نا پلیز۔“  
”کسی اور کو کہہ دو میں تم لوگوں کا نوکر نہیں ہوں فرینڈ کے گھر جانا ہے تو زین جائے گا۔ بازار جانا ہے تو

زین جائے گا حد ہوئی ہے بھی۔“ وہ کلس کر بولا۔

”اور کس کو کہیں کاشان اور شایان بھائی تو گھر ہیں ہی نہیں آپ جلدی گھر نہ آتے تو ہم کہتے بھی نہیں۔“ زونیہ کو غصہ آنے لگا۔

”ہاں تو وہ گھر میں ہوں بھی تو میں ہی نظر آتا ہوں ان دونوں کو اپنی بیویوں کے خروں سے فرصت ملے تو تم

دونوں کی طرف دیکھیں۔“ اتنی دیر میں ندا بھا بھی اور سونیا بھا بھی بھی چلی آئیں زین کی ان کی طرف پشت تھی جس کی وجہ سے وہ دھڑلے سے ان کی ”تعریف“

کر رہا تھا ان دونوں نے اس کی بات سن لی تھی اسی لیے



آگے بڑھ کر انہوں نے اس کا دایاں بایاں کان پکڑ لیا۔  
 ”او مر گئے۔“ زین آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔  
 ”کیا کہہ رہے تھے تم؟“ ندا بھابی بولیں۔  
 ”ہمارے خرے ختم نہیں ہوتے۔“ اب سونیا  
 بھابی بولیں تو اس نے آہستہ سے اپنے کان چھڑوائے  
 دوسری طرف زونیا اور عرشہ کا ہنس ہنس کر برا حال  
 ہو رہا تھا۔

”نہیں بھابی ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو بس  
 کہہ رہا تھا اب آپ ان کی ذمہ داری ہیں نا آپ دونوں  
 کی ذمہ داری اٹھانا تو ان کا فرض ہے اور آپ کے  
 خرے اٹھانا بھی میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے۔“ وہ اپنی  
 صفائی دیتے ہوئے بولا۔

”چلو معاف کیا ویسے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“ ندا  
 بھابی ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولیں۔

”بھابی دیکھیں نا میں بھائی سے کہہ رہی ہوں  
 ہمیں آکس کریم کھلانے لے چلیں مگر یہ مان ہی نہیں  
 رہے۔“ زونیا بھابی کی طرف بڑھتے ہوئے  
 بولی۔

”ہاں زین یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے چلو سب مل کر  
 چلتے ہیں۔“ سونیا بھابی بھی خوش ہو گئیں۔

”ٹیک نہ شد چار شد۔“ اس نے محاورے کا  
 ستیاناس کیا۔

”میں نہیں جا رہا۔“ اس نے اپنی طرف سے بات  
 ختم کی۔

”مجھ سے بات مت کرنا۔“ عرشہ اتنا کہہ کر رکی  
 نہیں ٹیرس پر چلی گئی اور وہ جانتا تھا وہ ناراض ہو گئی  
 ہے۔ جب بھی وہ ناراض ہوتی تھی وہ ٹیرس پر چلی جاتی  
 تھی یا پھر اپنے کمرے میں ابھی بھی وہ فوراً اس کی  
 طرف لپکا۔

”ان دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟“ ندا بھابی نے حیرانی  
 سے زین کو جاتے ہوئے دیکھا۔ زین نے پہلے اس کے  
 کمرے میں جھانکا لیکن وہ وہاں نہیں تھی وہ ٹیرس کی  
 طرف بڑھا تو وہ ریٹنگ پر ہاتھ رکھے زار و قطار رو رہی  
 تھی۔

”ناراض ہو گئی ہو؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے  
 بولا۔

”کیوں آئے ہو میرے پاس جاؤ اپنی عینا کے پاس  
 اسی کی خواہشات پوری کرو۔“ فطری جیلسی در آئی۔  
 ”اچھا سوری نا۔“  
 ”تم جاؤ یہاں سے۔“

”کیوں ظلم کر رہی ہو اپنی ان چنی چنی آنکھوں پر  
 اس نے اسے ہنسانے کی کوشش کی مگر وہ اب بھی رو رہی  
 تھی وہ ایسے کبھی بھی نہیں روئی تھی اگر روئی تو  
 تھوڑی دیر بعد چپ کر جاتی وہ اتنے دنوں کا غبار نکال  
 رہی تھی جب سے محبت جیسے خوبصورت احساس۔  
 اس کے دل پر دستک دی تھی وہ بجائے کھلنے کے  
 میر جھاگتی تھی اس احساس نے اس کی خوشی چھین لیا  
 تھی وہ سوچتی تھی کاش اسے محبت نہ ہوتی ہوتی اور اگر  
 ہوتی تو کسی ایسے شخص سے ہوتی جسے اس سے محبت  
 ہوتی اسے اب زرا اس بات پر رونا آنے لگا تھا۔  
 کھڑے زین نے اسے کھل کر رونے دیا وہ بھی کبھی  
 کبھی زیادتی کر جاتا تھا اب وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی  
 زین کے دل کو کچھ ہونے لگا برداشت ختم ہو گئی تو اس  
 کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”عرشی اپلیز چپ کر جاؤ سوری کر تو رہا ہوں مانا  
 ہوں غلطی ہو گئی مگر اس میں اتنا رونے والی کون سی بات  
 ہے پہلے بھی تو ہم دونوں میں جھگڑا ہوتا تھا تم نے پہلے تو  
 اس طرح ری ایکٹ نہیں کیا آج کیا ہو گیا ہے؟“

”میں نے... میں نے کمانا تم جاؤ یہاں سے۔“ وہ  
 ہچکیوں کے درمیان بولی۔

”عرشی کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“  
 ”تم نہیں سمجھو گے۔“

”کیا مطلب؟“  
 ”کچھ نہیں۔“

”اچھا چلو اب کان پکڑتا ہوں اب کچھ نہیں کہو  
 تمہیں برا مس۔“ وہ کان پکڑتے ہوئے بولا تو وہ رونے  
 رو تے ہنس دی جبکہ زین اس کو دیکھتا رہا۔  
 ”زین عینا بہت خوبصورت ہے؟“ وہ آنسو صاف

کرتے ہوئے بولی۔  
 ”عرشی محبت خوبصورتی سے تو مشروط نہیں ہے  
 محبت تو دلوں سے مشروط ہوتی ہے محبت کے لیے دل  
 کا خوبصورت ہونا ضروری ہے صورت کا نہیں دیکھنے  
 والی آنکھ خوبصورت ہونی چاہیے اور جب ہم کسی سے  
 محبت کرتے ہیں تو اسی کی صورت سب صورتوں  
 سے اچھی لگنے لگتی ہے جس کو دیکھتے ہی سکون مل  
 جائے اور دل کی کھیتی سیراب ہو جائے اسی لیے جس  
 شخص سے ہم محبت کرتے ہیں اس کا خوبصورت ہونا  
 ضروری نہیں ہے اور ویسے بھی محبت کی نہیں جاتی  
 ہو جاتی ہے اور جس سے محبت ہو جائے وہی  
 خوبصورت لگنے لگتا ہے چاہے اس سے خوبصورت  
 کتنے بھی چہرے آپ کے سامنے آجائیں اگر محبت سچی  
 ہے تو اس کے علاوہ کوئی اچھا نہیں لگے گا اور ویسے بھی  
 جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ میرے لیے بہت  
 خوبصورت ہے دیش اسٹ۔“ وہ اس کے چہرے پر  
 نظریں جمائے گھبیر لہجے میں بولتا کوئی اور ہی زین لگا تھا  
 اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا جس نے عرشہ کو چونکنے  
 پر مجبور کر دیا۔ زین کے لیے بھی وہ کوئی اور ہی عرشہ  
 تھی جسے آج اس نے پہلی بار اس طرح روتے ہوئے  
 دیکھا تھا۔



عرشہ کے ایگزام شروع ہو چکے تھے اور وہ پوری  
 طرح ان کی تیاریوں میں مگن تھی اس وجہ سے گھر میں  
 ہونے والی ہلچل کی اس کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ زین  
 نے نہ جانے مائی جان کے کانوں میں کیا اسم پھونکا تھا۔  
 انہوں نے امی اور بیلا سے بات کی تو ان کی خوشی کی انتہا  
 نہ رہی۔ روزانہ شام کو دیر تک بیٹوں کی مینٹنگ چلتی  
 جس میں کاشان بھائی اور شایان بھائی بمعہ اپنی بیگمات  
 کے شامل ہوتے۔ وہ رات کو پیپر کی تیاری کر رہی تھی  
 جب امی اس کے پاس آئیں۔  
 ”کیا کر رہی ہو بیٹا؟“  
 ”امی پیپر کی تیاری کر رہی ہوں صبح لاسٹ پیپر ہے

گھر آکر سارا دن سوویں گی۔“ وہ انگڑائی لیتے ہوئے  
 بولی۔

”اچھا بیٹا ایک بات پوچھوں؟“ عرشہ ان کے انداز  
 پر ٹھٹھکی گئی پھر حیرانی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے  
 بولی۔

”جی امی۔“  
 ”تمہیں زین کیسا لگتا ہے؟“ ان کے پوچھنے کا انداز  
 ہی ایسا تھا کہ وہ حیران سی ان کی شکل دیکھنے لگی پھر  
 سنبھلتے ہوئے بولی۔

”اچھا ہے امی آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“  
 ”پھر بھی کیسا لگتا ہے؟“  
 ”اچھا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر اسے پیار کر کے چلی  
 گئیں جبکہ وہ اپنی جگہ بت بنی رہ گئی اب وہ امی کو کیا  
 کہتی۔ امی یہ سب کیوں پوچھ رہی تھیں؟ اگر ایسی  
 ویسی کوئی بات ہوتی تو کیا زین سے کسی نے پوچھا ہے؟  
 یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس نے سوچتے ہوئے جھنجھلا کر  
 بک کو بیڈ پر پٹنا پھر تھوڑی دیر بعد لائٹ آف کر کے  
 سو گئی۔

عرشہ لاسٹ پیپر دے کر گھر آئی اور اپنی نیند پوری  
 کرنے کی غرض سے سو گئی۔ شام کو ندا بھابی سونیا  
 بھابی اور زونیا آندھی طوفان کی طرح اس کے کمرے  
 میں داخل ہوئیں اور اس کا کمبل کھینچ کر اتار دیا جس  
 کے نتیجے میں وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور گھبرا کر پوچھا۔  
 ”کیا ہوا؟“ مندی مندی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں  
 مگر زین ابھی تک سویا ہوا تھا۔

”وہاں تمہاری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ہو گیا ہے اور تم  
 یہاں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہو۔“ ندا  
 بھابی تیزی سے بولیں۔

”کیا مطلب؟ سونے دو یا بہت نیند آرہی ہے۔“  
 وہ ان کی بات کو نظر انداز کرتی دوبارہ لیٹ گئی مگر زونیا  
 اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”پتا ہے سب تمہیں میری چھوٹی بھابی بنانے  
 والے ہیں اب اٹھ جاؤ پلینز۔“ اس کا زین جو تھوڑا



بہت جاگ گیا تھا اب پوری طرح جاگ گیا اور آنکھیں بھی پوری طرح کھل گئیں۔ وہ اس کی بات پر اچھل پڑی اور فوراً کھڑی ہو گئی۔

”کیا کیا کہہ رہی ہوں؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟“

”کیوں کیا ہوا؟ اس میں اتنی حیرانی والی کون سی بات ہے کیا تمہیں زین بھائی اچھے نہیں لگتے؟“ زونہ پریشانی سے بولی مگر اس کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

”یہ سب کس نے کیا ہے زین سے پوچھا کسی نے؟“

”بھئی اسی نے تو امی سے بات کی تھی کہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ لہذا جلد از جلد منگنی وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔“ ندا بھابھی نے وضاحت دی۔

”کیا؟ مگر وہ عینا۔۔۔ زین کہا ہے؟“ وہ چیخ پڑی مگر سنبھلتے ہوئے بولی۔

”لپے کمرے میں۔“ سونیا بھابھی بولیں تو وہ فوراً وہاں سے نکل پڑی جبکہ وہ تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

وہ تن فن کرتی زین کے کمرے میں پہنچی اور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا اور اجازت ملتے ہی اندر چلی گئی وہ بیڈ پر نیم دراز وہی تصویر ہاتھ میں لیے اسی انداز میں دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا ہے زین؟“

”تصویر ہے۔“ وہ حد درجہ معصومیت سے بولا۔

”افوہ میں اس کی بات نہیں کر رہی یہ گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ تم۔۔۔ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو اگر تم نے کسی کے دباؤ میں آکر یہ سب کیا ہے تو انکار کر دو میں۔۔۔ میں تائی جان اور تایا جان کو منالوں کی تم بالکل فکر نہ کرو تم کیسے آسانی سے اپنی محبت سے دستبردار ہو سکتے ہو زین یہ سب کیا ہے؟“ وہ بغیر کوا فل اشاپ کے بولے جارہی تھی اور زین لبوں پر گہری مسکراہٹ سجائے گہری نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے چپ ہونے پر آہستگی سے بولا۔

”مہو گئی تقریر ختم؟ کتنی دفعہ کہا ہے پہلے کسی کی پوری بات سن لیا کرو پھر بولا کرو یہ سب میری مرضی سے ہوا ہے سنا تم نے۔“

”لیکن زین وہ عینا۔۔۔ اگر عینا نہیں مان رہی تو میں اس کو منالوں کی تم مجھے اس سے ملوادو۔“

”عینا مان چکی ہے اس کو بھی مجھ سے محبت ہے۔“

”زین پھر یہ سب کیا ہے؟ کیوں الجھا رہے ہو مجھے۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”الجھا کب رہا ہوں میں تو سمجھا رہا ہوں عینا کی تصویر دکھاؤں تمہیں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ تکیے کے نیچے سے تصویر نکال کر اس کے سامنے لے آیا تو عرشہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”یہ۔۔۔ یہ تو میری تصویر ہے۔“ جب اس نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ”ون اینڈ اوٹلی مائی عرش“ لکھا ہوا تھا۔

”زین یہ سب کیا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا وہ عینا کون تھی پھر۔“ ابھی بھی اس الجھی ڈور کا سرا عرشہ کے ہاتھ نہ لگا تھا زین سر پیٹ کر رہ گیا۔

”عقل سے بیدل ہو بالکل ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا تو آرام سے بیٹھو اور سنو۔“ وہ اسے کندھوں سے تھام کر بیڈ پر نکاتے ہوئے بولا اور خود کچھ فاصلے پر بیٹھ کر بولنے لگا۔

”عینا تم ہی تھیں۔ تمہارا فرضی نام میں نے عینا رکھ دیا تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن تم مجھ سے محبت نہیں کرتی تھیں اسی لیے میں نے تمہارے سامنے عینا کا ذکر کیا کہ ہو سکتا ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو لیکن ظاہر نہ کرتی ہو اور عینا کے بارے میں سن کر تمہاری فیملنگز ظاہر ہو جائیں لیکن میرا انداز غلط تھا تم واقعی مجھ سے محبت نہیں کرتی تھیں۔ پھر میں نے تمہیں دعا کرنے کے لیے کہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم سچے دل سے میرے لیے دعا کرو گی اور جو دعا سچے دل سے کی جاتی ہے وہ قبول بھی تو ہوتی ہے۔ مجھے بھی

دعاؤں پر بہت یقین تھا میں بھی دعا کرتا تھا کہ تمہارے دل میں میرے لیے محبت پیدا ہو جائے اور تم نے بھی میرے لیے دعا کرنی شروع کر دی عینا کا تو سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا وہ تم ہی تھیں اس طرح تمہارے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی۔

تمہاری محبت مجھے آنکھوں میں نظر آنے لگی تھی مگر مجھے یقین نہیں تھا ایک دن تم رات کو دعا مانگ رہی تھیں کہ اچانک میں تمہارے کمرے میں آ گیا تمہاری میری طرف پشت تھی اسی لیے میں نے تمہیں دعا مانگتے ہوئے سن لیا اس بل مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور تمہیں مجھ جیسے ”فضول انسان“ سے محبت ہو گئی بس یا اور کچھ؟“ وہ اس کے انکشاف پر حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی پھر تھوڑے وقفے کے بعد سنبھلتے ہوئے بولی۔

”تو تم سیدھی طرح یہ بات منہ سے نہیں پھوٹ سکتے تھے میں کتنا روٹی ہوں اس کا اندازہ ہے تمہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے لیکن میں کون سی بات اپنے منہ سے سیدھی طرح پھوٹا۔“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

”یہ ہی کہ تم مجھ سے۔۔۔“

”کیا میں تم سے۔۔۔؟“

”یہ ہی کس۔۔۔“ اس نے بات کرتے کرتے اچانک اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی وہ اس کی نظروں کا مفہوم جان چکی تھی کہ وہ اس کے منہ سے اگلا نا چاہتا ہے۔

”بہت فضول انسان ہو تم۔“ اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اب کیا کیا جاسکتا ہے تمہیں تو اس ”فضول انسان“ سے محبت ہو گئی ہے۔“

”اگر میں اب انکار کروں تو پھر۔“ وہ اتراتے ہوئے بولی۔

”اب تو محبت ہو گئی ہے انکار کرنے کا حوصلہ ہے؟ ویسے میں نے شادی ابھی اس لیے نہیں کروائی کہیں تم

فیل نہ ہو جاؤ ایک دفعہ پاس ہو جاؤ پھر ہی شادی کریں گے۔“ وہ اس کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے خود جنٹلمن ہو تو ہر کسی کو نالائق ہی سمجھتے ہو میں بے شک کم نمبروں لیکن پاس ہو جاتی ہوں کبھی فیل نہیں ہوتی۔“ وہ اپنی ٹون میں واپس آ چکی تھی۔

”ویسے تم ایگزام میں اچھے نمبروں سے پاس ہو یا نہ ہو لیکن یہاں تم بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو چکی ہو۔“ وہ شہادت کی انگلی اپنے دل پر رکھتے ہوئے بولا تو وہ آہستہ سے ہنس دی۔ دونوں کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں دونوں نے دعاؤں کے ذریعے ایک دوسرے کو پایا تھا۔

☆ ☆

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

# میرے ندیم

قیمت - 275 روپے

## رضیہ جمیل

منگوانے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021



# حسرت کا شکار

”اور یہ شام بھی زندگی کے نام ہوئی۔“ بس سے اتر کر تھکے تھکے قدموں سے گھر تک کا سفر طے کرتے ہوئے منتی نے سوچا۔

بابا کی دوائیاں، یوٹیلٹی بلز، غنی کے کالج کی فیس، اگلے دن کے کاموں کی فہرست ابھی سے تیار ہونی شروع ہو گئی تھی۔

”کاش... آسمان سے کوئی شہزادہ اترے اور میرے سارے دکھوں کو سکھوں میں بدل دے۔“ اشاپ سے گھر تک کے دس منٹ کے دورانیے میں شاہ خاں کی بلا شرکت حکمرانی میں کالے اوڑے بادلوں نے ایسا شب خون مارا کہ ساری روشنی کو تاریکی کا لبادہ اوڑھا دیا۔ اس کے گھر تک پہنچتے پہنچتے خوب زوردار گھمسان کے ٹکراؤ کے بعد ٹپ ٹپ بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں۔

”شکر ہے کہیں کا تو جس ٹوٹا۔“ وہ گھر میں داخل ہوئی برآمدے سے ابا کے کمرے میں گھسنے کے وقفے کے دوران ہی موسم کی پہلی بارش اسے بھگو چکی تھی ابا اپنے بستر پر آنکھیں موندے لیٹے تھے وہ کتنی دیر چوکھٹ پکڑے ان کے وجود کو آنکھوں میں سمائی رہی ہمیشہ کی خواہش نے پھر سے زور پکڑ لیا۔

”بھی تو ایسا ہو کہ وہ لوٹے تو ابا اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گلے لگالیں۔“ بیتے دنوں کی ریاضت کے ثمر کا کوئی تو امکان پیدا ہو، کچھ بہت پرانی بات بھی نہیں بس چار سالوں کا ہی تو عرصہ جھیلا تھا اس نے اماں کی ایکسپینڈنٹ میں ڈیپتھ ابا کا پیرالائز ہو جانا ایک ساتھ دو بڑے غم اس ننھی جان پر ایسے پڑے کہ اب تو مشکلیں اتنی پڑیں مجھ

پر کہ آسمان ہو گئیں حالانکہ اس کا نمبر تو دو سرا تھا لیکن بس وہ ہی جب قسمت کسی کا پیچھا لے لے تو نمبر، کچھ نہیں دیکھتی، ابا کی پرسکون نیند کا اطمینان کر کے سب کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”کتنی دفعہ کہا ہے کہ ابا کو کمرے میں اکیلا نہ چھوڑا کرو خدا نا خواستہ کچھ ہو گیا تو وہ تو آواز دے کر بلانے کے بھی قابل نہیں۔“ ہدیٰ آپی کے سلام کا جواب دینے کے ساتھ اس نے سدرہ کو خالی بیٹھے دیکھا تو بول پڑی۔

”گھر سے باہر ہی نہیں اندر بھی سو کام ہوتے ہیں۔“ ترخ کر جواب دیتی سدرہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

اس کے جوگر زکی پس کھولتے ہاتھ ساکت رہ گئے۔

”اسے کیا ہوا؟“ اس نے حیرانی سے ہدیٰ آپی کی جانب دیکھا۔

”کچھ نہیں دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا ہو جائے صحیح تم فکر مت کرو۔“

”لیکن...“ وہ کچھ کچھ کہتے رک گئی۔ سدرہ آؤٹ اسپوکن ضرور تھی لیکن بد تمیز نہیں تھی۔ الماری سے کپڑے نکال کر چنچ کر کے تک اس کا ذہن سدرہ کے رویے پر الجھ سا گیا اسی الجھے ذہن کے ساتھ نماز ادا کر کے جب وہ ہدیٰ آپی کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھی تو انہوں نے ایک اور سوچ کی ڈوری اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

”شہریار کی بھابھی آئی تھیں وہ لوگ اور انتظار نہیں کر سکتے اگلے دو مہینوں میں اگر ڈیٹ نہیں دی تو وہ بات ختم کر دیں گے۔“ شاید ہدیٰ آپی بھی اس کھیل سے تھک گئی تھیں کوئی مشورہ دیا اور نہ ہی کسی رائے

اظہار کیا۔ محض ایک خبر ہی اس تک پہنچائی گئی تھی چار منٹ روٹی کا نوالہ ہاتھ میں پکڑے رہنے کے بعد وہ پلیٹ کھسکاتی اٹھ کھڑی ہوئی ہدیٰ آپی اس کی باڈی لینگویج سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگاتی رہ گئیں۔

وہ کمرے میں آکر اندھیرا کر کے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی لیکن اندھیرا کرنے یا آنکھیں بند کر لینے سے ہر چیز تو محو نہیں ہو جاتی بعض چیزیں تو ہر وقت سوتے

جائے آتے آنکھیں بند کر لویا کھول لو، اپنی تنہائیاں لیے آپ کے ذہن پر سوار رہتی ہیں۔

”شہریار درانی اور منتی فرید دو ایک سالوں سے نہیں پانچ سالوں سے جڑا نام ٹوٹ جائے گا تو وہ کسے آنکھوں کے پیچھے خواب سجائے گی زندگی چاہے کتنی کڑوی نامہریاں سہی سوچ کے سہارے کے لیے ایک کرن تو موجود تھی اب وہ کرن بھی مٹنے کو تھی۔“ رات

جائے آتے آنکھیں بند کر لویا کھول لو، اپنی تنہائیاں لیے آپ کے ذہن پر سوار رہتی ہیں۔

”شہریار درانی اور منتی فرید دو ایک سالوں سے نہیں پانچ سالوں سے جڑا نام ٹوٹ جائے گا تو وہ کسے آنکھوں کے پیچھے خواب سجائے گی زندگی چاہے کتنی کڑوی نامہریاں سہی سوچ کے سہارے کے لیے ایک کرن تو موجود تھی اب وہ کرن بھی مٹنے کو تھی۔“ رات

جائے آتے آنکھیں بند کر لویا کھول لو، اپنی تنہائیاں لیے آپ کے ذہن پر سوار رہتی ہیں۔

”شہریار درانی اور منتی فرید دو ایک سالوں سے نہیں پانچ سالوں سے جڑا نام ٹوٹ جائے گا تو وہ کسے آنکھوں کے پیچھے خواب سجائے گی زندگی چاہے کتنی کڑوی نامہریاں سہی سوچ کے سہارے کے لیے ایک کرن تو موجود تھی اب وہ کرن بھی مٹنے کو تھی۔“ رات



کے نہ جانے کون سے پریند نے اسے اپنا ساتھی بنالیا۔

صبح حسب معمول کام نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ ہڈی آبی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا نہ بھولی تھی۔

”خوآنخواہ دو مہینے کا انتظار کروائے وہ اس بے چارے کو ابھی وہی جواب دے دے جو دو مہینے بعد دینا ہے تو کیا پتا وہ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی بھی کر لے اور آج کل کے دور میں لڑکی ملنا بھی تو بہت آسان تھا اور ارزاں بھی۔“ یونیورسٹی کے دو سالوں کی رفاقت جب وہ رومیو جولیٹ کے لقب سے پکارے جاتے تھے وقت بھی کیا ظالم شے ہے ہر جذبے کو فنا کر دینے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ جانے یہ محبت بھی بھی یا محض دل لگی یا ساروں کی تلاش اب دل کو بھی کون بہلائے اور کہاں تک اسے خود تو یہی لگ رہا تھا کہ اسے کوئی دکھ نہیں ہے ایک ایسا کچا دھاگہ جس میں پہلے ہی پانچ سالوں میں نہ جانے کتنی گرہیں لگ چکی تھیں اس دھاگے کا ٹوٹ جانا ہی بہتر تھا۔ پھر امید صاحب بھی تو کہتے ہیں۔

چاہتوں کے رشتوں میں گرہ نہیں لگتی لگ بھی جائے تو اس میں وہ کشش نہیں رہتی پھیکا پھیکا سا رابطہ تو رہتا ہے تازگی نہیں رہتی لیکن سینے میں دھڑکتا لو تھڑا اس کی دہائیاں ہی ختم ہونے میں نہ آتی تھیں چاہے سلوں کے نیچے ہی کیوں نہ دباؤ اس نے بھی قبول کر لیا۔

ابھی کچھ دن لگیں گے دل ایسے شہر کے پامال ہونے کا منظر بھول جانے میں

آفس میں صبح صدف نے جب اس سے اس کی ویرانی کا سبب پوچھا تو اس نے خوآنخواہ کی ری چیکنگ کرتے ہوئے کی بورڈ پر بلاوجہ ہاتھ چلاتے ہوئے آسان لفظوں سے ادھورے رشتے کے اختتام کو نیوز رپورٹر کے انداز سے روز کی معمول کی خبروں کی طرح سنا دیا لچ بریک کا وقت آیا تو اسے گھڑی کی سوئیوں کی رفتار سست لگنے لگی وقت کبھی کبھی بہت بھاری بھی

ہو جاتا ہے صدف کو نشتر چھبھنے کی عادت نہیں تھی لیکن کچھ دورانیے ایسے ہوتے ہیں ناکہ مرہم بھی نمک جیسی تکلیف دیتا ہے منتی بھی ایسے ہی دورانیے کا شکار تھی۔

”مجھے تو تم نے یہ خبر دی ہے لیکن محب عالم کو کس نے بتایا ہے اس بارے میں۔“ صدف اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی منتی چونک گئی۔

”محب عالم۔۔۔ اسے پتا چل گیا۔“

”ہاں شاید کینٹین میں ملا تھا کہنے لگا آپ کی دوست منتی بی بی خیریت سے ہیں تمہاری خیریت دریافت کر رہا تھا میں نے کہا خود جا کر پوچھ لو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ تو بس مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈال کر چلا گیا اور ویسے بھی منتی تم اتنی ٹیشن کیوں لے رہی ہو ایک نہ ایک دن تو سب کو علم ہو ہی جائے گا نام خود تیا دو اور تمہاری منگنی، شہریار سے تمہارا تعلق تمہارے حالات کسی سے کچھ چھپاؤ نہیں تھا۔“ صدف ناصحانہ انداز اپنائے ہوئے تھی۔

کتنا عجیب لگتا ہے نا جب آپ اپنے آپ کو بہت مضبوط سمجھتے ہوں پھر اچانک آپ کو پتا چلے کہ آپ کی سیاری مضبوطی تو کسی اور کے سہارے پر انحصار کرتی تھی تو آپ یوں ہی پڑمر رہ جاتے ہیں۔ واپسی میں لفٹ میں داخل ہونے ہوئے وہی ہوا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔ محب عالم سے سامنا۔۔۔ محب عالم کا اس سے پہلے اس سے تعلق بالکل اس مصرعے کے موافق تھا۔

”میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے۔“ اور اب جب وہ کسی اور کا خیال بھی نہیں رہی تھی تو نہ جانے کیوں اس سے سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔

”آپ خیریت سے ہیں؟“ شروعات محب عالم نے کی۔

”ایک ہی دن میں دو دو بار میری خیریت کیوں مطلوب ہوئی آپ کو؟“ منتی نے آخر کار سامنا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

”بعض اوقات ہوتا ہے نا ایسا کہ کوئی بات جو آپ

کی زندگی کی اولین خواہش ہو اس کی تکمیل کے رستے کھلنے لگیں تو کوئی انہونی، کوئی ڈر، خدشہ گھیر لیتا ہے جو آپ برسوں سے چاہتے ہوں وہ ہی یکدم ہونے لگے تو عجیب کیفیت ہوتی ہے دل کی کسے شاید ہم نے ایسا تو ”نہیں“ چاہا تھا۔“ محب عالم بھی عجیب ہی دنیا کا باسی تھا لفٹ سے نکل کر اسٹاپ تک وہ اس کے ہمراہ ہی رہا۔

”بہت اچھا فیصلہ کیا آپ نے ویسے بھی۔“ وہ افسانہ جسے انجام تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا ”تو آپ اس ادھورے قصے کو کہانی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔“ منتی بولی نہ جانے کیوں یہ دل تمام ضابطے توڑنے چلا تھا۔

”ہاں ایک خوشگوار اختتام کے ساتھ۔۔۔ موسم بہت خوبصورت ہو گیا ہے جس ٹوٹنے کے بعد سے۔“ محب عالم آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ایک تو یہ بولتا بہت تھا۔

منتی پک گئی تھی اس کی مستقل بکواس کو سنتے سنتے۔

”ارے آپ ہم سے کسی دانشوری کی توقع رکھتی ہیں کیا۔۔۔ ہم خرد کی دنیا سے باہر کے بندے ہیں اور۔۔۔ حرف ملامت ہی سہی آپ ہماری بات ختمے جواب میں کچھ تو بولیں بس ہماری لفاظی بے ثمر نہیں رہے بس اب یہ کہیں گے۔“

ہمہ وقت رنج و ملال کیا جو گزر گیا سو گزر گیا اسے یاد کر کے نہ دل دکھا جو گزر گیا سو گزر گیا ”دعا کیا کریں اپنے لیے بھی اور ہم بے چاروں کے لیے۔“

محب عالم کی بس آگئی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اس کی بس آنے تک کھڑا رہا۔ اپنی گرین بس میں سوار ہوتے ہوئے محب عالم کی صحبت کے اثر سے اس کی شاعرانہ روح بجھ بے وار ہونے لگی۔

تمنا بجھ گئی ہو تو دعا مانگی نہیں جاتی رتوں کی بے ثباتی سے صبا مانگی نہیں جاتی

یہ اپنی بے بسی ہے یا اب بے حسی کہہ لیں بلا کا جس ہے لیکن ہوا مانگی نہیں جاتی

\*\*\*

”محب عالم کو آپ نے ہی آگاہ کیا ہوگا۔“ منتی، ہڈی آبی سے سوال و جواب کرنے لگی۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”جو میں نے بہتر سمجھا وہی کیا منتی۔“ ہڈی آبی آرام سے بولیں۔

”آپ کو اس کا کوئی حق نہیں تھا۔“ اس کا لہجہ خراب ہونے لگا۔

”میں تم سے بڑی ہوں منتی یہ مت بھولو۔“ ہڈی آبی اس سے زیادہ سخت لہجے میں بولیں وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

”جب آپ کی عقل کسی حل کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تو بہتر یہی ہے کہ آپ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیں۔۔۔ وہ بہتر فیصلہ ساز ہو سکتا ہے۔ بہت میچور ہو سکتا ہے لیکن نہ جانے کیوں دھوکا کھا گئی تھیں تم خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا حیرت ہوتی ہے مجھے ہیرا چھوڑ کر پتھر چن لیا تم نے of Judgment Sense کہاں چلا گیا تھا تمہارا۔“ ہڈی آبی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں اب تو ہیرا نہ پتھر۔ زندگی میں کسی کی جگہ نہیں رہی ہے۔“ منتی چڑ گئی۔

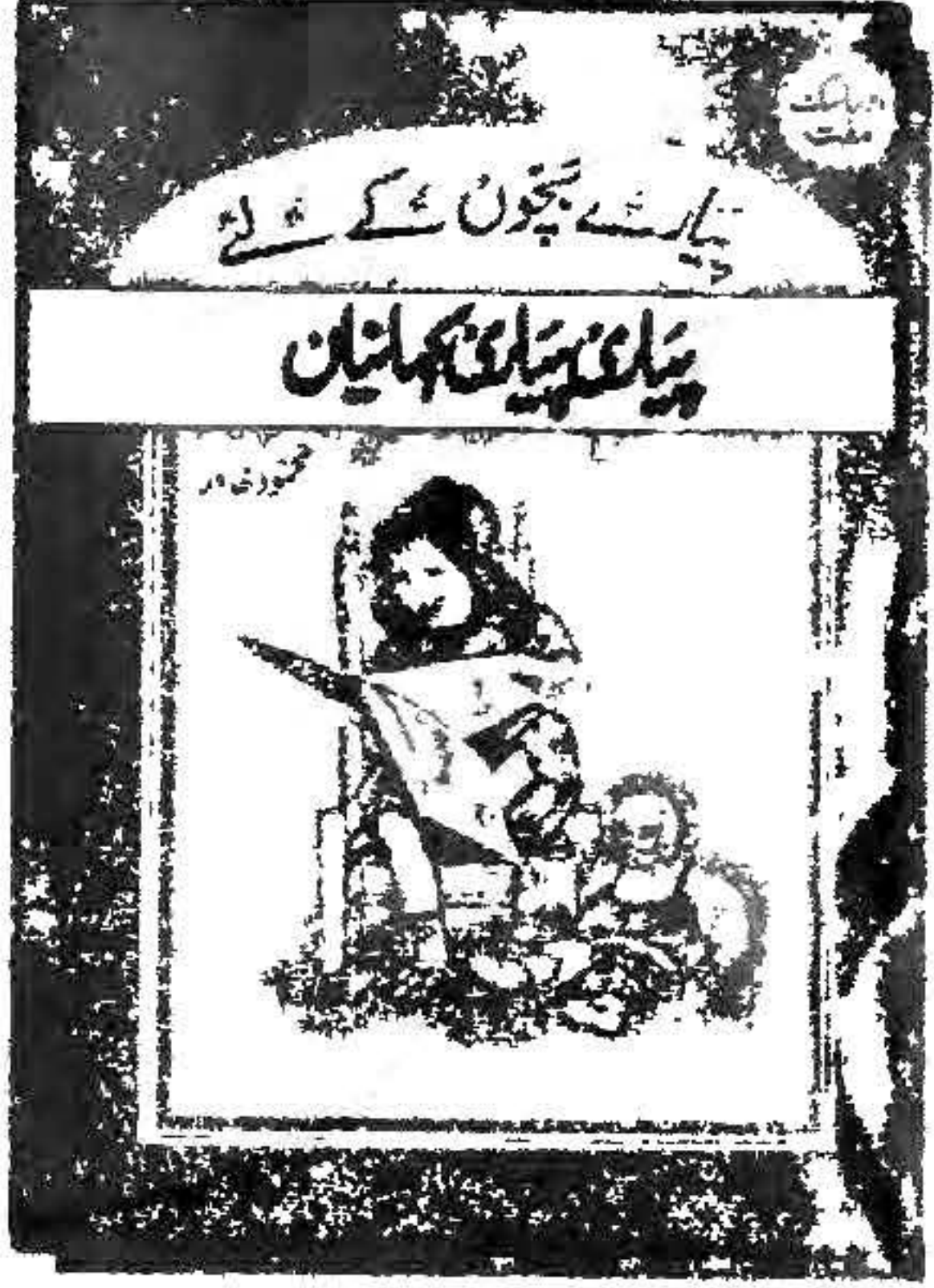
”اتنی آسانی سے کسی کے جذبات کو نہیں رگیدتے منتی ایک دفعہ اپنی پسند آزمائی تھی اب ہم پر چھوڑ دو۔“ ہڈی آبی بولیں۔

کئی کیسے ہمارا انتظار کرے گا اپنی زندگی میرے لیے بے کار کرے گا منتی کے چہرے پر استغنائیہ مسکراہٹ سج گئی۔

”جس جذبے کا مالک محب ہے نا اس میں انتظار بے کار نہیں ہوتا۔ اور سب سے بڑی بات کیا یہ منظر



# پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

## محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں  
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے  
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے  
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

تھے غنی نے لاہور میں اپنے کیریئر کا آغاز کر لیا  
تھا۔ لیکن اس کا منظر اب تک وہی تھا وہی ویرانی دل  
نفسی حیات، کبھی سوچتی پیچھے مڑ کر نہ دیکھوں۔  
”کیا پتا کوئی واقعی سولی پر لٹکا ہو۔“ کبھی سوچتی اس  
نے کون سی خبر گیری کی اتنے سال خواہ مخواہ میں پلٹوں  
اور سبکی کا احساس ہو اور میں نے کون سا کوئی وعدہ کیا تھا  
اور جب خود ہی دل و دماغ کی جنگ اختتام پر پہنچی تو  
موبائل میں Save ہوا شناسا ممبر جاگ اٹھا۔

اے جنوں سکھلا ذرا آداب محفل مجھے  
ہاں بنا دے اب حضور دوست کے قابل مجھے  
ن ترانی کہہ کر میرے شوق کو رسوا کیا  
آپ نے سمجھا تو ہوتا دید کے قابل مجھے  
ان باکس میں دیگر بیخامت کی آمدورفت جاری رہی  
روزانہ باکس چیک کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر وہ  
نئے سرے سے پیغام کو پڑھتی مطلب اخذ کرنے کی  
کوشش کرتی سات دن گزر گئے کہ اسکرین پر وہ نمبر پھر  
جگمگایا۔

کٹ ہی گئی جدائی بھی یہ کب ہوا کہ مر گئے  
ترے بھی دن گزر گئے میرے بھی دن گزر گئے  
راہوں میں ملے تھے ہم راہیں نصیب بن گئیں  
تو بھی نہ اپنے گھر گیا ہم بھی نہ اپنے گھر گئے  
وہ بھی غبار خاک تھا ہم بھی غبار خاک تھے  
وہ بھی کہیں بکھر گیا ہم بھی کہیں بکھر گئے  
ترے لیے چلے تھے ہم ترے لیے ٹھہر گئے  
تو نے کہا تو جی اٹھے تو نے کہا تو مر گئے  
”اب تمہیں اور کن الفاظوں کا مدعا چاہیے منتی“  
دل نے دماغ کو لتاڑا لیکن وہ بھی کیا جواب دیتا  
اور آٹھویں دن پھر ایک پیغام ان باکس کی زینت تھا۔  
جانے کو ہے ہمارا اب آ بھی جائے  
ہاتھوں میں نہ سوکھ جائے یہ گجرا گلاب کا  
نچ آفس کے رستے پر دوڑتی گاڑی کا رخ خود بخود  
ہی محب عالم کے گھر کی جانب ہو گیا کیونکہ اسے سوکھے  
گلابوں کا گجرا پسند نہ تھا۔

نہیں لارے تھے تو اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا منتی  
زیدی کے کیسے تانے کا مقصد بس یہی ہے کہ ہر دور  
میں ایک دقت ایسا ہوتا ہے جب ہر بندہ ہر چیز ہر  
دعا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ہر وہ کام جس پر  
بعد میں اسے پشیمانی کا احساس ہوتا ہے اور جسے وہ  
بعد میں اپنی نادانی گروانتا ہے تو محب عالم تم یہ نادانی  
مت کرو۔ منتی کا ٹھہرا ہوا الجہ بر سکون تھا۔

”ادائے عشق کو آپ نادانی کا نام دیتی ہیں تو دے  
لیجیے جناب ہم تو سوداگی لوگ ہیں۔ آپ کا کیا گاڑ  
رہے ہیں جو آپ پریشان ہوتی ہیں۔“ محب عالم واقعی  
عجیب تھا۔ منتی چڑ گئی۔

”آپ میرا گاڑ بھی کیا سکتے ہیں اور میں پریشان ہوں  
گی بھی تو کیونکہ ایک انسانیت کے ناتے سے  
سمجھانے چلی آئی تھی خواہ مخواہ میں کسی کے پیچھے زندگی  
کے خوبصورت ایام کو برباد کرنا دانشوری نہیں۔“

”چھوٹیے منتی۔ ہماری فکر مت کیا کریں ہم  
تو وہ لوگ ہیں۔“

ہم لوگ ہیں خانہ خراب اور طرح کے  
بس جائیں تو صحرا ہیں اجڑ جائیں تو دنیا  
”بس نوازش یہ ہوگی کہ ہمارا انتظار تو آخری شام  
تک ہوگا لیکن آپ روایتی ستم گری نہیں برتیں گے  
ہمارے ساتھ۔“ محب عالم چلا گیا تھا۔ نہیں گیا تو  
کہیں نہیں تھا چپ چاپ انتہائی خاموشی سے ڈیرہ  
ڈال لیا تھا اس نے دہلیز پر اور منتی۔ سوچتی ہی رہ  
گئی۔

پھر کچھ یوں ہوا کہ غم معاش کے بوجھ نے تمام  
غموں کو ایک طرف کر دیا اس نے تین سال خود سے  
بھی اجنبی ہو کر گزار دیے اور اب جب سارے غموں  
کا علاج ہونے لگا تو کسی شناسا کی ریاضت کا احساس  
ہونے لگا۔

منظر بدل چکا تھا ویسا ہی جیسے ہدیٰ آئی کی سوچ  
تھی۔ سدرہ اپنے گھر کی ہو گئی تھی ہدیٰ آئی بابا کو لے  
کر سعودیہ شفٹ ہو گئی تھیں ان کے شوہر بابا کے بھتیجے

تبدیل نہیں ہوگا؟ چند سالوں کی بات ہے سدرہ اپنے  
گھر کی ہو جائے گی غنی اپنا کیریئر کا آغاز کر لے گا۔  
ہدیٰ آئی کی اپنی خوش گمانیاں تھیں اور ہر بندہ اپنے  
دماغ سے ہی سوچے گا ہمارے دماغ سے تو نہیں رائے  
میں اختلاف کوئی انہونی تو نہیں پھر۔

\*\*\*

”اماں آپ کو یاد کر رہی تھیں۔“ محب عالم سے  
آج پھر اتفاقہ ملاقات سرور دین رہی تھی۔

”محب عالم بعض چیزیں آپ کی دسترس میں ہونے  
کے باوجود آپ کے نصیب کا حصہ نہیں ہوتیں۔“ وہ  
اس موضوع کو کلوز کرنا چاہتی تھی شاید اسی لیے  
شروعات کر دی۔

”آپ کو میرے نصیب کی بڑی آگاہی ہے۔“  
اس کا الجہ عجیب سا تھا۔

”لا حاصل کے لیے بے کار انتظار سے کیا حاصل  
محب عالم اور اب جب سب کچھ راکھ ہو گیا ہے تم  
کیوں چنگاری تلاش کرتے ہو۔“ منتی فرید چٹختے  
ہوئے لہجے میں بولی۔

رواں ہے نبض دوراں گردشوں میں آسماں سارے  
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا  
”ایسی بات مت کہجیے گا حاصل اور لا حاصل کی  
وہ تو الگ ہی فلسفہ ہے۔“

عجب سلسلہ ہے نماز محبت کا  
کبھی ادا کر کے روئے کبھی قضا کر کے روئے  
محب عالم کے انداز میں پھر وہی شوخی بے نیازی در  
آئی جس سے منتی کو چڑ تھی۔

”انتظار بہت جاں گسل ہوتا ہے۔ سولی پر لٹکا دیتا  
ہے انسان کو۔“ منتی نے کہا۔

”آپ رسی کی فراہمی کا امکان تو پیدا کریں ہم سولی  
پر بھی چڑھ جائیں گے ابھی آپ نے پیمائش نہیں کی  
منتی صاحبہ ہماری۔“ محب عالم کا الجہ بے نیاز کچھ غرور  
والا تھا۔ اسے بالکل اچھا نہ لگا۔

”شہریار کے والدین جب اس کا رشتہ میرے گھر



# اکل حصے کا

فلیٹوں کی دنیا بھی عجیب ہی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے اس قدر ملے جلے گھر کہ پرائیویسی نام کی شے عنقا ہو جائے۔ اس فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھا ہوا شخص بیٹھے بیٹھے ہی تار لے کہ سامنے والے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں جو مہمان براجمان ہے۔ وہ سوسائٹی کی کون سی کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔

یا پھر کچن میں نکالے جانے والے ریفریجمنٹ سے 'میزبان کے گھر اور دل میں ان کی حیثیت کا پتا ہی لگالے۔ اپنے کچن میں نہیں، سامنے یا برابر والے فلیٹ کے کچن کی بات ہو رہی ہے۔ اور ایسی ہی مشکل کا شکار وہ بھی تھی۔

غانیہ حسن! جو اس وقت ایک کولیگ کم دوست کو گھرانے کی حماقت کر بیٹھی تھی۔

اس کے اور وقار احسن کے فلیٹ کی بالکونیاں اور بیرونی دروازوں میں فقط چند انچ موٹی دیوار کا فاصلہ تھا۔ بننے، رونے، بولنے، جھگڑنے یہاں تک کہ لوڈ شیڈنگ کے دوران کھانسنے تک کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ رہی سہی کسر اس روشن دان نے پوری کی تھی۔ اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا۔ ستم بالائے ستم نازش کی جھگڑا طبیعت۔

ٹھیک ٹھاک جھگڑا تو اسی بات کا تھا کہ وہ یعنی غانیہ حسن اسے نازش کیوں کہتی ہے۔ بھابھی کیوں نہیں۔

کیا وہ وقار کو اپنا بھائی نہیں سمجھتی۔

”صبح صبح کم بخت مارے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بھونپو میرے سر پہ کھول کر۔“ جانے کس کی شامت آئی

تھی۔ اچھی خاصی پر سنالٹی تھی نازش کی۔ وہ اکثر کھلے دل سے اعتراف کرتی۔ وقار کے ساتھ اس کی جوڑی جچتی بھی خوب تھی۔ لیکن۔۔۔ اور اکثر ہی لوگ زبان پر آکے مات کھا جاتے ہیں۔ جیسے خود اس نے وقار نے بس زبان سے ہی تو مات کھائی تھی۔

”غانیہ!“ تابندہ کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر مسکرا دی۔

”تم بیٹھو نا۔ یہاں گرمی میں کیوں آگئیں۔ میں بس آرہی ہوں۔ چائے کے ساتھ کچھ لوگی۔“ حال میں لوٹتے ہی اسے آواب میزبانی نبھانے کا خیال آگیا۔

برابر والے گھر سے آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے وہاں گھمسان کارن تھا۔ آج وقار بھی خوب گرج رہا تھا۔ ورنہ دوبارہ بحث کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی۔

”کیوں پریشان ہو رہی ہو؟“ تابندہ نے اس کے چہرے سے کچھ پڑھا۔

”میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی ہیں۔ تو کیا ہوا اگر وہ تمہارے بھائی بھابھی ہیں اور پھر ان کا بک نما گھروں میں یہی تو برائی ہے۔ کوئی چیز کوئی بات کانفیڈنشل نہیں رہتی۔ کبھی کبھی توئی وی پر لگا ہوا چینل بھی۔۔۔“ وہ اپنی بات کہہ کر شکفتگی سے ہنس دی۔

غانیہ نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

پر خلوص، سچے دوست اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہیں اس نے اکثر ہی اس بیش بہا نعمت کے ملنے پر اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا تھا۔

تابندہ بہت عرصے بعد اس کے گھر آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا ڈنر کروا کے ہی بھیجے گی۔ لیکن برابر میں ہونے والی بد مزگی نے اس کا موڈ بھی اچھا خاصا کرکرا کر دیا۔ اب وہ اسے زیادہ دیر روکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ تابندہ بھی اس کا مزاج سمجھتی تھی۔ اسی لیے بھانپ کر جلد ہی واپسی کے لیے اٹھ گئی۔

جانے سے پہلے اس نے سرسری سا نازش اور وقار سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ غانیہ ایک دم کھبرا سی گئی۔





ہوئے پلٹ گئی۔

دروازہ بند کر کے اس نے گھر پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ وہی مانوس سناٹا ہر جگہ بول رہا تھا جواب گھر کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کی بھی خاصیت بنتا جا رہا تھا۔

زندگی کی رفتار الگ الگ لوگوں کے لیے جدا جدا ہوتی ہے۔ کہیں پلک جھپکتے بیت جاتی ہے تو کہیں کالے نہیں نکلتی۔

گہری سانس لے کر اماں بی کی تصویر کو اٹھا کے اس نے یونہی چوم لیا۔ پھر دیر تک دیکھتی اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتی رہی۔

”اللہ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اماں جی۔“

یونہی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں رگڑ کے کی وی کھول لیا۔

آفس ٹائم تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن آفس سے آ کے جب گھر پر آفس سے لایا ہوا کوئی کام بھی نہ ہوتا تو اس کے لیے وقت گزارنا ایسے ہی مشکل ہو جاتا تھا۔

ٹی وی میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔

براہروالے گھر میں اب معمولی سی بھی آواز نہیں تھی۔ وہ لوگ کہیں چلے گئے تھے۔ یقیناً ”نازش“ کے میکے آج کا تازہ وہیں جانے یا نہ جانے پر کھڑا ہوا تھا۔

”کچھ ملی ہوئی دیواریں، کچھ نازش کی کان پھاڑتی آواز۔ اس گھر کا کوئی ایشو اس سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔“

سر جھٹک کر اس نے دھیان کو وقار کی طرف بڑھنے سے زبردستی روکا تھا۔

صبح کافی ہنگامہ خیز تھی۔ اسے اٹھنے میں تاخیر ہوئی اور ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کوشش کے باوجود اسے دیر ہو جائے۔ لیکن کا انتظار فضول تھا۔

دل کڑا کر کے اس نے براہروالے فلیٹ کی کال بیل پر ہاتھ رکھا۔ صبح صبح والی گہما گہمی کے آثار ادھر بھی نمایاں تھے۔ دروازہ نازش نے ہی کھولا تھا۔

”وہ“ سلام کرنے کے بعد اس نے بلاوجہ ہی تھوک نگا۔

”مجھے آفس سے دیر ہو گئی ہے۔ اگر وقار۔“ اس نے نازش کے پھیلے ہوئے وجود سے دائیں بائیں جھانکنے کی کوشش کی۔

”نہیں ہیں۔ وہ چلے گئے۔“ لٹھ مار انداز۔ بغیر سلام کے جواب کے۔

”اچھا۔“ اس نے وجود میں ایک الگ ہی تھکن محسوس کی۔

”چلیں ٹھیک ہے۔“ بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ دروازہ بند۔ کھٹاک۔

وہ جی بھر کے بد مزہ ہوئی۔ ”میں کون سا ناشتا مانگنے آئی تھی۔ چلی ہی جاتی واپس۔“ دل ہی دل میں کڑھنے کی عادت پرانی تھی۔

بقول اماں جی کے ”اندر ہی اندر جلنے سے رنگت ماند پڑ جاتی ہے۔“

”آپ کو کیا پتا اماں جی! زندگی میں کتنی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چہرہ کیا زندگی کو بھی ماند کر دیتی ہیں۔“

بس اسٹاپ پر کھڑے چند ہی منٹ گزرے تھے۔ جب اس نے وقار کو بائیک پر آتے دیکھ کے سوچا۔

نازش نے جھوٹ بولا تھا۔ کیوں؟ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

اور نظریں چرا لینا۔ حالات سے فرار بھی کیا فن ہے۔ بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھے اڑتا آچل سنبھالتے وہ فرصت سے سوچے گئی۔

باس کاموڈ خراب تھا۔ شکر ہے وہ وقت پر پہنچی تھی۔ ممکنہ بے عزتی سے بچنے پر شکر ادا کیا۔

”شکر ادا کرنے کی توفیق بھی اللہ نے دے دی تو سمجھو بڑی مہربانی۔“

توصیف صدیقی ابھی ابھی اندر سے ڈانٹ کھا کے نکلا تھا۔ مزاج کی شکستگی مگر عروج پر تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

آفس کے سب ہی اسٹاف ممبرز کو آپریٹو تھے۔ آفس کے روایتی ماحول کی طرح آپس میں ہنس بول تو

بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ مخصوص فحش کلامی اور بے ہودہ مذاق۔ جو ہر گھر سے باہر نکلنے والی عورت کو سننے بڑتے ہیں اس سے سب ہی پرہیز کرتے تھے جو دو ایک ایسی ذاتیت کے تھے بھی تو انہیں کوئی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

اس کی دوستی تو صرف تابندہ سے تھی۔ ہاں سلام دعا بھی سے ہو جاتی تھی۔ مگر ایک حد میں رہ کر۔ زیادہ گھانا ملنا زور زور سے ہنسا مذاق ٹھٹھول کبھی بہت پہلے اس کے مزاج کا حصہ تھا۔ اب نہیں۔ کارنروالی ٹیل سے ہنسی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ توصیف اب وہاں پایا جاتا تھا۔

”پارے کی طرح بے چین طبیعت ہے اس کی۔ کل پریزنٹیشن دینی سے کام ان کمپلیٹ ہے اور اطمینان دیکھو۔“ وہ تابندہ کی بات پر پھر مسکرائی۔

”کیا بات ہے۔ آج بہت دانت نکل رہے ہیں۔ آفس کس کے ساتھ آئی ہو۔“

”کوئی نہیں۔“ اس نے گڑبڑا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”اب ایسی روکھی پھکی بھی نہیں ہوں میں۔“ جی ایم صاحب کے آفس میں طلبی کے آرڈرز آگئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں تابندہ کے خطرناک حد تک درست اندازوں پر داد دیتی اٹھ گئی۔

نیم گرم موسم بڑی بڑی کھڑکیوں سے آفس کینٹین کے اندر اتر آیا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے تلخ چائے کے گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔

عجیب سی سستی سوار تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ لیکن چند دن ڈھنگ سے گزارنے کے بعد اسے اداسی کا یہ دورہ بہت بچتے بچتے بھی بڑھ جاتا تھا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ تابندہ نے کینٹین میں قدم رکھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”وہ“ بے ساختہ ایک گہری سانس اس کے لبوں سے نکلی۔ کینٹین کے موسم کی تپش میں کمی آنے

لگی۔

”غانیہ حسن!“ اس نے ایک جانی پہچانی خوشبو کو آس پاس پھلتے محسوس کیا۔ دل و دماغ میں سستی کی جگہ معطر سی تازگی بھر گئی۔

ازور سے سانس اندر کھینچ کر یہ جانی پہچانی خوشبو کسی پرانی یاد سے جوڑ کر بھبھڑوں میں بھری۔ اور بہت دھیرے سے تابندہ کو آواز دے ڈالی۔

”ارے! مرتضیٰ صاحب بیٹھے ہیں بھی۔“ خوشدلی سے کہتی ہوئی وہ نزویک آئی جبکہ ساتھ موجود دوسری خاتون کے چہرے پر اترتی سنجیدگی کی لہر کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا۔

”خیریت۔ آج آپ نے اس بے رونق جگہ کو عزت کیسے بخش دی۔“

”درویش صفت لوگ ہیں۔ جہاں منہ ہو گیا۔ اسی سمت چل دیے۔“ اس نے بھی شاہانہ انداز میں جواب دیا۔ تابندہ ہنسنے لگی۔ وہ البتہ خاموش سی بیٹھی تھی۔

”کیا لائی ہو۔“ وہ لہجہ نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی تابندہ کو ٹفن کھولتے دیکھ کر دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

”کرلیے۔“ وہ ایک بار پھر ہنسی۔ مرتضیٰ کا منہ بن گیا۔

”کبھی کوئی اچھی چیز بھی پکا لیا کرو۔“

”ارے اتنے مزے کے ہیں۔ کھا کے تو دیکھو۔“

”معافی۔“ اس نے فوراً ہی ہاتھ جوڑ دیے۔

”جیسے کل تم مجھے بہت سی لذیذ گو بھی کھلانے والی تھیں۔ مس غانیہ! آپ نہیں کھا رہیں۔“ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ ایک دم ہی اسے پکار بیٹھا تھا۔

”جی میں مجھے کرلیے پسند نہیں۔“ وہ سٹپٹا کر ایک دم بول پڑی۔

”اوہ۔ سو۔ ایک تو تم لوگوں کی پسند ناپسند آپس میں بہت ملتی ہے۔“ تابندہ مزے لے لے کر اپنے ہاتھ سے بنے کرلیے کھا رہی تھی۔

”تو آپ لہجہ میں کیا لیں گی۔ مجھے بتادیں۔ میں منگوا دیتا ہوں۔“



”نو تھینکس میں لچ نہیں کرتی۔“ اب کے اس کالجہ خاصارو کھاتا تھا۔ وہ خفیف سا ہو گیا۔  
”دیکھا، دیکھا۔ ایک اور میچ۔“ تابندہ کی اپنی ہی راگنی تھی۔ مرتضیٰ اور غانیہ نے بیک وقت اسے گھور کے دیکھا تھا۔

\*\*\*

”ایک اور میچ۔ ایک اور موافقت۔“  
”یہ تابندہ بھی بس کبھی کبھی بہت ہی فضول بولتی ہے۔“ اس نے جھنجھلا کے فائلیں پٹخیں۔  
”زبردستی میرے اور اس کے تار جوڑتی رہی ہے۔ ایویس بس۔ مان نہ مان۔“ واپسی میں سارا وقت وہ دل ہی دل میں تابندہ کو باتیں سناتی رہی۔  
صبح آتے وقت موڈ قدرتی طور پر خوشگوار تھا۔ وقار کی تھوڑی سی رفاقت بھی اس کے اوپر ایسے ہی خوشگوار اثرات مرتب کرتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب کی نظروں میں اس کے چہرے پر شگفتگی آ جاتی تھی۔  
”میں ابھی تک ابھی تک تمہارے حصار سے نکل نہیں پائی وقار۔“  
فلیٹ کا دروازہ کھولتے۔ اس نے اندر بکھری بے چین اداسی کو پوری شدت سے محسوس کرتے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔  
”اور یہ تم سے باتیں کرنے کی عات کب جائے گی بھلا۔“

بھاپ اڑاتا چائے کا گم، اس کی توجہ کا منتظر تھا۔ اور نگاہیں اس کی سوچ ہی کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

محسوس تو کرتا ہوں مگر چھو نہیں سکتا

تم پھول نہیں پھول کی خوشبو کی طرح ہو  
کسی کا دل نہیں لہجہ سماعتوں میں جلتی رنگ بکھیر رہا تھا۔  
اور اس کی ہنسی کی پھوار میں کسی کی سماعتیں بھیگ رہی تھیں۔

پوکرہ رنگ برنگی یادوں سے بھر چکا تھا۔ اس کے

دائیں بائیں صوفے پر زمین پر دروازے کے پاس اس کی پکی سیلیوں کی طرح جچی بیٹھی تھیں۔ اور یہ محفل کب تک جچی رہنی تھی۔ وہ ان میں کھو کر بالکل بھول ہی گئی۔ نماز پڑھنی تھی۔ آفس کا کام کرنا تھا۔ کھانا پکانا تھا۔

\*\*\*

موحد رات سے بخار میں پھنک رہا تھا۔ بوا سنبھالتے سنبھالتے ہلکان ہو گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر بگڑی گئیں۔  
”میری عمر ہے۔ اتنے ننھے بچے سنبھالنے کی۔“ وہ چپ چاپ اس کی کلائی تھامے گھڑی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ تھرمیٹر موحد کے منہ میں تھا۔  
”کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ عورت کے بغیر گھر نہیں چلتے۔“

”آپ بھی تو عورت ہیں۔ بواجی۔“ اس نے ہلکے سے ہنس کے ماحول کی کشافت کو کم کرنا چاہا۔  
”ارے میاں۔ بات کو ٹالو نہیں۔ میں گھروالی کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ چپ سا ہو گیا۔ جان کر انجان بھی کب تک بنا جاسکتا ہے۔  
”تم ہامی بھرو تو بات چلاؤں۔“ نصیہا ابھی چھوٹی ہے۔  
پر لڑکیوں کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے بیٹا۔“ وہ ہنوز سوچ میں گم تھا۔ بوا بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔  
”میرے ہامی بھرنے سے کیا ہوتا ہے بوا۔ جس سے ہاں کھلوالی ہے۔ وہ تو اک نظر ڈالنے کی بھی روادار نہیں۔“ نگاہوں میں کسی کا مانوس سراپا لہرایا۔  
کمرے کی بو جھل فضا میں وہی خوشبو بھرنے لگی۔ پاکیزہ خوشبو۔

\*\*\*

”آج مرتضیٰ آفس نہیں آیا۔ اس کے بیٹے کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ تابندہ صبح صبح ریپورنگ کر رہی تھی۔ اس کی عدم دلچسپی جوں کی توں تھی۔  
”آج میں اس کے گھر جاؤں گی۔ اس کے بیٹے کو دیکھنے۔ تم بھی چلی چلنا۔“

”میں کیوں جاؤں۔ مجھے کیا ضرورت ہے؟“ وہ بدک گئی۔  
”یار! دوست ہے وہ ہمارا۔“ اب باری کرسی سے اچھلنے کی تھی۔

”جی۔ جی۔ جی۔ نہیں۔ وہ ہم دونوں میں سے کسی کا دوست نہیں۔ صرف تمہارا کزن ہے اور وہ بھی دور پرے کا۔“ اس نے تصحیح کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔  
”تو انسانیت کے پاتے ہی سہی۔“ تابندہ جانے کیوں اتنا اصرار کر رہی تھی۔

”پلیز تابی! میں نہیں جاؤں گی۔ کوئی سنے گا تو کیا سوچے گا۔“  
”کوئی نہیں سوچ رہا کچھ۔ کسی کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے اور جس کے سوچنے کی سہیں اتنا پروا ہے جب اس کے سوچنے کا ٹائم تھابت تو شادی رچا کے بیٹھ گیا۔ اور۔“

”تابی!“ اس کی تبییہی نظریں اور آواز تابی کو چپ کرا گئے۔

”میں تھوڑا کام کر لوں۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو تو۔“  
”میرے مائنڈ کو چھوڑو اپنے مائنڈ کی فکر کرو پیچھا چھڑاؤ اس پرانی یادوں اور ٹوٹے ہوئے رشتوں سے۔ کچھ نہیں دیں گے یہ تمہیں۔ سوائے خالی ہاتھ اور پچھتاؤں کے۔“

تابی رکی نہیں تھی۔ اپنی بات کہہ کر یہ جا وہ جاوہ ہکا بکا اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

سوچوں کا ایک جہاں یادوں کے پرستان کا دروازہ کھل چکا تھا۔ وہ جانتی تھی اب آفس میں دل لگنا بہت مشکل ہو گا۔

جلدی جلدی التاسیدھا کام نبٹا کے اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں جا کر تو گزرے دنوں کی خوبصورت یادیں اسے تنہا دیکھ کر اور بھی جان سے چٹ جائیں گے۔

”دل میں بسنے والی ہستیاں بھی کیا کبیل ہوتی ہیں۔ انسان زندگی چھوڑ دے۔ مگر وہ دل نہیں چھوڑتیں۔“

\*\*\*

یہی گھر تھے اور یہی دیوار جو اول روز سے دونوں گھروں کے درمیان تھی۔ اور شاید کہیں دلوں میں بھی۔ بس اور اک بہت دیر سے ہوا۔

بڑے ابا ابا میاں کے سوتیلے بھائی تھے۔ اسے ہمیشہ سے یہی محسوس ہوتا۔ بڑے ابا کے روپے میں ابا میاں کے لیے وہ گرجوشتی اور اپنائیت نہیں تھی۔ جو ابا میاں کے روپے میں تھی۔ وہ اکثر اس بات کا اظہار اماں جی کے سامنے کر دیتی۔ اور اکثر جھڑکھاتی۔

اماں جی! محبت کا بے کراں سمندر تھیں۔ جتنا بڑا دل تھا۔ اتنی ہی اعلا طرف اور بلند کردار۔ کبھی اپنی اور جیٹھانی کی بیٹیوں میں فرق نہ سمجھا۔ ہمیشہ اپنی بیٹیوں ہی کی طرح ان کے شریہ ہاتھ رکھا۔ سینے سے لگایا اور شاید اسی سادہ لوحی میں مار کھا گئیں۔

اس کی دونوں تایا زاد بہنیں عاصمہ اور ہسمہ، عمر میں اس سے بڑی ہونے کے باوجود زبردست ذہنی ہم آہنگی رکھتی تھیں۔ تینوں کا ہی آدھا دن ادھر تو آدھا دن ادھر گزرتا تھا۔

یونہی سنتے کھیلتے دن پہ دن گزرتے رہے۔ بچپن بیٹا۔ لڑکپن گیا اور جب جوانی کی سرحدوں پر قدم رکھا تو کسی کی نگاہوں کے بدلتے مفہوم نے دھڑکنوں کو نئی تال دے دی۔ وہ دن رات اسی تال پہ سر دھننے لگی۔ بنا کچھ سوچے۔ بنا کچھ سمجھے۔

\*\*\*

سبک رفتاری سے گزرتے دنوں کو شدت غم کا پہلا جھٹکا تب لگا۔ جب بڑے ابا اچانک ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔

بڑی اماں کے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کس کو خبر تھی اچھے بھلے بڑے ابا، گھر سے جائیں گے تو چار کندھوں پر واپسی ہوگی۔

بڑی اماں کو وہ رہ کر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ بیٹیاں غم سے نڈھال، ابا میاں صدمے سے چور وقار بار بار اپنی غم آنکھوں کو ہتھیلیوں سے رگڑتا، تعزیت کے لیے آنے والوں اور تجنیرو تکفین کے انتظامات دیکھ



رہا تھا۔

حادثہ تھا ہی اتنا بڑا اور اس قدر غیر متوقع، ان سب ہی کے ہوش لے اڑا۔ کتنے دن کھانے پینے کا خیال تک نہ آیا۔ بڑے ابا کے جانے سے دلوں کو جو صدمہ تھا سو تھا۔ وہ گھر کے واحد کفیل تھے۔ وقار اس وقت تک پڑھائی سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہنیں بھی کالج جاتی تھیں۔

ان کی پڑھائیاں اور گھر کا خرچہ بڑے ابا کیلے برداشت کرتے تھے۔ گھر میں بہت خوشحالی نہ تھی۔ مگر مالی حالات بھر بھی چھوٹے بھائی سے بہتر تھے۔

گزرتے وقت نے نرمی سے پھائے رکھے تو کئی مسائل منہ پھاڑے کسی عفریت کی طرح سامنے کھڑے تھے۔

ابامیاں کی معمولی سی کرپانے کی دکان میں دونوں گھروں کا خرچ اور پڑھائیاں نہیں چل سکتی تھیں۔ سو وقار نے تعلیم اور ہوری چھوڑ کر نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ عاصمہ اور ہسمہ کو بھی کالج چھوڑ کر گھر بیٹھنا پڑا۔

گوکہ پڑھنے میں دونوں ہی کوئی بہت خاص نہیں تھیں۔ پھر بھی گھر سے نکلنے کا بہانہ تو تھا۔ بڑی اماں کو گھر کے مسائل اور بڑے ابا کی جدائی نے دائمی مریض بنانے رکھ دیا۔

عاصمہ اور ہسمہ ان کی خدمتیں کرتیں، پڑھائی چھوڑ کر گھر جو بیٹھیں تو تھوڑے سے دنوں میں ہی بری طرح اکتا گئیں۔ گھر کی گاڑی جیسے تیسے گھسٹ ہی رہی تھی۔

ان ہی دنوں غانیہ نے میٹرک کر کے کالج میں ایڈمیشن لے لیا اور ان دونوں کے دل میں حسد کی پہلی لہر جاگی۔

”ہمیں تو کالج چھڑوائے گھر بٹھادیا بھائی جان نے۔ یہ چھوٹے ابا کا ہی مشورہ تھا۔ تو پھر اب یہ نوابزادی کیوں کالج جا رہی ہے۔ اس کی پڑھائی کیا مفت میں ہوگی۔“ عاصمہ کی آواز ٹھیک ٹھاک تپتی ہوئی تھی۔

”اور کیا ہم سارا دن گھر کی دیواریں دیکھیں اور وہ محترمہ مزے کربے۔“ ان دونوں کے نزدیک کالج جانا صرف مزے کربے کا کام تھا۔

وہ بھول گئی تھیں کہ ابامیاں نے انہیں پڑھائی چھوڑنے کا نہیں بلکہ پرائیویٹ پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کے گھر سے چلے جانے کے بعد بڑی اماں اکیلی پڑ جاتی تھیں۔ بڑے ابا کے انتقال کے بعد ان کی جسمانی قوت بہت تیزی سے زوال پذیر ہوئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح چست اور چاق و جوان نہ رہی تھیں۔

”اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ تمہاری قسمت کہ تم یتیم ہو گئیں۔ اب یتیموں کے سر پر کون ہاتھ رکھے۔“ بڑی اماں کے خیالات بھی ان کے گھر کے حالات کی طرح تیزی سے پلٹا کھا گئے تھے۔

نہیں کب، کیوں اور کیسے۔ ابامیاں نے جب بھی سوچا ان کا بھلا ہی سوچا۔ بڑے ابا کی زندگی میں بھی اور ان کے چلے جانے کے بعد بھی ان کی محبت اور شفقت میں کبھی کہیں کمی نہیں آئی تھی۔

\*\*\*

”ایسے کیوں دیکھتے ہیں آپ مجھے۔“ اس کا نوخیز کلیوں جیسا حسن، وقار کی پریش نگاہوں کی حدت سے پکھل رہا تھا۔

”پھر کیسے دیکھوں۔ اس سے اچھا کوئی طریقہ ہے تو بتا دو ہی۔“

”اگر آپ مجھے ایسے ہی دیکھتے رہے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ایسا ظلم کرتے شرم نہیں آئے گی تمہیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ٹانگیں سامنے پھیلالیں۔

اسے جاب مل توئی تھی لیکن بہت ٹف، صبح کا نکلا رات میں نہیں شکل دکھاتا۔ غانیہ نوٹ کر رہی تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔

گندی رنگت میں چمک کی جگہ سنولہٹ آگئی تھی۔

”آپ کوئی دوسری جاب ڈھونڈ لیں نا۔“ بازوؤں کا تکیہ بنا کے سر کے پیچھے رکھے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کی بات پہ ایک دم چونک گیا۔

”کیوں؟“

”آپ بہت تھک جاتے ہیں نا۔“ اس نے ایک نظر اسے دیکھا، اس کی معصومیت پہ ہنس کے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

”نوکری! تھکاوٹ کا ہی دوسرا نام ہے۔“ وہ کچھ کہے بغیر اس کے چہرے کے نقوش آنکھوں سے پڑھتی رہی۔

بڑی اماں کمرے میں سو رہی تھیں۔ ہسمہ اور عاصمہ ایک عرصے کے بعد شاپنگ کے لیے گئی تھیں، وہ بڑی اماں کی ٹانگوں کی مالش کر کے گھر واپسی کے ارادے سے ہی نکلی تھی کہ وقار آگیا، اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

مدتیں گزر گئی تھیں۔ تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کیے ہوئے۔

کتنی دیر گزری تھی۔ ایک دوسرے کی خوشبو کو محسوس کرتے۔ جب وہ ایک دم آنکھیں کھول کے بولا۔

”ایک کپ چائے تو بنا دو۔“ وہ تابعداری سے کچن میں چلی گئی۔ وقار اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چائے بنانے کے ہمیشہ کی طرح اس کے کمرے میں دستک دے کر وہ اندر آئی تو وقار نہانے نکلا تھا۔ گیلے بال تولیے سے رگڑتا، نکھرا نکھرا ترو تازہ وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگا۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔

”کچھ نہیں، چلتی ہوں دیر ہو گئی۔“ وہ سٹپٹا کے باہر نکلا تو دروازے پر عاصمہ اور ہسمہ تھیں۔

”کب سے بجارہے ہیں دروازہ تمہیں آواز ہی نہیں آئی۔“

بات معمولی تھی مگر لہجہ غیر معمولی مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔

”کمال ہے، مجھے تو آواز ہی نہیں آئی۔“ اس کا لہجہ سرسری ہی تھا۔

اتنے میں وقار چائے کے کپ لے کر کمرے سے نکلا، ہسمہ اور عاصمہ نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”اچھا! جیسی آواز نہیں آئی۔“ ہسمہ عجیب سے انداز میں بولتی اندر کمرے میں چلی گئی۔ عاصمہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

اس نے جب تک اس کی بات کا نتیجہ نکالا۔ لاؤنج خالی ہو چکا تھا۔

دونوں بہنوں کے ہاتھ میں شاپنگ بیگز تھیں۔ وقار یقیناً وہی دیکھنے ان کے پیچھے چلا گیا۔ اسے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ وہ دل پر بوجھ لیے وہاں سے نکلی تھی۔ ایسی نظر اندازی اس سے پہلے کبھی حصے میں آئی جو نہ تھی۔

\*\*\*

پھر تو ایسا اکثر ہی ہونے لگا۔ بڑی اماں کے گھر میں اس کی اہمیت کم ہونے لگی اور حیثیت معمولی۔ اسے نظر انداز کیا جانے لگا۔

ہسمہ اور عاصمہ بہنیں تھیں۔ لیکن غانیہ تو اکلوتی تھی۔ اکیلی اپنی اماں جی اور ابامیاں کی آنکھوں کا تارا۔ اس نے بہنوں کی کمی ہمیشہ ان ہی دونوں کے وجود سے پوری کی تھی۔ جب انہوں نے توجہ میں کمی کی تو اسے ایک دم ہی اکیلے پن کی شکایت ہو گئی۔

بڑی اماں بھی چپ رہتیں۔ وہ اب بھی وہاں جاتی۔ ان کے پیروں کی مالش کرتی۔ ان کے سر میں تیل ڈالتی۔ جیسے اماں جی نے سکھایا تھا۔ نصیحت کی بھی کہ بڑی اماں کا خیال رکھا کرو۔ خیال تو ان کی بیٹیاں بھی رکھتی تھیں، لیکن ان کی خدمت میں وہ لگن اور جانفشانی نہیں تھی۔

بڑی اماں کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑتے



رہتے۔ اس کے ہاتھ چلتے رہتے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود دنیا جہان کی باتیں کیے جاتی۔ تالی اماں ہوں ہوں کرتی رہتیں۔ اسے لگتا وہ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ اکیلا محسوس کرنے لگی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتی۔ ان ہی دنوں ایک عجیب بات ہوئی۔ گوکہ اتنی عجیب تھی نہیں۔ ابامیاں اور اماں جی کے لیے بھی خاصی تو تھی مگر عجیب نہیں پر اسے تو عجیب ہی محسوس ہوئی۔ ابامیاں کے ایک دوست کے توسط سے اس کے لیے رشتہ آگیا۔ وہ اسے اپنی بہو بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پہلے تو وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔ پھر ذرا حواس قابو میں آئے تو اس نے رو رو کر دن رات ایک کر دیے۔ اماں جی ابامیاں اور سب سے بڑھ کر وقار کی جدائی کا خیال اتنا ہی سوہان روح تھا۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ وقار کے علاوہ کسی اور کی ہو جائے گی اور ابھی عمر بھی کم ہی تھی۔ ابامیاں کو انکار کرتے ہی بنی۔ معاملہ ختم ہوا تو اس نے بھی سکون کا سانس لیا۔ وقار کی خالہ ایک عرصے کے بعد کراچی شفٹ ہوئی تھیں۔ بڑی اماں کے گھر ان کی دعوت تھی۔ وہ اطمینان سے کام میں ہاتھ بٹانے چل دی۔ ابامیاں بہت ہی نرم مزاج انسان تھے۔ زندگی میں پہلی بار ان کے دل میں اس کے وہاں جانے سے کھٹک ہوئی۔

”اسے یوں دن رات وہاں مت جانے دیا کریں۔“ وہ اماں جی سے بہت عزت سے بات کرتے تھے۔

”اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔“

ابامیاں کا اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا اور وہ خود بھی بہت فرماں بردار بچی تھی۔ چپ چاپ اماں جی کی بات سن کر سر جھکا دیا۔ دل میں اٹھتے لبوں پر مچلتے سوال کو نوک زباں پر نہ آنے دیا۔

”جس گھر میں آتے جاتے بچپن بیت گیا۔ اب وہاں جانے میں قیامت کیسی؟“

وقار کی خالہ جان کی دعوت خوب دھوم سے ہوئی۔ اچھے خاصے لوازمات تھے۔ ان کی اہمیت ہر ایک پر واضح ہوتی گئی۔ خاص طور پر برابر والے گھر میں رہنے والوں پر۔ دو بچے تھے ان کے بھتیجا نازش اور بیٹا جبران۔ وہ دونوں اکثر ان کے گھر میں پائے جانے لگے۔ آمدورفت بڑھنے لگی تو اماں جی نے دن میں ایک بار بھی ادھر جانے پر پابندی لگا دی۔ خاص طور پر ان دنوں بس بھائی کی موجودگی میں۔

عجیب بے باکی اور بے ہودگی بھرے انداز و طوار تھے ان دنوں کے ابامیاں اور بی اماں نے پہلی ملاقات میں ہی ان کو ناپسندیدہ قرار دے دیا۔ وہ خود بھی اپنے والدین سے متفق تھی۔

حیرت تو اسے عاصمہ اور ہسمہ پر ہوتی جو چند ہی روز میں ان سے گہری دوستی کر بیٹھی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے ان دنوں کو۔ کیسی فضول کی باتیں کرتی ہے وہ اور یہ دونوں ہستی رہتی ہیں۔“ وہ دل ہی دل میں کڑھتی، اداس ہوتی، لیکن پھر اطمینان کی ایک لہر اس کے دل میں دوڑ جاتی۔

وقار اور اس کی محبتیں بالکل ویسی ہی تھیں۔ ان میں بال برابر فرق نہیں آیا تھا۔ ہاں بس وہ پہلے سے زیادہ فکر مند اور سنجیدہ رہنے لگا تھا۔

اب تو اس کے اور غائبی کے بیچ بات بھی بالکل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ لیکن اس کا یقین قائم تھا۔

”بس چچی جان! دعا کیا کریں آپ۔“ وہ بھی کبھی آفس سے سیدھا ان کے گھر بھی آ جاتا تھا۔ وہ دن اس کے لیے عید سے کم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت دھیان اور محبت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہتی۔

”امی پریشان ہیں ہسمہ اور عاصمہ کی شادی کی عمر ہے۔ رشتوں کا کہتی رہتی ہیں سب سے۔“ وہی دذمرہ کے معمولات کی سرسری تفصیل۔

اماں بی کی تسلیاں اور دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔

عاصمہ کی بات، ان کی خالہ نے اپنے سرال میں کہیں طے کروادی تھی۔ ابامیاں اور اماں بی تو حق دق رہ گئے۔

”کمال ہے ہم سے سرسری سا ذکر بھی مناسب نہیں سمجھا بھائی جان نے، میں کہوں گی ضرور۔“ اماں بی کو بہت صدمہ تھا۔ ابامیاں نے ان کی تائید کی۔

”اور کیا۔ ہم ہمیشہ ان کی ہر خوشی غمی میں ساتھ رہے اور ہم ہی کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا انہوں نے۔“ اس نے زندگی میں پہلی بار اماں بی کو اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔

لیکن معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ گئے تھے شکایت لے کر اور سنی پڑی الزامات کی تفصیل۔

”دودھ سے مکھی کی طرح تو آپ نے ہمیں نکالا تھا بھائی صاحب۔“ اماں بی اور ابامیاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”ہم نے۔“ ان سے بات بھی مکمل نہیں کی گئی۔

”اور نہیں تو کیا۔ بھول گئے آپ کے دوست کے گھر سے آپ کی بیٹی کے لیے پیغام آیا تھا۔“ بڑی اماں کی آواز تک بدلی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی رہنے والی ہماری بیٹیاں۔ آج میری بیٹیاں اور تمہاری بیٹی ہو گئی تھیں۔

”ہاں تو۔ وہ تو معاملہ ہی کچھ نہ تھا، میں کیا بتاتا۔“ ابامیاں بھی کچھ نہ سمجھتے تھے۔

”کچھ کیوں نہیں تھا۔ آپ کو اس وقت ہمارا خیال نہیں آیا۔ ساری زندگی آپ اور آپ کے بھائی عاصمہ، ہسمہ اور غائبی کو اپنی بیٹیاں بتلاتے رہے۔ لیکن آپ نے کیا کیا۔ بالا ہی بالا انہیں کہلا بھیجا۔ کیونکہ آپ کی بیٹی چھوٹی تھی۔ اس وقت آپ کو عاصمہ اور ہسمہ کا خیال کیوں نہیں آیا آج جب میری بیٹی کا رشتہ خیر سے اچھی جگہ ہو رہا ہے تو آگے خامیاں اور اعتراضات لے کر۔“ بڑی اماں کے تیور بہت بدل چکا تھا۔

”اور میری بیٹیوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ کالج چھوڑ دیا آپ نے، کیونکہ آپ خرچہ نہیں اٹھا سکتے

تھے۔ غائبی تو کالج جا رہی ہے اور ٹیوشن بھی لیتی ہے۔“ عاصمہ اور ہسمہ خاموش تماشا کی بنی بیٹھی تھیں، جبکہ بس پردہ بڑی اماں کی ڈوریاں ہلانے والی وہی تھیں۔

”میں نے بڑھائی چھوڑنے کے لیے نہیں، پرائیویٹ پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کے پاس آرٹس تھی۔ یہ بڑھائی کے ساتھ ساتھ کسی اسکول میں جاب بھی کر سکتی تھیں۔ تمہارا ہی ہاتھ بٹا تھا۔ جبکہ غائبی۔“

ابامیاں نے کب سوچا ہو گا کہ انہیں یوں اپنی اولاد کے بارے میں وضاحتیں دینی پڑیں گی۔

”بس بس بھائی صاحب رہنے دیں۔ آپ کے خلوص کا پول پوری طرح کھل چکا ہے۔ آخر آپ نے اپنا سوتلا پن دکھا ہی دیا۔ اب بہتر ہو گا آپ ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑانا چھوڑ دیں۔“ بڑی اماں نے زبان درازی کی انتہا کر دی۔

ابامیاں اور اماں بی بہت دکھی دل کے ساتھ واپس آئے۔ سوتیلے پن کے طعنے نے ابامیاں کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دی تھی۔

غائبی کو بھی صورت حال کا علم ہوا تو گہرا دکھ دل میں گھر کر گیا، لیکن ابھی تو قسمت میں اور بھی دکھ لکھے تھے۔ وہ کتنے بھاری تھے۔ اسے علم نہ تھا۔

برابر میں عاصمہ کی شادی کا شور اٹھا۔ دن بھر گانوں اور شور شرابے کی آوازیں آئیں۔ اماں بی چپکے چپکے آنکھیں خشک کرتی گھر کا کام کرتی رہتیں۔ انہیں کسی نے یہاں تک کہ ہمیشہ سے ساتھ رہتی بھانج نے جھوٹے منہ بھی نہیں بلایا تھا۔ وہ دل موس کر ادھر سے آنے والی آوازیں سنتی رہتی۔ جس میں سب سے اونچی آواز خود نازش کی ہوتی۔

مایوں سے ایک دن پہلے شرمندہ شرمندہ سا وقار شادی کا کارڈ لے کر آیا اور ابامیاں سے اپنی ماں کے رویے کی معافی مانگی۔

”امی کو تو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ عاصمہ کی پیسے والی سرال کے آگے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا۔ میں بہت



شرمندہ ہوں چچا جان۔ امی کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ آپ پلیزان کی باتوں کو دل پر مت لیں، میں انہیں سمجھاؤں گا۔ انہیں جلد ہی احساس ہو جائے گا۔ خون کے رشتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے وہ غلط کر رہی ہیں۔“

ابامیاں جو روکھے منہ سے مارے باندھے بھیجے کے سامنے بیٹھے تھے۔ اس کی بات سن کر خوش ہو گئے۔ فوراً شادی میں آنے کی ہامی بھر لی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ بھابھی نے جو بھی کہا تھا غلط کہا تھا اور ان کے بھیجے کو اس کا احساس تھا۔

وہ خوشی خوشی شادی میں شرکت کے لیے گئے۔ گوکہ وہاں اسی مخصوص سردمہری سے ان کا استقبال کیا گیا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے دل چھوٹا کرنے کے بجائے اعلا ظنی سے بھابھی کو اتنی اچھی جگہ رشتہ طے کرنے پر مبارکباد بھیجی تھی۔

ولیمہ والے دن کسی نے ذکر کیا کہ وقار کے خالو اسے کوئی سرکاری ملازمت دلوانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ ابامیاں کی خوشی کا احساس دوچند ہو گیا۔ یوں بھی وہ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونے والے انسان تھے۔ حسد اور جلن جیسے جذبے تو انہیں چھو کے بھی نہیں گزرتے تھے۔

غانیہ اور اماں بی البتہ غیروں کی طرح ہال کی سب سے پچھلی سیٹوں پر سوکھے منہ سے بیٹھی رہیں۔ کسی نے انہیں کھانے کو پوچھا، نہ اسٹیج پر بلایا۔ مارے باندھے دنیا داری اور بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ خود ہی اٹھ کر کھانے کے ٹائم پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈال کے لے آئی۔

اسے بھی وقار کی جاب کی تفصیلات کا علم ہو چکا تھا۔ جو بہت عالی شان نہ سہی، مگر ان حالات میں بہت بہتر تھی، جو اس وقت وہ لوگ گزار رہے تھے۔ لیکن وہ یہ خبر سن کر ابامیاں کی طرح خوش نہیں ہو سکی۔ پتا نہیں کیوں دل کو ایک بے چینی سی لاحق ہو گئی تھی۔ شادی اور ولیمہ کی دونوں تقریبات میں وقار محض سلام دعا کرنے ان کے پاس آیا۔ باقی کا سارا وقت

نازش اس کے گلے کے ہارنی اور ہسمہ اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہی اور دونوں کا ہی رویہ اتنا بے گانہ تھا کہ ان کی موجودگی میں وہ قہقہے لگاتے وقار کے قریب جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ بس شکوہ کنال نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔

ان کی خالہ سارا وقت بھانجے کی واری صدقے جاتی رہیں۔ یہ وہی خالہ تھیں جو بڑے اماں کے انتقال پر لاہور سے صرف ایک دن کے لیے آئی تھیں اور مصروفیت کا شور مچاتی شام میں ہی واپسی کی راہ پکڑ لی۔ ان کے التفات اور محبت کی وجہ غانیہ تب نہیں سمجھ پائی تھی۔ وقار خوب صورت، تعلیم یافتہ اور تیز دار نوجوان تھا۔ اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ بھی نوکری یا پیسہ اور یہ کمی اگر وہ پوری کرنے والی تھیں تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

کوئی نوک دار چیز دل میں بہت گہرائی تک جا کے چھب گئی تھی۔ وقار اسے ایک دم ہی اپنے آپ سے بہت دور فاصلے پر محسوس ہونے لگا۔ بہت غیر اجنبی۔

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہیں پچھڑ جاتے ہیں کیوں تیرے درد کو دوس تہمت ویرانی دل زلزلوں میں تو بھرے شہر بھی اجڑ جاتے ہیں موسم زرد میں اک دل کو بچاؤں کیسے ایسی رات میں تو گھنے پیڑ بھی جھڑ جاتے ہیں

☆☆☆

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں داہے اور اندیشے زور پکڑتے گئے۔ جاتے پت جھڑ کے دنوں میں اداسی کا سایہ پڑ چکا تھا۔

وہ کالج سے آ کے سارا دن دونوں کمروں میں بلاوجہ چکر لگاتی۔ وقت کسی طور کاٹے نہیں نکلتا۔ وقار کے آفس سے آنے کے وقت وہ جان بوجھ کے بالکونی میں جاتی۔ اسے بائیک سے اتر کے لاک لگاتے دیکھتی رہتی۔

اسے پتا تھا وقار کو اس کے وہاں موجودگی کا علم ہے، مگر اس نے کبھی سراٹھا کے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ دن گزرتے رہے۔ رات سے صبح اور صبح سے رات اور پھر رات سے صبح ہو جاتی۔ وہ صرف اس کی بے گانگی پر کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

ابامیاں نے ایک دن بالکل اچانک اس کا دل ہلانے کے لیے ایک سیل فون لا دیا۔ ”خوشی سے وہ پھولے نہیں سمائی۔ ہر نئی چیز بچپن سے کھلونوں سے لے کر نئے کپڑوں تک پڑوس میں رہنے والی اپنی بہنوں کو کھانے کی عادت اس قدر پکی ہو چکی تھی کہ وہ اس وقت بھی موبائل ہاتھ میں لے کر سیدھی وہیں چلی آئی۔ دروازہ کھولنے والا وقار ہی تھا۔

اسے علم تھا وہ گھر پر ہو گا۔ اتنے دن بعد سامنا ہونے پر باسی نظریں سیرابی کے لیے مچل گئیں۔ اس نے جھٹکل اپنے آپ کو ڈپٹ کر نظریں جھکا میں۔ گھر پر اس وقت کوئی نہ تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی گھبرا گئی۔

”کیوں؟“ وقار بھی جیسے اتنی مدت بعد اسے دیکھ کر بے چین سا ہو گیا۔

”کتنا بھی بھروسا نہیں رہا مجھ پر۔“ اس کے شکایتی لہجے پر وہ تڑپ کر اسے دیکھنے لگی۔

”آپ پر تو ہے خود پر شاید نہیں رہا۔“

”کیوں اتنی مایوس ہو رہی ہو۔“

”میں کہاں؟ مایوسی تو ہر چیز پر طاری ہے۔“

ایک پھلکی سی مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کیا اور اسے اپنا سیل دکھا کے نمبر دے کر فوراً ہی واپس چلی آئی۔

زیادہ دیر اکیلے وقار کے ساتھ اس کے گھر پر رہنا ٹھیک نہ تھا۔ کیا وقت آگیا تھا۔ ایک وقت تھا جب وہ گھنٹوں وقار کے ساتھ اس گھر میں گزارتی تھی اور کوئی کچھ کہہ کر تو کیا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

موبائل فون نے اس کی بوریت کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ اس نے کالج میں بھی سہیلیوں کو موبائل دکھایا۔ نمبرز کا تبادلہ ہوا۔ تعریف سمیٹی۔ لیکن سب

سے خاص بات یہ تھی کہ اس فون پر اکثر اسے وقار کے میسج موصول ہونے لگے۔

جسم و جان ان خوب صورت پیغامات سے جھلکتی محبت محسوس کر کے سرور سے بھگک بھگک جاتے۔ چاہے جانے کا غرور نشہ بن کر آنکھوں سے چھلکتا، چہرے کی شگفتگی لوٹ آئی۔ ہونٹوں پر ہنسی کے کنول پھر سے کھلنے لگے۔

”آئی مس یو۔“

”آئی لو یو۔“

اور ایسے ہی لاتعداد میسج اس کے ان بکس میں پڑے رہتے۔ وہ ڈیلیٹ کرنے سے پہلے بار بار انہیں پڑھتی، مسکراتی اور محبت اس کی آنکھوں میں لودیتی رہتی۔

☆☆☆

”سنا ہے وقار کی خالہ ہسمہ کو مانگ رہی ہیں اپنے بیٹے کے لیے اور بدلے میں نازش کی وقار سے۔“

اماں بی کو محلے کی ایک خاتون کی زبانی علم ہوا۔ وہ کچن میں کھڑی پیاز کاٹ رہی تھی۔ تیز دھار چھری انگلی میں اتر گئی اندر تک۔ خون کی دھار ابل پڑی۔

”سی۔ سی۔ سی۔“ کی آواز پر اماں بی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دب کر انگلی پکڑے کھڑی تھی۔

”کیا کرتی ہو، کتنا گہرا کاٹ لیا۔ دھیان کہاں ہے تمہارا۔“

اماں بی تو جانتی ہوں گی کہ اس کا دھیان کدھر تھا۔ مگر پھر بھی فکر مندی سے ڈانٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ کے دھلانے لگیں۔

”دھیان تو اسی دشمن جاں میں اٹکا ہے اماں بی اب میں کیا کروں۔“ وہ بے رحمی سے تل سے بہتی پانی کی تیز دھار میں اپنا خون ملتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”مجھے وقار سے صاف صاف بات کرنی ہوگی۔ یہ چکر کیا چل رہا ہے سارا۔“ وہ موبائل میں سے اس کے سارے میسج مٹاتے ہوئے غصے سے سوچتی رہی۔



کتنے بہت سارے دن ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے ہوئے نکل گئے نہ اس کی وقار سے بات ہو سکی نہ اس نے وقار کی کوئی کال انینڈ کی نہ کسی بھی مسیح کا جواب دیا۔ یوں گھر میں ہر وقت اماں بی بی کی موجودگی میں بات کرنی مشکل ہوتی تھی۔ سولی پر تنگی جان کی طرح دن رات گزر رہے تھے۔ جب ایک دن اسے وقار کا مسیح ملا۔

”گھر آؤ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

بڑی اماں اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ دروازے پر ہی مل گیا اور اس کے قدم رکھتے ہی ہاتھ پکڑ کے سیدھا کمرے میں لے گیا۔

غانیہ بری طرح سٹپٹا کے رہ گئی۔ اتنا دھونس اور استحقاق پہلے کبھی اس نے اظہار نہیں کیا تھا۔

”بسمہ کہاں ہے؟“

”مارکیٹ گئی ہے نازش کے ساتھ۔“ وہ دروازہ بھیڑ کر اس کے برابر آن بیٹھا۔

”ناراض ہو مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔“

غانیہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”گھر میں آپ کی شادی کی باتیں چل رہی ہیں۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں آپ کو سب کچھ پتا تو ہے۔“ اس نے بھی دو لوگ انداز اختیار کر لیا۔

”ہاں۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔ غانیہ کو اس سے اس انداز کی امید نہیں تھی۔ اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

”پتا نہیں خالہ نے یہ شرط کیوں رکھی۔ مجھے ان سے اس خود غرضی کی امید نہیں تھی۔ وہ عاصمہ کے رشتے اور میری جاب کو اس انداز میں کیش کروانا چاہتی ہیں۔“

”اور آپ؟“ ہزاروں اندیشے اس کے دو لفظی سوال میں چل رہے تھے۔ وقار کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا لیا۔

”پتا نہیں مطلب۔“ وہ تڑپ گئی۔ لمحے ہزاروں حصے میں وہ اس کے لہجے کی سچائی اور کھوکھا پن بھانپ گئی۔

”کیوں بلایا ہے مجھے یہاں پھر۔ اپنے وعدے سے دست بردار ہونے کے لیے یہ بتانے کے لیے کہ آپ مجبور ہیں بڑی اماں کی وجہ سے اپنی خالہ کی وجہ سے ان کی لگائی ہوئے شرط اور بسمہ کے بھائی ہونے کی وجہ سے۔“ اس کا لہجہ سلگ اٹھا۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو غانیہ۔“

”میں بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔ اور حیرت ہے کہ اتنی دیر سے کیوں سمجھی۔ مجھے تو جب ہی سمجھ جانا چاہیے تھا جب اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے کے بجائے آپ نے ان کی دی ہوئی نوکری قبول کر لی تھی۔“

”میں اس وقت مجبور تھا غانیہ! کم از کم تم تو میری مجبوری کو سمجھو۔“ اس کی آواز میں حد درجہ بے چارگی تھی۔ غانیہ کو وہ سچ سچ بہت مجبور لگا۔ بہت بے بس۔

”اور اب۔ اب بھی تو مجبور ہیں آپ۔ آپ کے ساتھ تو بہت ساری مجبوریاں ہیں کوئی ایک تو نہیں۔ اور میں سب مجبوریاں سمجھتی ہوں۔“ اس کا دل قطرہ قطرہ کھلنے لگا۔

”لیکن آپ کی مجبوری سے میری زندگی بھری محبت بندھی ہے وقار! اگر آپ اب بھی مجبور ہو گئے تو میں میں تو مرجاؤں گی۔“ وہ روپائی ہو گئی۔

”ایسی باتیں مت کرو۔ کوئی کسی کے بغیر نہیں مرنے والا۔ ماضی کو بھول کر نئی زندگی میں۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ غانیہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

”تو آپ فیصلہ بھی کر چکے۔ صرف اپنے آپ کو باعزت بری کرنے کے لیے مجھے بلایا ہے اس وعدے سے آزاد کرنے کے لیے جو کبھی کیا ہی نہیں تھا۔“ اس کی آواز دکھ اور صدمے سے بوجھل ہو گئی۔

سامان سے بھرے کمرے کی دیواریں کچھ اور بھی تنگ لگنے لگیں نیم روشن کمرے میں جس بڑھنے لگا۔ وقار کو اس سے اس صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔

”بہت معصوم اور کم عقل سمجھتا تھا لیکن آج جو غانیہ اس کے سامنے کھڑی تھی وہ کم از کم بے عقل نہیں تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن بات منہ میں رہ گئی۔

کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ بڑی اماں اور بسمہ شریار نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ غانیہ کو جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”یہ گل کھلائے جارہے تھے وہاں اکیلے میں میرے بیٹے کے ساتھ۔“ بڑی اماں کی کان پھاڑتی آواز اس پاس کے اور گھروں میں بھی سنی جا رہی تھی یقیناً ”ابا میاں گھر پہ تھے اور بڑی اماں نے جان بوجھ کے یہ وقت نکالا تھا۔“

”خدا کے لیے بھابھی جان! آرام سے بات کریں۔ سب لوگ سن لیں گے۔ کیا سوچیں گے۔“ ابا دھیمی آواز میں ان کی منتیں کر رہے تھے۔

غانیہ کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ ”لوگ کیا سوچیں گے یہ باتیں تو آپ کی بیٹی کو سوچنی چاہئیں۔ جس نے اپنے سونے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں آوارگی میں لپیٹ کر گروی رکھ دی ہیں۔“ بسمہ کی آواز حد درجہ بلند اور لہجہ انتہائی گستاخانہ تھا۔

”بھابھی جان! اس کو چپ کرائیں جب بڑے بات کر رہے ہیں تو بیچ میں۔“

”میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں۔ اتنی بڑی ہو گئی غانیہ! بڑوں کے علم میں لائے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا اس نے۔“

”خدا کا خوف کھائیے بھابھی جان! میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔“

”سارے ماں باپ ایسے ہی کہتے ہیں۔ ابھی میری بیٹی کا کہنا اتنا برا لگا۔ جب ساری دنیا کہے گی تو کس کس کا منہ بند کرو گے۔“

”لوہ میرے خدا۔“ اس نے کرب سے اپنے کانوں

پر ہاتھ رکھ لیے۔

”بلاؤ اسے اور پوچھو۔ جب سب کو پتا ہے کہ میں وقار کا رشتہ اپنی بہن کے گھر کرنے والی ہوں۔ تو یہ اکیلی اس سے ملنے کیوں گئی تھی۔ کون سی قسمیں وعدے تھے۔ جو یاد دلانے گئی تھی۔“

بڑی اماں کی حید سے گری ہوئی باتیں اس کے حواس سلب کر رہی تھیں۔

اس نے یکے بعد دیگرے کئی مسیح وقار کو بھیجے تھے۔ اس نے تسلی دی تھی کہ وہ جلدی پہنچ جائے گا۔ لیکن اب تک نہیں آیا تھا۔ ہاں لیکن وہ ذلت آمیز گھڑی آگئی۔

ابا میاں اماں بی بی بڑی اماں اور بسمہ چاروں نفوس اس پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ ہر نگاہ میں الگ تاثر تھا۔ ”التحا آمید حسرت خوف تحقیر نفرت اور وہ ان میں سے کسی ایک کے سامنے بھی ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ آواز اس کے حلق میں گھٹنے لگی۔ آنکھوں میں کنکر سے چھنے لگے۔ دل میں بے ساختہ پچھتاوے نے سر اٹھایا۔“

”ایسی محبت سے تو میں نامراد ہی بھلی تھی۔ جس نے مجھے اور میرے ماں باپ کو خوار کر دیا۔“ کب تک سر جھکا کے کھڑی رہتی۔ بڑی اماں کی زبان کو روکنا بے حد مشکل تھا۔

”میں مجھے وقار نے خود بلایا تھا۔“ آواز پھنسی پھنسی سی حلق سے نکلی۔

”لو بھائی والی کا لاحقہ بھی ختم وہ صرف وقار کب سے ہو گیا۔ تمہارے لیے۔“ بڑی اماں نے بہت باریک نکتہ سوچ سمجھ کے اٹھایا تھا۔ شرمندگی کے مارے اس کی زبان لڑکھڑائی۔ یہ فرمائش بھی وقار ہی کی تھی۔

”ابا میاں! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے پتا تھا بڑی اماں گھر پہ ہیں۔ اسی لیے میں چلی گئی درنہ۔“ آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

اسے لگ رہا تھا آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ اتنی ذلت اور وہ بھی اپنے اتنے قریبی لوگوں کی



زبان سے سننے کے بعد زندہ رہنے کا دل بھی کس کا چاہے۔  
یہ وقت بھی آتا تھا زندگی میں۔ اتنی ذلت بھی برداشت کرنی تھی۔ اسے بھی اور اس ہی کی وجہ سے اس کے اتنے پیارے اور معصوم ابا میاں اور اماں بی کو بھی۔

”انہوں نے مجھے مسیح کیا تھا کس۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

”موبائل کب آیا تمہارے پاس۔ یہ بات بھی ہمیں اب پتا چلی۔ تم کب آکے اسے بتا کے چلی گئیں۔ ہمیں کیا پتا اور ہمیں پتا دکھانا، نمبر دینا گوارا نہیں کیا۔ اس کے پاس سب تفصیل موجود ہے۔ بس وہی اہم ہے سارے گھر میں تمہارے لیے۔“

بڑی اماں کی آواز تھی یا صور اسرافیل۔ آج ان ہی کا دن تھا اس کے خوف زدہ دل اور اٹھل پھل دھڑکنوں نے تسلیم کیا اور صدق دل سے اپنے مرجانے کی دعا مانگی۔ لیکن ابھی دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی آئی ہی نہیں تھی۔

بڑی اماں دنگ انداز میں واپسی کے لیے کھڑی ہو چکی تھیں۔ جب ہی اس نے داخلی دروازے سے وقار کو آتے دیکھا۔

اس کے مرہ وجود میں جان سی پڑ گئی۔ معاملہ کیا تھا۔ یہ جانتا تھا اور اسے صرف وقار کی گواہی کی ضرورت تھی بس۔ اس سے آگے وہ اس سے کچھ امید نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بی اماں کے جھکے ہوئے سر اور زردی مائل ابا میاں کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

”تم! تم کیوں آئے ہو یہاں۔ میں نے منع کیا تھا نا۔“ بڑی اماں اسے دیکھ کر غضبناک ہوئیں۔ وہ اب بھی کسی مجرم کی طرح دیوار سے لگی تھی۔

”یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے۔ کیوں آئی ہیں آپ یہاں۔ اپنے سگوں کی عزت کا جنازہ نکالنے۔“ وقار ان پر الٹ پڑا۔ اس کی بات پر بڑی اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”ارے میں کیا جنازہ نکالوں گی۔ اس جنم جلی۔“ کو جو کہتا ہے۔  
”مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا۔ آپ گھر چلیں بس۔“  
”کیوں۔ کیوں جاؤں میں۔ کسی سے ڈرتی نہیں ہوں میں۔“

”اللہ سے تو ڈرتی ہیں نا امی۔ اللہ کے واسطے چپ ہو جائیں۔ اور کسی کی بیٹی پر کچھ اچھالنے سے پہلے اپنا گھر اور اپنی بیٹی کو یاد رکھیں۔ میں نے بلایا تھا غانیہ کو وہ خود سے نہیں گئی تھی۔ وہ کبھی خود سے میرے پاس نہیں آئی۔ کبھی بھی نہیں۔“ بڑی اماں کو اس سے اس صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

”چچا جان!“ وہ بت کی مانند ساکت ابا میاں کی طرف بڑھا۔

”مجھے کچھ نہیں کہنا آپ سے۔ سوائے اس کے کہ غلطی میری تھی۔ اس کی سزا کسی طور غانیہ کو مت دیجیے گا۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں آپ کی عزت کو اپنی عزت نہ بنا سکا۔ نہ اپنی بات نبھاسکا۔“

ابا میاں کے مرہ ہوئے وجود میں اس کے اعتراف سے جیسے جان سی پڑ گئی۔ بی اماں دوشہ منہ پر ڈال کے ہنسنے لگی۔

بڑی اماں اور ہسمہ جا چکی تھیں۔ ان کے پاس یہ جذباتی منظر دیکھنے کی برداشت تھی نہ وقت۔ وقار نے ایک آخری نظر اس پر ڈالی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور وہ ایک پل میں پلٹ گیا۔ آخری نظریا دونوں کی اساس بنا کر دل میں ہمیشہ کے لیے ثبت کر کے۔

\*\*\*

لس جاناں، فشار جاں بارش  
زخم تازہ کی راز داں بارش  
ٹوٹ کر برسے تیری یاد کے پھول  
پھر ہوئی رات ناگہاں بارش

اک نئے قرب کا پیاسا ہے وجود  
ایک نئے خواب کا جہاں بارش  
ہجر کی دھوپ دلاتی ہے یاد  
پاس بھڑکاتی مہریاں بارش  
جس جاں کس طرح سہاریں گے  
بل و بل دے، ہمیں اماں بارش  
خواہش وصل استعارہ ہے  
بھول سکتے ہیں ہم کہاں بارش  
قرب یاراں کی تیز خوشبو اور  
کشتی خواب، بادیاں بارش

پلے پڑتے اور انا پہ موتی سے بکھرے ہوئے تھے  
اس کی انگلیاں لفظوں پر بے تابی سے چلتی کسی کا کھویا  
ہوا اس تلاش کر رہی تھیں۔

وہ ان کی شادی کے بعد پہلا سا دن بھاؤں تھا۔ جب ماہم پنڈرائٹنگ نے ان کی ڈائری میں اپنے جذبات رقم کیے تھے۔

ایک بھولی بوسہ یاد دہن کے دریچوں میں سے نکل کر، نمی بن کر آنکھوں کی دہلیز پر چمکی۔ اس نے وہ نمی چپکے سے پوروں پہ اتار لی۔

بچے پاس ہی کھیل رہے تھے۔ اسے یوں آنکھیں صاف کرتے دیکھ کر گھبرا جاتے۔ موجد تو ابھی چھوٹا ہی تھا۔ لیکن نبیہ اپنی ماما کی غیر موجودگی سے بری طرح بکھر گئی تھی۔ اس کی اداسی کا سبب ایک حد تک سمجھتی بھی تھی اور پھر پریشان بھی ہوتی تھی۔

”بالکل تمہاری جیسی ہے۔ تمہاری بیٹی بھی ماہم! معصوم اور حساس۔“ اس کی نظروں میں محبت کا ایک جہاں آباد تھا۔

سامنے کا منظر نامکمل تھا۔ بچے کھیل رہے تھے خوش تھے۔ اس کے ساتھ شرارتیں کر رہے تھے لیکن اس بھرپور منظر میں فقط ایک ہی کمی تھی۔ ایک دھڑا، ایک احساس، نامکمل منظر نامے کو اکملیت کا درجہ تک پہنچاتا اور وہ وجود کس کا تھا۔

پر سوچ نظروں میں کسی کی شبیہ ابھری۔ وہ چونک گیا۔ دھیان کہیں بہت دور سے واپس پلٹا تھا۔ اور وہ

بے یقینی سے بڑھ رہا تھا۔

”غانیہ! غانیہ حسن۔“ تیز ہوتی دھڑکنوں میں کسی نے بہت مدھم سروں میں اس کا نام لیا۔ وہ اس کی بازگشت بہت دیر تک سنتا محظوظ ہوتا رہا۔

\*\*\*

یادوں کی کوئیں قطار در قطار اپنی چونچیں پروں میں دبائے اور اس بیٹھی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ذرا کی ذرا نمی نے اپنی چھب دکھلائی۔ اس نے نرمی سے آنکھیں صاف کیں اور الارم اٹھا کے بجتنے سے پہلے بند کر دیا۔

آج پھر پوری رات یادوں کے سہارے کٹ گئی تھی۔

”اور جانے کب تک یہ یادیں میرا دامن پکڑی رہیں گی۔“

مجر پڑھ کر دیر تک ابا میاں بی اماں بڑے ابا اور بڑی اماں کے ایصال ثواب کے لیے دعا کرتی رہی۔ جن کی یکے بعد دیگرے جدائی کے غم پر گزرتے وقت نے مرہم رکھ دیا تھا۔

وقت بذات خود بھی بہت بڑا مرہم ہے۔ ہر واقعے پر چاہے وہ کتنا ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک کیوں نہ ہو۔ دھول ڈال دیتا ہے۔

”ہزار بار کہہ چکی ہوں، مت ٹالا کرو میری بات۔ مگر تمہیں تو مجھے نیچا دکھا کے جانے کون سی خوشی ملتی ہے۔“

”یا اللہ! اتنی صبح صبح۔“ اس نے فکر مندی سے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔

”کیا ہو گیا ہے نازش کو۔ کم سے کم ٹائم تو دیکھے۔“ اس نے خود کلامی کی۔ پھر صلوٰۃ الحاجات کی نیت باندھ لی۔

\*\*\*

”مرتنی بہت پریشان ہے۔ اس کے بیٹے کو ٹانفائیڈ ہو گیا ہے۔“ تابندہ اسے بتا رہی تھی۔ اس نے تشویش سے تابندہ کو دیکھا۔



”اتنے چھوٹے سے بچے کو ٹائفائیڈ۔“ صحیح معنوں میں اسے فکر نہ گھیرا۔  
”جو رورش‘ جو دیکھ بھال ماں کر سکتی ہے۔ کوئی اور عورت نہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے ہنکارا بھرا۔ پھر کچھ سوچ کے بولی۔

”میں چلوں آج تمہارے ساتھ ان کے بیٹے کو دیکھنے۔“ تابندہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر کندھے اچکا دیے۔

”آئی سے بھی مل لوں گی۔ بہت دن ہو گئے۔“ اس نے خواہ مخواہ جیہہ پیش کی۔ تابندہ ہنس دی۔

”ابزبوش۔“  
مرتنضی‘ تابندہ کے فلیٹ کے اوپر والے فلور میں رہتا تھا۔ اسی نے اسے جاب دلوائی تھی۔ تابندہ اسی لیے اس کی اور بھی مشکور رہتی تھی۔ اور خیال بھی رکھتی تھی۔ خاص طور پر اس کے تہارہ جانے کے بعد۔

”بہت محبت کرنے والی بیوی تھی اس کی اور بہت خوب صورت بھی۔ بہت محبت کرتا تھا مرتنضی۔ بس پتا نہیں موحہ کی پیدائش کے وقت کیا پر اہلم ہوئی کہ چند مہینوں سے زیادہ جی نہیں سکی۔ بے چاری۔“ وہ راستے بھرا سے مرتنضی کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس نے دل میں اس کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ ”بے چارہ۔“ دروازہ کھلنے تک یہ آخری لفظ تھا جو غانیہ نے اس کے بارے میں سوچا۔

بے چارہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ خوش گواہ حیرت میں گھرا اسے دیکھے گیا۔  
”آپ غانیہ!“ اس کے لبوں نے بہت خوش ہو کے اسے پکارا تھا۔

”نیں بھی آئی ہوں۔“ وہ پہلے ہی اس کے ارتکاز سے کنفیوز تھی۔ تابندہ کی بات سے اور پرل ہو گئی۔  
”وہ آپ کے بیٹے کی طبیعت کے بارے میں بتایا تھا۔ تالی نے تو۔“ دروازے کے فریم میں فٹ اس کا

لبا چوڑا وجود دیکھتے ہوئے لگتا تھا یہیں سے عیادت کر کے پلٹنا پڑے گا لیکن اسے جلد ہی خیال آگیا۔  
”اچھا۔ اچھا۔ آئیں اندر آئیں۔“ اس نے جھجکے ہوئے قدم اندر رکھا۔ تالی اپنی جگہ پر جمی تھی۔  
”تم بھی آؤ۔“ اس نے بازو سے پکڑ کے تالی کو اندر گھسیٹا۔

غانیہ نے بغور ان کی بے تکلفی ملاحظہ کی۔ آفس میں ایسے مظاہرے کبھی دیکھنے کو نہیں ملے تھے۔  
”نیں تو سمجھی۔ تمہاری مہمان صرف یہی ہے۔“ تالی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ مصنوعی ناراضی۔ اسے وہیں بیٹھے بیٹھے الجھن نے گھیر لیا۔ ایسے معنی خیز فقروں کے تبادلے کی کیا ضرورت ہے آخر۔

”موحد کیا ہے اور کہاں ہے؟“ تالی اب سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔  
”بہتر ہے پہلے سے۔ سو رہا ہے۔“ مرتنضی کے چہرے پر بھی ذرا سنجیدگی چھا گئی۔  
”نیں اسے دیکھ لوں۔“ تالی کہتی ہوئی اٹھی۔  
”اولیں شیور۔“ اس نے پاس ہی کا ایک دروازہ کھولا۔

یہ شاید مرتنضی کا ہی کمرہ تھا اسے سازو سامان سے اندازہ ہوا۔  
اخروٹ کی لکڑی سے بنا نفیس ڈیزائن والا فرنیچر اور اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کرتی ڈھیر ساری انگلش اور اردو کی مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں۔  
اس نے ایک طائرانہ نگاہ میں اچھا خاصا جائزہ لے ڈالا۔

بیڈ کے سرہانے لگی اس کی شادی کی بڑی سی تصویر وہ اور اس کی بیوی۔  
”او میرا گڈا۔“ تالی کی آواز نے اس کا تسلسل توڑا۔

موحد اٹھ گیا تھا اور منہ بسورتا تالی کی طرف ہنک رہا تھا اس نے فوراً اسے گود میں بھر لیا۔ غانیہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔  
وہ قدرے زردی مائل رنگت کا کمزور سا بچہ تھا۔

نقشِ خوبصورت تھے۔ مرتنضی سے کافی مشابہت تھی۔  
”جب ان بچوں کی ماں زندہ تھی۔ تب یہ دونوں بہت صحت مند اور خوبصورت ہوتے تھے۔ اتنے پیارے کہ جو دیکھتا تھا پیار کیے بغیر رہ نہیں پاتا تھا۔“  
تابندہ کے لہجے میں محبت بول رہی تھی۔  
وہ کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ مرتنضی بچن سے تابندہ کو آواز میں دے رہا تھا۔ وہ موحہ کو اس کی گود میں دے کر لپک جھپک باہر نکل گئی۔

پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ موحہ کچھ دیر تو اس کی گود میں بیٹھا پھر کسمسہ کے رونے لگا۔ وہ اس کے رونے سے گھبرا گئی کیونکہ وہ ایک دم ہی چیخیں مارنے لگا تھا۔ مرتنضی تیزی سے بید روم میں آیا۔  
”پتا نہیں اسے کیا ہو گیا۔ ابھی تو اچھا خاصا تھا۔“ وہ گھبراہٹ میں بلاوجہ صفائی دینے لگی۔

بچہ اس کی گود میں جاتے ہی اس کے شانے پر سر رکھ کر سکون ہو گیا تھا۔  
”چلیں باہر۔ چائے پی لیں۔“ وہ اسے دیکھ کے مسکرایا۔

”نئے اور انجان لوگوں سے گھبراتے ہیں بچے۔“ اس نے یونہی ایک فضول سی بات کی۔  
”حالانکہ آپ تو نہ نئی ہیں۔ نہ انجان۔“ اس کا مسکراتا ہوا لہجہ صاف بھی تھا اور مضبوط بھی۔  
”جی۔“ وہ ایک بار پھر پرل ہونے لگی۔  
”آئیے چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ وہ آگے چل پڑا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس کی نظر ڈرنگ ٹیبل پر پڑی۔

تہاں اس کے فیورٹ پرفیوم کی کئی شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ اس کی پشت پر ایک نظر ڈال کے رہ گئی۔  
”تم بہت ہی بکو اس چائے بناتے ہو۔“ تالی فل فارم میں تھی۔

”تم اتنی بے دار چائے پی پی کے یوز ٹو ہو گئی ہو۔ آج اس غانیہ بتائیں گی۔ چائے کیسی ہے۔“  
”یہ کہاں ہے؟“ تالی نے اس کی بات ان سنی کنڈی۔ غانیہ نے شکر ادا کیا۔

”میں نے اسے بوا کے ساتھ ان کے گھر بھیج دیا ان کے پوتے پوتیوں میں دل بہل جاتا ہے اس کا۔“  
مرتنضی کا لہجہ ایک دم اداس ہو گیا۔ یا اسے ہی لگا وہ اندازہ نہیں کر سکی۔

اس نے چائے پیتے ہی واپسی کا راہ ظاہر کر دیا۔  
مرتنضی کی گہری نگاہیں اس کی ہتھیلیاں غم کر رہی تھیں۔ چلتے وقت وہ ایک خوبصورت پنک کمر کی شیشی اس کی طرف برہا رہا تھا۔

”تمہاری والدہ کہتی تھیں۔ پہلی بار مہمان گھر آئیں تو انہیں خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجتے یہ ہمارے خاندان کی روایت کے خلاف ہے۔“ وہ اتنا روایت پسند تھا نہیں جتنا اس وقت بن رہا تھا۔

”میں بنا کسی موقع کے یونہی ہر ایک سے گفت نہیں لیتی۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔“ اس کی آواز میں کوئی لچک نہیں تھی۔ وہ خفیف سا ہو گیا۔  
تابندہ کو بھی انکار کی امید نہیں تھی۔ وہ محض کندھے اچکا کے رہ گئی۔

”چلیں۔ پھر ہم کسی موقع کا انتظار کر لیں گے۔“ اس نے برامانے بغیر پلٹ کر وہ پرفیوم سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

”آپ کے آنے کا بہت شکریہ مجھے خوشی ہوئی۔“ وہ موحہ کو تابندہ کی گود سے لیتے ہوئے بظاہر اسی سے کہہ رہا تھا لیکن غانیہ سمجھتی تھی یہ آپ جناب کا تکلف تالی کے لیے نہیں تھا۔  
واپسی میں سارا وقت اسے ایک بات چبھتی رہی۔  
”اسے کس نے بتایا کہ میرا فیورٹ پرفیوم ہے۔“

\*\*\*

اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقار آفس سے پہلے واپس گھر پہنچ گیا اور اس کے فلیٹ پر تالا پڑا دیکھا تو باہر ہی مل جائے گا۔ اور یہی ہوا۔  
وہ باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ بے چینی سے سیڑھیوں کی طرف دیکھتا یقیناً اس کا منتظر تھا۔ اپنے اندازے کی درستگی پر اسے چنداں حیرت نہیں تھی۔ اسے محسوس



ہوا وہ وقار کی رگ رگ سے واقف ہے۔  
 ”لیکن یہ واقفیت کس کام کی بھلا۔“ اسے اپنے  
 لیے فکر مند دیکھ کر دل میں اترتے طمانیت کے موہوم  
 احساس سے قطع نظر اسی سے سوچا۔  
 ”کہاں تھیں آج تم اتنی دیر۔“ فکر اس کے  
 چہرے پہ بکھرا تھا۔

”مابذہ ہے نا۔ میری کولیگ اس کے ساتھ اس  
 کے گھر چلی گئی تھی۔“ اس نے تالا کھول کر اندر قدم  
 رکھا۔

”ایسی کولیگ سے اتنی دوستی کب سے ہو گئی  
 تمہاری۔“ اس کی آواز میں طنز نہیں تعجب تھا۔ پھر بھی  
 اسے ناگوار گزرا۔

”زندگی گزارنے کے لیے کوئی سہارا نہ ہو۔ تو یہ  
 مصنوعی بیساکھیاں ہی کام آتی ہیں۔“ وقار اس کی بات  
 پر چپ سا ہو گیا۔

اسے محسوس ہوا۔ وہ برسوں پہلے والی نادان، سترہ  
 اٹھارہ سالہ غانیہ نہیں ہے جس پر اس کی ماں بہنیں  
 وقت بے وقت الفاظ کے تیر چلایا کرتی تھیں۔

”اور دیے بھی وہ صرف میری کولیگ نہیں۔ بہت  
 اچھی اور مخلص دوست بھی ہے۔ مجھے اس کی دوستی پر  
 فخر ہے۔“

اس نے واش روم سے نکل کے بات کو بات سے  
 جوڑا۔ اور وقار کسی دھیان سے واپس آیا۔ اس کا چہرہ  
 اتنے غم اٹھا کے ایک مسلسل تنہائی کا عذاب سہہ سہہ کر  
 بھی ماند نہیں پڑا تھا۔

شاید یہ اس کے اندر کی خوبصورتی تھی جو ہمیشہ اس  
 کے معصوم چہرے پر نظر آتی تھی۔

سالوں پہلے اپنی بزدلی کو مجبوری کا لبادہ اوڑھا کے جو  
 زیادتی اس کے ساتھ کر چکا تھا۔ اس کا ازالہ تو ممکن  
 نہیں تھا۔ ہاں ضمیر کی چھین میں کمی واقع ہو جاتی تھی۔  
 ”کیس جایا کرو تو مجھے انفارم کر دیا کرو۔ مجھے فکر  
 ہونے لگتی ہے اور نازش کی عادت کا بھی پتا ہے نا  
 تمہیں۔ میں نہیں چاہتا اسے تمہارے بارے میں  
 ایک لفظ بھی کہنے کا موقع ملے۔“ چائے کے کپ

کھنکھاتی وہ رک سی گئی۔ پھر پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔  
 ”میں کسی کے کہنے کی پروا کرنی عرصہ ہوا چھوڑ چکی  
 ہوں وقار! اور نازش تمہاری بیوی ہے۔ میں اس کی  
 بیوی نہیں۔ بہتر ہو گا تم اس کے آنے جانے کی فکر نہ  
 کرو۔“

اس کا پریش لوجہ وقار کے لیے نیا نہیں تو کوئی  
 بہت پرانا بھی نہیں تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا نرم  
 ملامت و محبت بھری نظریں پھر چپ چاپ پلٹ گیا۔

اسے یوں جاتا دیکھ کر غانیہ کے دل میں افسوس نے  
 سراٹھایا۔

اس کی چائے جانے کیوں نکالی تھی اس نے۔  
 حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اسے نازش کی موجودگی میں اتنی  
 مہلت کبھی نہیں ملے گی کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر  
 ایک کپ چائے ہی پی لے۔

اس نے ایک تھکی ہوئی نگاہ ادھر ڈالی۔ جہاں  
 سلیب پر چائے کے کپ رکھے تھے۔ بھاپ اڑا رہی گرا  
 گرم چائے دیکھ کر اس کی تھکن میں کمی کے بجائے  
 ایک دم اضافہ ہوا اس نے دونوں کپ اٹھا کے سنگ میں  
 انڈل دیے۔ چائے پینے کی شدید خواہش اچانک ہی ر  
 گئی تھی۔

اس کے دل میں عرصہ دراز سے پلنے والے خوابوں  
 کی طرح جو ایک دن اچانک اپنی موت آپ مر گئے  
 تھے۔

”وقار، نازش سے شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔“  
 اماں بی، ابامیاں کو بتا رہی تھیں۔ وہ دودھ کا گلاس لے  
 دروازے پر کھڑی رہ گئی۔

”مجھے معلوم ہے۔ اسے ہمیشہ سے ہماری گڑیا کے  
 ساتھ کی خواہش تھی۔“ ابامیاں کا لوجہ ٹوٹا ہوا تھا۔  
 ”لیکن اب احتجاج کا کیا فائدہ۔“

”بھابھی جان نے جان کی قسم دے کر منوائی ہے  
 بات۔ کل یہاں تک آ رہی تھیں چیخنے چلانے کی  
 آوازیں۔“ اماں کو سب خبریں تھیں۔ بظاہر اورد گرد

ہے کتابے خبر دہکتی تھیں۔

”ایک بار بھائی صاحب نے وقار کے سامنے غانیہ کو  
 ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وقار بھی راضی  
 تھا۔ میں اگر چاہتا تو بھائی جان کی آخری خواہش کا  
 واسطہ میں بھی دے سکتا تھا۔ مرے ہوئے باپ کی  
 آخری خواہش بقید حیات ماں کی زبردستی کے آگے  
 یقیناً بھاری ہوتی مگر میں اتنی خود غرض فطرت کا  
 نہیں۔“ ابامیاں کی آواز میں کسی بہت اپنے کے  
 رائے ہو جانے کا غم بول رہا تھا۔

اس کا دل کھنڈر ہو گیا۔ خوابوں کی ٹہنیوں پر جھٹکتے  
 تعبیر کے پھول تو اسی دن راکھ ہو گئے تھے۔ جس دن  
 اس نے صاف الفاظ میں ابامیاں سے کہا تھا کہ میں  
 آپ کی عزت کو اپنی عزت نہیں بنا سکتا۔

خواہش خوش فہمی میں بدل گئی تھی۔ اسے اپنی  
 حالت پر بیک وقت غصہ بھی آیا اور ترس بھی۔ ”کیوں  
 اس بے وفائے بزدل میں دل اٹک گیا میرا کیوں؟“  
 ساری رات اشکوں کی جھڑی، پلکوں کی دہلیز  
 پھلانگ کر تکیے کے نرم نرم رخ سے چہ گوئیاں کرتی  
 رہی۔ انہیں روکنا اس کے بس میں نہ تھا۔

حال مت پوچھو عشق کرنے کا  
 عمر جینے کی شوق مرنے کا  
 آج اسے کسی کام سے اکاؤنٹ سیکشن کی طرف آنا  
 پڑا۔ کافی دن بعد تقریباً پندرہ دن کے بعد مرتضیٰ کو  
 دکھائے بیٹھے کی دیوار کے اس طرف وہ پوری طرح مکن  
 تھا۔

کھنکھایاں اور تانہ شیو کی چمک لیے روشن چہرہ  
 ستوں ناک، کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جملے، کسی  
 سوچ میں گم تھا۔

لفظ محبت کی احتیاط کے دن  
 ہائے موسم وہ خود سے ڈرنے کا  
 کن عام صدیقی وہاں پایا جاتا تھا اور محفل زعفران

زار سی۔ لولہ وہ عزت سارہا تھا۔ وہ بنا دستک دے ہی  
 اس کے کمرے میں چلی آئی اور سامنے جا کے  
 کھنکھاری۔ جانتی تھی وہ کبھی برا نہیں منا سکتا۔  
 جانے کیوں۔ اور اک کے در اس پر اچانک ہی وا ہوئے  
 تھے۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا اور ایک دم ہی  
 مسکرا دیا۔

”زہے نصیب! آج اس روکھے پھیکے ڈیپارٹمنٹ  
 کو رونق بخش ہی دی آپ نے۔“

”مجھے انصاری صاحب نے بھیجا ہے۔ یہ والی پے  
 منٹ سب انہیں چاہئیں، ارجنٹ۔“ اس نے ایک  
 چٹ اس کی طرف بڑھائی۔

”اوکے۔“ اس نے چٹ لے کر سنجیدگی سے  
 دیکھا۔ ”بیٹھیں پلیز۔“ وہ سر پر اسکارف جماتی ہوئی  
 بیٹھ گئی۔

اس نے فون پر کسی سے بات کی۔ پھر فون رکھ کے  
 اسے دیکھا۔

”انصاری صاحب مجھے کل بھی تو کر سکتے تھے۔“  
 ”کیا آپ کو میرا آنا برا لگا۔“ بے ساختہ اس کے منہ  
 سے نکلا وہ اتنی ہی بے ساختہ چھتائی بھی۔

”کیا آپ کو لگتا ہے ایسا ہو سکتا ہے۔“  
 سوال حاضر تھا۔

”وہ بڑی تھے۔ آج ان کا سیل گھر پر رہ گیا۔ کام  
 ارجنٹ تھا۔ تو میں نے کہا کہ آپ اتنی دور کہاں جائیں  
 گے میرا کام تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ میں کروا دیتی  
 ہوں۔“ اس نے جھکی جھکی نظروں سے تفصیل پیش  
 کی۔

مرتضیٰ کے سامنے اس نے شاید پہلی بار اتنی لمبی  
 بات کی تھی۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا۔  
 ”سچ تو لیتی نہیں آپ۔ کچھ لیں گی۔ چائے“  
 ٹھنڈا۔

”نہیں شکریہ۔ بس آپ ذرا جلدی سے۔“

وہ اپنی نرم دل فطرت سے مجبور ہو کر انصاری  
 صاحب کی جگہ خود آگئی تھی لیکن اب اس کی پریش



نظروں کے حصار میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔  
 ”واؤ چر بنے گا۔ پرنٹ آؤٹ نکلے گا۔“  
 ”کتنی دیر لگے گی۔“ اس نے بے چینی سے بات  
 کاٹی دی۔

”اونی سیون ٹوٹین منٹس۔“ اس کے منع کرنے  
 کے باوجود اس نے دوکانی آرڈر کر دیں۔ براہوا کہ واؤ چر  
 پہلے آگئے۔ کافی نہیں آئی۔  
 وہ واؤ چر تھامتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور میں نے جو کافی منگوائی تھی اس کا کیا۔“ وہ اس  
 کے شکایتی لہجے پر ہنس دی۔  
 ”میں نے تو منع ہی کیا تھا۔ اوکے میں تابی کو بھیجتی  
 ہوں۔“

”میں نے تابی کے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ بیٹے  
 کے لیے منگائی ہے۔“ اس کا جتنا ہوا التجہ بگھیر ہو گیا۔  
 اس سے کوئی بات نہیں بن پڑی۔

مرتضیٰ کی آنکھوں اور لہجے سے جھلکتی پسندیدگی  
 اس سے مخفی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے ساتھ  
 وقت گزارنا چاہتا ہے۔

مرد کی نگاہوں کا مفہوم سمجھنا کسی بھی عورت کے  
 لیے مشکل نہیں ہوتا لیکن وہ سمجھ کے بھی سمجھنا نہیں  
 چاہتی تھی۔ یہ اس کی مرضی بھی تھی اور مجبوری بھی۔  
 گلاس ڈور کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کے اس نے ذرا کی ذرا  
 اس کے پر امید چہرے کو دیکھا۔

”میں تابی کو بھیجتی ہوں۔“ وہ جاچکی تھی۔ اپنی  
 پاکیزہ خوشبو اس کے پاس چھوڑ کر۔ وہ دیر تک اس کی  
 موجودگی کو ارد گرد محسوس کرتا رہا۔



”تو کیوں جاتے ہو بھاگ بھاگ کے۔ اور تو کسی کو  
 دینے کا خیال تک نہیں آیا تمہیں۔“

دونوں فلیٹوں کے بیچ موجود روشن دان کو وہ عرصہ  
 ہوا بند کر چکی تھی۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں سے کوئی درز  
 کوئی جھری پھلانگ کر نوک دار بات اس کی سماعتوں کو

زخمی کرنے پہنچ ہی جاتی تھی۔ اپنی پسند کی خوش ذائقہ  
 اور خوش رنگ مٹھائی اس کے حلق میں پھنس گئی۔  
 وقار نے اپنی پروموشن کی خوشی میں مٹھائی لاس کے  
 تھی۔

غانیہ کو کبھی اسے بتانا نہیں پڑا تھا کہ اسے کیا پڑ  
 ہے۔ کیا ناپسند ہے۔ عجیب رشتہ تھا۔ ادھورا۔ ہانور۔  
 بے نام۔ نادیدہ۔

وہ مہینوں میں کبھی اس کے فلیٹ میں قدم رکھتا تو  
 بھی نازش کے سینے پر سانب لوٹ جاتے۔

یوٹیلٹی بلز سے لے کر گھر کے مینٹی نینس تک  
 اپنا ہر خرچہ وہ خود اٹھاتا ہی تھی۔ کیونکہ ابامیاں نے  
 اسے کبھی حصول تعلیم سے روکا نہیں تھا۔ یہی تعلیم  
 ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کے کام آئی  
 تھی۔ ابامیاں کی دکان سے حاصل شدہ کرائے اور اپنی  
 نوکری کی بدولت اسے کبھی ایک پیسے کے لیے بھی وقار  
 کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا نا پڑا تھا۔

پھر بھی وقار کا ایک جملہ ”وہ میری ذمہ داری ہے۔“  
 کئی دن کے لیے جھگڑے کی بنیاد بن جاتا۔

نازش کا موقف تھا کہ وقار کے دل میں ابھی بھی  
 غانیہ کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔

وقار نے کبھی اس بات کی تردید کی نہ تائید۔ وہ کبھی  
 جان نہیں سکی کہ وقار کے دل میں اس کے لیے وہ نرم  
 گوشہ، گوشہ محبت ہے۔ جہاں اس کی نامراد محبت  
 زندگی بھر کے لیے پچھتاؤؤں کی مٹی، خوابوں کے بلے  
 سے اٹھا اٹھا کے اپنے مرقد پر اڑاتی رہتی ہے۔

غانیہ جانتی تھی۔ نازش کے مزاج کی چڑچڑاہٹ  
 میں بہت بڑا حصہ اس کا بھی تھا۔ بہت عرصے اپنے  
 آپ میں چور رہنے کے بعد اس نے پروا کرنی چھوڑ  
 دی۔ وہ مزاج کی پہلے سے ہی بہت کڑوی تھی۔

وقار کی مرضی اور پسند سے ٹی وی دیکھنے پر بھی  
 پابندی تھی۔ خاص طور پر وہ پروگرام جس میں اس کی  
 پسندیدہ خواتین منظر کا حصہ ہوتیں۔ فلمی ہیروئینز اور  
 ٹی وی ایکٹر۔ تو ایک طرف وہ نیوز کاسٹرز کی تعریف؛

بھی جل جاتی تھی۔  
 اس کی چھوٹی ذہنیت اور فساد فطرت سے صرف  
 وقار ہی نہیں اس کے بھائی بھانج (جو کہ اس کی سگی  
 نند تھی) بھی تنگ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے میکے  
 بہت کم جاتی جاتی بھی تو ایک یا دو گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ  
 ایک دن رک کر واپس آ جاتی تھی۔  
 ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد وقار کو فون کر کے پوچھتی کہ  
 کہاں ہو کیا کر رہے ہو۔

ایسے میں غانیہ کو وقار کے اوپر جی بھر کے ترس  
 آتا۔ وقار نے اسے محبت، توجہ اور تحفظ دینے کی ہر  
 ممکن اور پوری کوشش کی تھی اور کوئی کسر نہیں  
 چھوڑی تھی لیکن۔

”اس عورت نے خوش اور مطمئن ہونا سیکھا ہی  
 نہیں۔“

کبھی کبھی جھوٹے بھرم کا خول چٹ جاتا اور وہ زمانے  
 بھرے تالان زندگی کی پراگندگی، ہر درد کی شکایت لے کر  
 اس کے پاس آ جاتا۔ حالانکہ اس نے کبھی وقار کے  
 زخموں پر پھاپے نہیں رکھے تھے۔ اسے اپنی محبت کے  
 سبز باغ نہیں دکھائے تھے۔ خدمت اور خلوص کا لالچ  
 دے کر اپنی دیران زندگی سے تھک کر تنگ آ کر کبھی  
 اسے نازش سے چھیننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”بھلا جو شخص ہمیشہ سے میرا تھا۔ میرا ہے۔ اسے  
 میں چھین کر کیا کروں گی جو کسی اور کا ہو کر بھی کسی کا  
 نہیں۔“

اسے یہ بات اپنی نیک اور سچی فطرت کے رکھنے کی  
 وجہ سے دل میں خوشی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی دیتی  
 تھی۔ نازش کا حق تھا کہ اسے پورا شوہر ملتا۔ جسم کے  
 ساتھ ساتھ دل اور دماغ سے بھی۔ اور اسے ملا بھی  
 صرف جسم ہی نہیں دماغ سے بھی زبان سے بھی وہ  
 پورا کا پورا اسی کا تو تھا۔ سب سے خوبصورت اور معتبر  
 رشتے کے حوالے سے اگر نہیں تھا تو بس پورے دل  
 سے نہیں تھا اور دل پر اس کا زور نہیں تھا۔

بچوں کی کمی بھی ان کے درمیان اتفاق کی ایک  
 وجہ تھی لیکن وقار نے کبھی نازش کو نہیں بتایا کہ وہ

ایک ادھوری عورت ہے۔ کبھی نازش کی خامی کا فائدہ  
 اٹھا کے دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں  
 اور کتنے ہی سال اللہ کی رحمت کا انتظار کرتے امید کا  
 دامن تھامے گزار دیے۔

”ہاں ہاں۔ سب سے زیادہ سگی تو وہی ہے۔ اسے نہ  
 دیکھو تو دن نکلے نہ شام ڈھلے تمہاری۔“ موضوع  
 گفتگو ابھی بھی اس کی ذات تھی۔ اور یہ بات اس کے  
 لیے سخت تکلیف کا باعث تھی۔

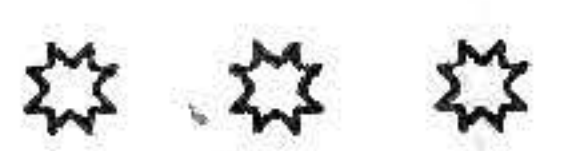
”بکواس بند کرو۔“ وقار ہمیشہ کی طرح دھیماتا تھا۔  
 ”میں کوئی بکواس نہیں کر رہی۔ اس دن تمہارے  
 سامنے میں نے اسے منع کیا تھا کہ تم آفس جا چکے ہو۔  
 پھر بھی! پھر بھی تم نے اسے آفس چھوڑا۔“ وہ دونوں  
 جتنا سمجھتے تھے وہ اس سے کہیں زیادہ باخبر تھی۔

”اور مجھے تو بس اس دن کہیں سے پتا چل گیا۔ تم  
 روز لے لے کر گھومتے پھو، میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔  
 تمہارے یار انے، تم جانو۔“

نازش کی گفتگو کبھی کبھی اخلاقیات کی حدیں  
 پھلانگ کے اسے کانوں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیتی  
 تھی۔

اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی وہ  
 بہت گھٹیا انداز میں ایک بہت پرانی بات یاد دلا رہی  
 تھی۔ وقار معاملے کو رفع دفع کرنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی  
 طرح اس کی زبان بڑھتی جا رہی تھی۔

”تمہیں تو خیر وہ ہمیشہ سے بے چاری اور مجبور لگی۔  
 کوئی خامی، برائی نظر آئے بھی تو کیسے، بچپن کی بندھی  
 ہوئی پٹی ہے آنکھوں پر۔“ اس نے فل والیوم میں  
 ٹی وی چلا دیا اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔



”تمہیں کل مرتضیٰ نے کافی کی آفر کی اور تم نے  
 مجھے بھیج دیا اس کے پاس مجھے بتایا تک نہیں۔“  
 دوسرے دن صبح ہی صبح نابندہ نے اسے جا پکڑا۔

”ہاں تو کیا کرنی۔ میں اکیلے اس کے ساتھ بیٹھ کر  
 کافی انجوائے کرتی۔“ اس نے انجوائے پر خاصا زور دیا



تائبندہ کو ہنسی آگئی۔  
 ”تم بھی نا۔ کمال ہو بس۔“ وہ تائبندہ کی بات پر مسکرا دی۔  
 تائبندہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔  
 ”ایک بات پوچھوں غانیہ! سچ بتانا بالکل۔“ اس کا لہجہ غیر معمولی تھا۔  
 ”خیریت! صبح صبح یہ سنجیدگی۔“ اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔  
 ”تم نے کبھی اپنے فیوچر کے بارے میں سوچا ہے۔“  
 اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا تھم گئے۔ وہ جانتی تھی تائبندہ بات کو کس رخ پر لے کر جانا چاہ رہی ہے۔  
 ”بندہ سوچنے بیٹھ جاتا ہے۔ جبھی تو غلطیاں ہوتی ہیں۔ اللہ ہے مناسب کرنے والا۔“ اس کے چہرے پر بلا کاسکون تھا۔ تائبندہ چڑھ گئی۔  
 ”تو نوکری کیوں کر رہی ہو۔ گھر بیٹھ جاؤ نا۔ من و سلوی اترنے لگے گا۔“ غانیہ کے منہ سے قل قل کرتا ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔  
 پاس موجود گولیگز نے پلٹ کے اسے یوں ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا۔  
 ”ایسا لطیفہ تو نہیں سنایا میں نے۔“ تائبندہ بھی مسکرا دی تھی۔  
 ”تو ہنسنے پر پابندی ہے کیا۔“ وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھی۔  
 ”غانیہ! بات کو ٹالو مت۔ میں تائبندہ ہوں۔ وقار نہیں۔ جس کے آگے اپنے آنسو ہنسی کے پردے میں چھپا کر تم خوش رہنے کی دن رات کامیاب ایکننگ کرتی ہو۔“  
 غانیہ کے ہونٹ سکڑ گئے۔ نظریں سامنے رکھی فائل پر گڑ گئیں اور تائبندہ کی اس کے چہرے پر۔  
 ”مجھے وقار کے سامنے کسی کامیاب اور ناکام ایکننگ کی ضرورت نہیں۔ میری آنکھیں پڑھ سکتا ہے۔ دل میں جھانک سکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں بلا کی ٹھنڈک تھی۔

تائبندہ کچھ دیر اس کی جھکی نظریں دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر چیئر کی بیک پر ٹنگ گئی۔  
 ”تو کیا تم ساری زندگی اس خاموش معاملے کی نذر کرو گئی۔“  
 ”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔  
 ”تو پھر اور کیا کہنا چاہتی ہو۔“ تائبندہ نے اس سے بھی تیزی سے اس کی بات کاٹی۔  
 ”تائبندہ! کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو۔“  
 ”میں پریشان کر نہیں رہی۔ تم ہو پریشان اور تمہاری پریشانی مجھے دکھ دیتی ہے۔“ غانیہ کو لگا اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔  
 ”تمہیں جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔ مجھ سے کچھ مت پوچھو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ زندگی کا ان چاہا لیکن سب سے پرسکون راستہ ہے۔ میں نہیں چاہتی اب اس میں کوئی اور موڑ آئے۔“  
 ”ہاں! ان چاہا پرسکون لیکن دل کی خوشی سے خالی محبت کے بغیر صرف فرض کی طرح آگے پیچھے گزرنے ہوئے خاموش تنہا راتیں اور اداس صبحیں۔ یہ زندگی ہے تمہاری اور یہ ہے زندگی کا راستہ۔“  
 وہ تائبندہ کو دیکھتی رہ گئی۔ جانے وہ کیا ٹھکان کے آئی تھی آج۔ ایسا آئینہ ہلے تو کبھی نہیں دکھایا۔  
 ”تالی تم۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ انٹرکام کی بیل ہو رہی تھی۔  
 ”باس کی کال ہے۔ آئی ہو تو گو۔“ اس نے جان بچنے پر جلدی جلدی فائلیں سمیٹیں۔  
 ”بریک میں بات کریں؟“ تائبندہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔  
 ☆ ☆ ☆  
 لچ بریک تک وہ تالی کو مطمئن کرنے کے لیے بہت سے دلائل گھر چکی تھی۔ لیکن اس ٹائم اس نے ایک نئی بات چھیڑ دی۔

”پی چاہتی ہیں اس سال لے اینڈ تک میری شادی ہو جائے۔“ اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت بکھر گئی۔  
 ”صبح سے بکواس کر رہی تھیں۔ گڈ نیو ز اب دے رہی ہو۔“ سچ سچ خوش ہو گئی۔  
 تائبندہ کی ممکنہ خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ تقریباً دو سال پہلے۔  
 ”لیکن میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی کیونکہ ہو سکتا ہے شادی کے بعد فرحان مجھے جاب نہ کرنے دیں۔“  
 ”تو کیا مطلب ہے تمہارا۔“ وہ سمجھی نہیں۔  
 ”میری ایک بات مانو غانیہ! اگر میں تمہارے نزدیک ایک ذرا سی بھی اہمیت رکھتی ہوں تو پلیز۔“ اس نے غانیہ کے ہاتھ تھام لیے۔ غانیہ کو حیرت ہونے لگی۔ صبح کے برعکس اس وقت وہ بالکل ہی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔  
 ”ہاں ناں بولو تالی! ایسے منت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“  
 ”تم! تم بھی شادی کر لو نا۔ کب تک وقار کے لیے بیٹھی رہو گی۔“ غانیہ نے نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔  
 ”تم سے کس نے کہا کہ میں وقار کے لیے بیٹھی ہوں۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا۔“  
 ”آئی ایم سوری! اگر تم ہرٹ ہو نہیں اس کا مطلب ہے کوئی ڈھنگ کا پریوئل ملے تو تم غور کرو گی۔“  
 ”کیا کہنا چاہتی ہو تالی۔“ وہ ہار مان رہی تھی۔  
 ”مر تفضی تمہیں پر یوز کرنا چاہتا ہے۔“  
 ”کیا؟“ اس نے جھٹک اپنی آواز کو کنٹرول کیا۔  
 ”جی جیران کیوں ہو رہی ہو؟“ وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ بس الجھی الجھی اسے دیکھتی رہی۔  
 ”کوئی نہ کوئی تو تمہارا ہم سفر بنے گا نا۔“  
 ”تو مر تفضی کیوں؟“ اسے خود اپنی بحث کا جواز بتا دیا تھا۔  
 ”تو مر تفضی کیوں نہیں۔“ وہ چند لمحے بے بسی سے اسے دیکھتی رہی پھر راجھ کے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”میں نے فیوچر لے لیے شادی لے بارے میں کچھ نہیں سوچا تالی! میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔“  
 ”کیوں؟“ تالی جھنجھلا گئی۔  
 ”بس میں نہیں کرنا چاہتی شادی۔ وقار کو کیا ملا شادی کر کے ناخوشی، نامرادی۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ تائبندہ کو تاؤ آگیا۔  
 ”تم اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے کو وقار کی ناکام ازواجی زندگی کے آئینے میں دیکھتی ہو۔ غانیہ! کیوں کیوں تم اس کی زندگی کو اس کی خوشیوں کو اس کے غموں کو اپنے اوپر رکھ کے دیکھتی ہو۔ وہ ناخوش ہے تو تم بھی خوش نہیں رہ سکتیں۔ وہ دکھی ہے تو تم بھی دکھی ہو۔ وہ پریشان ہے تو تم پریشان۔ پرو مشن اس کی ہوئی خوشی تمہارے چہرے پر۔ خود فریبی کے حصار سے نکل آؤ۔ غانیہ حسن! تم آج بھی اس سے محبت کرتی ہو مانویا نہ مانو۔ اور یہ جو وہ اپنی شنگی اور محرومی کی کہانیاں تمہیں ہر تھوڑے دن کے بعد آکے سناتا ہے نا تو صرف اس لیے کیونکہ وہ تمہارے دل کے حل سے واقف ہے۔ اسے لطف دیتی ہے یہ بات کہ ایک عورت اس کے نام کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے اور دوسری محض اس کے نام پر زندگی میں کھلنے والا خوشی کا ہر دروازہ بند کیے بیٹھی ہے۔ اور تم مانویا نہ مانو۔ وہ کبھی اس دروازے پر دستک نہیں دینے والا۔“  
 تائبندہ آج اس سے کیا کیا منوانے والی تھی۔ نہ جانے۔  
 ”اپنے دل کے دروازے کھولے اس کا انتظار کرتی عورت۔ مردانہ فطرت کی تسکین کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔“ اس نے ایک لمحہ رک کر غانیہ کا چہرہ دیکھا۔  
 دھواں دھواں آنکھوں میں کرب کی کیفیت رقم تھی۔  
 ”دھوکا دے رہی ہو تم اپنے آپ کو یہ سوچ کر کہ وہ آج بھی تم سے محبت کرنا ہے۔ اس نے کبھی یہ بات تم سے بولو نہیں نا۔ کیونکہ محبت وہ نہیں تم کرنی ہو اس سے۔ انتظار وہ نہیں تم کر رہی ہو اس کا۔ تمہارے شعور کو احساس نہیں ہے۔ وہ منزل پاچکا



ہے۔ نامراد وہ نہیں، تم ہو۔ یکطرفہ محبت، انتظار  
لا حاصل کا نتیجہ آبلہ پانی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے  
راستے پر چل رہی ہو تم جس کا اختتام کسی منزل پر  
نہیں، بند گلی پر ہوگا۔ ایک اندھیری بند گلی۔ جہاں  
تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے کوئی سہارا تمہارے پاس  
نہیں ہوگا۔ وقار بھی نہیں۔“

اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر چکی تھیں۔  
وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر جھٹکے سے اٹھ کر  
بیگ کندھے پر ڈالا۔

تابندہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مڑتے مڑتے ٹھہر  
گئی۔

”ناراض ہو گئیں۔“ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔  
انیت کی شدید لہر جسم و جاں میں سرایت کر چکی تھی۔  
وہ کسی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں تھی۔

”میری باتوں پر غور ضرور کرنا۔“  
تابندہ نے بات مکمل کر کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔  
اس سے پہلے کہ وہ چھڑا لیتی۔ غانیہ پلٹے بغیر کینٹین کی  
حدود سے نکلتی چلی گئی۔

\*\*\*

پورا راستہ وہ چپکے چپکے پلوں سے جھڑتے شفاف  
موتی اپنی انگلیوں کی پوروں پر سنبھالتی ہوئی آئی تھی۔  
وقار کے فلیٹ پر تالا لگا تھا۔ اندر داخل ہوتے  
ہوئے اس نے دیکھ لیا۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ گھر میں  
داخل ہوتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹے تو ایک عرصے  
کے بعد وہ دل کھول کے روئی۔ گھنٹوں بیتا وقت  
گزرے زمانے۔ ابامیاں اور اماں بی کو یاد کرتے  
گزر گئے۔ وہ ان کی تصویریں سینے سے لگائے سسکتی  
رہی۔ ماں باپ جیسی انمول دولت مٹ جانے کا ماتم  
کرتی رہی۔

درو دیوار سے وحشت برس رہی تھی۔ اداسی  
مایوسی اور تنہائی، سکھی سیلیوں کی طرح ہاتھوں میں  
ہاتھ ڈالے اس کے چاروں اور گھیرا بنائے کھڑی تھیں  
اور بیچ میں وہ خود تھی۔ خالی ہاتھ۔ تہی داماں اور نم

آنکھیں لیے۔

کیا کچھ نہیں کہا تھا تابندہ نے۔ اسے حقیقت کے  
آئینے میں اپنی شکل بہت مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔  
خوش فہمی اور بے وقوفی کی انتہاؤں سے رنگاں  
کا چہرہ جس پر نظر پڑتے ہی کسی کو بھی ہنسی آجائے  
کیا وقار و وقار بھی ان رنگوں کو دیکھتا اور اس کی ہنسی  
اڑاتا ہوگا۔

نوک درنوک خیالات اس کا دل چھیرتے رہے۔  
اس کی زخمی سماعتیں مزید کسی طعنے مزید کسی سچائی، مزید  
آگئی کے عذاب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔  
”کوئی یوں بھی گزارتا ہے زندگی۔ سارے رنگوں  
سے الگ، بس سیاہ و سفید دائرے میں مقید، ہر خوشی کا  
راستہ خود پر بند کر کے۔“ اسے یاد آ رہا تھا۔

تابندہ نے بہت بار اسے اپنے خول سے باہر نکالنے  
کی کوشش کی تھی۔

”زندگی بہت خوبصورت ہے غانیہ! خود سائنہ  
اداسی کا جو لبوہ اوڑھے بیٹھی ہو اس سے باہر نکلو۔“  
”ایک محبت نہ مل سکے کا ماتم کب تک کرتی  
رہو گی۔ صرف ایک قدم بڑھاؤ۔ کتنی ہی محبتیں  
تمہیں اپنی منتظر ملیں گی۔“ اسے تابندہ کے خلوص پر  
رتی برابر ٹیک نہیں تھا۔  
وہ سچی تھی۔ مخلص تھی۔ وہ جانتی تھی۔

”وقار کے اندر تمہاری آنکھیں، تمہارا دل پڑھنے  
کی صلاحیت نہیں ہے۔ تمہارا چہرہ آئینہ ہے۔ جسے ہر  
کوئی پڑھ سکتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس جیسے کم کم  
شخص کے بڑوس میں رہتے رہتے تم بھی آنکھیں اور  
لہجے پہچاننے کی صلاحیت کھوتی جا رہی ہو۔“  
اسے یاد آیا۔ صبح اس کے پاس سے اٹھنے سے پہلے  
اس نے یہی کہا تھا۔ اسے ایک بار پھر ٹوٹ کے رونا  
آیا۔

”کیا میں اتنی نادان ہوں کیا میں اتنی کم عمر ہوں؟  
بے وقوف۔ اتنی کم عقل کہ مجھے تم سے کچھ نہ  
ضرورت پڑے۔ اب لوگوں کو پرکھنے کے لیے مجھے  
تمہارے کھینچے گئے حاشیوں کی حدود میں جانا ہوگا۔“

میں بچپن سے بس حصہ لی محبت کے قریب میں  
بتلا، اسی بہانے کے سہارے زندگی گزار رہی ہوں۔ تم  
وہ آخری بہانا بھی مجھ سے چھیننا چاہتی ہو۔ پھر میں زندہ  
کیسے رہوں گی۔ بچے گا ہی کیا میرے پاس۔ زندگی  
کرنے کو اس سے تو اچھا ہے۔ میں خود فریبی کے  
دائرے میں ہی ساری زندگی گزار دوں۔“  
”خود فریبی کا دائرہ نہیں۔ یہ تنہائیوں کا وہ خلا ہے  
جہاں تشنگی، نامرادی کے مہیب سناٹے تمہارے اندر  
کی بجی کبھی زندگی نچوڑنے کو تیار بیٹھے ہیں۔“  
تکلیف وہ سوچوں کے تھپڑے اس کے دھیان کو  
ادھر سے ادھر پھرتے اسے نڈھال کر رہے تھے اور آج  
ایک بار پھر وہ بالکل اکیلی، تنہا اندھیرے کمرے کی  
دیواروں سے لپٹی گریہ کنال تھی۔

\*\*\*

”میں نے تم سے کچھ کام کہا تھا۔“  
ان کے ڈیپارٹمنٹ اور اکاؤنٹس سیکشن میں بنے  
اس کے آفس میں کافی فاصلہ تھا۔ وہ خود چل کے وہاں  
آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ فرصت سے تفصیلی بات  
کرنے کے موڈ میں ہے۔

”بیٹھو۔“ تابندہ نے پین ٹیبل پر ڈال دیا۔  
”بولو اب۔“ وہ بیٹھنے کے بعد منظر نگاہوں سے  
اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نہیں کر سکی۔ سوری۔“  
تابندہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی۔ وہ چپ سا ہو گیا۔  
اسے اتنے دو ٹوک انکار کی امید نہیں تھی۔  
”وجہ بتا سکتی ہو۔“

”ہاں۔ پہلے تم ایک بات بتاؤ۔“  
”پوچھو۔“ وہ تابندہ کے انداز پر الجھ سا گیا۔  
”غانیہ! یہی کیوں۔ تمہارے لیے لڑکیوں کی کیا کمی  
ہے۔“

”میں اسے پسند کرتا ہوں۔“  
”کوئی وجہ بھی تو ہو۔“  
”میرے خیال میں ہم بہت سارے لوگوں کو بنے

وجہ بھی تو پسند کرتے ہیں۔ یا شاید، میں پسندیدگی لے  
اور اک پہلے ہو جاتا ہے، وجہ بعد میں پتا چلتی ہے۔“  
اس کا خیال تھا تابندہ اس کے جواب سے مطمئن  
ہو جائے گی۔ اور یہ خیال غلط بھی نہ تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ صرف پسند ہی کیوں۔  
زندگی میں بہت ساری باتوں کا علم ہمیں پہلے ہو جاتا  
ہے وجہ بعد میں پتا چلتی ہے۔“

”کیا بات ہے۔ اتنی اداس کیوں ہو؟“  
اس نے کھڑکی سے باہر پھیلی دھوپ پر نظریں  
جمائے۔ تابندہ کو غور سے دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہنسنے  
مسکرانے والی لڑکی تھی۔

”غانیہ! ناراض ہے مجھ سے۔ پچھلے کئی دن  
سے۔ آئی مس ہروری رنج۔“  
”اوہ!“ مرضی کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ”تم سے  
ناراضی۔ وجہ یقیناً خاص ہوگی۔“

”خاص تو ہے لیکن اتنی بڑی نہیں۔ میں نے بھی  
چند ایک سچائیوں کا ادراک دینے کی کوشش کی تھی  
اسے۔ کڑواہٹ نکل نہیں سکی۔ بدھضمی ہو گئی بے  
چاری کو۔“ وہ الجھا الجھا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ  
پر سوچ نظروں سے اپنے سامنے ٹیبل کی چکنی سطح کو۔

”انٹی ہاؤ۔“ سر جھٹک کر وہ حال میں واپس آئی۔  
”اگر سچے دل سے اسے پانا چاہتے ہو تو تھوڑا انتظار  
کرو۔“

”کس بات کا انتظار؟“  
”اس کے زندگی کی طرف لوٹنے کا۔ اس  
کا اضطراب بتاتا ہے کہ میری کوشش سست رفتار ہے  
بے اثر نہیں۔“

”مرضی کچھ سمجھا کچھ نہیں۔ لیکن زیادہ کرید نہیں  
کی۔ تابندہ نے اس کے ہاتھ میں امید کا سرا تھمایا تو  
تھا۔ اور وہ خود بھی ناامید نہیں ہونا چاہتا تھا۔“

\*\*\*

تابندہ سے ناراض ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔  
خاص طور پر اس صورت حال میں جبکہ اسے دن رات



اس کے ساتھ کی عادت بڑھ چکی تھی۔ لیکن اس کے باتیں اتنی تکلیف دہ تھیں کہ وہ کسی صورت اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔

”کتنی آسانی سے کہہ دیا۔ بھول جاؤ اسے وہ جھوٹا ہے۔ ساری زندگی جس شخص کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کیا اسے اتنی آسانی سے جھوٹا کیسے مان لوں۔ جس خواب کو اپنی آنکھوں کا لہو دے کر ساری زندگی سینچا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی ہم سفری میرا مقدر نہیں۔ اسے دل کے کسی کونے میں دفن کر دوں۔ اتنا آسان نہیں ہے تالی۔ تمہیں کیا پتا۔“

وہ دن میں متعدد بار اسے مخاطب کر کے اس سے باتیں کرتی رہتی۔ اوپر سے ناراضی کا مظاہرہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔

آفس میں بھی تابندہ سے سامنا ہونے پر بے نیازی سے اس کے سامنے سے گزر جاتی۔ لہجہ تو وہ کرتی ہی نہیں تھی، پتا نہیں تابندہ اکیلی ہی کرتی تھی یا مرتضیٰ کے ساتھ۔

اور یہ مرتضیٰ! وہ بھی تو تالی کے ساتھ اس کی سوچوں میں برابر کا حق دار بنتا جا رہا تھا۔ وہ جتنا سر جھٹکتی دھیان کی پتنگ اڑاڑ کے اسی سے پیچ لڑائے جاتی۔

وہ دل نہ لگنے کے باوجود پوری دیانت داری سے آفس کے کام نبھاتی۔ سوچ کے پرندے شرارت سے اڑ کر کبھی اس شلخ پر، تو کبھی اس شنی پر جھولتے رہتے۔

سیدھے سادے کام میں بھی غلطیاں نکل آتیں۔ کئی دن اس کے آفسرز نے انکو رکھا۔ لیکن کب تک ایک زبردست قسم کی جھاڑ اس کے حصے میں آئی۔ وہ کئی سال سے اس آفس میں نوکری کر رہی تھی۔ اور وقت کی باند اور سختی ایمپلائی کی حیثیت سے پہچانی جاتی تھی۔ لیکن کچھ دنوں سے اس قدر غیر حاضر دماغی کا ثبوت دینے لگی کہ سب کی نظروں میں آگئی اور اسے باس کے ہاتھوں بے عزتی کا مزہ چکھنا پڑا۔

وہ سرخ چہرہ اور غم آنکھیں لیے اندر سے برآمد ہوئی تو بیون ایک چٹ لیے کھڑا تھا۔

”تالی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آج آپ اس کے گھر جا کے مل لیجیے۔ اس نے آپ کو بلایا ہے۔“

بے حد مختصر سا پیغام تھا۔ بے عزتی کی کوفت کی جگہ، پیشانی پر تفکر کی لکیروں نے لے لی۔

”کمال ہے وہ آج آفس تک نہیں آئی اور مجھے ہی نہیں۔“ اس نے خود کو ملامت کی۔

اور جب وہ دل ہی دل میں اپنی بے خبری پر خود کو کوئی بار تار چکی تو پتا چلا کہ وہ تو تالی سے ذرا سی بھی خفا نہیں۔

”میں ضرور آؤں گی میری جان۔“ وہ مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔

\*\*\*

موسم میں قدرے خنکی کا سا احساس تھا۔ تابندہ سے ملنے کی خوشی اس کے گھر تک کے سفر کی تھکن کی سوچ پر غالب تھی۔

آسمان کے کناروں سے اٹھتی سرخی، سرمئی وسعتوں میں پھیلنا شروع ہوئی تھی۔ وہ تیز قدموں سے پارکنگ ایریا سے نکلتی باہر کی طرف جارہی تھی۔ جب کسی نے پیچھے سے پکارا۔

”میں بھی تالی کے پاس جا رہا ہوں، پلیز آپ میرے ساتھ چلیے۔“ اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔ بات ماننے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا، لیکن وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

”پلیز میں آرڈر دے رہا ہوں، آفر نہیں۔“ غانیہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

وہ اپنی بات مکمل کر کے رکھ نہیں تھا۔ پارکنگ میں سے گاڑی نکال کے لایا اور فرنٹ ڈور کھول دیا اس کے لیے وہ کچھ جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔

”میں بھی جب منزل ایک ہے تو الگ الگ راستوں پر کیوں چلیں۔ اور وہ بھی آسان چھوڑ کر دشوار راستے کا انتخاب۔“

”جی!“ آج اسے حیران کرنے کا دن تھا۔ گاڑی تابندہ کے گھر کے بجائے ایک سپر مارکیٹ میں رکی۔

”میں ایک منٹ میں آتا ہوں، ڈونٹ مائنڈ، بیٹے کا برتھ ڈے ہے تو اس کا گفٹ۔“

مرتضیٰ اتر کے جا چکا تھا۔ اسے یاد آیا آج اس کا بھی تو برتھ ڈے ہے۔

”کمال ہے، وقار جانے کہاں ہے صبح سے ایک میسج تک نہیں کیا۔ حالانکہ سب سے پہلے وہی وش کرتا ہے مجھے، پھر آج کیا ہوا؟“

نازش چار دن سے اپنی امی کے گھر ہے۔ تھی اور ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل میں کسی غیر معمولی احساس نے کروٹ لی۔

تھی بھی اس نے گاڑی کے وینڈ اسکرین سے بالکل سامنے وقار اور نازش کو ایک شاپ سے نکلتے دیکھا۔

ان دونوں کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھے۔ اس میں کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ بے شمار بار ایک دوسرے کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا چکے تھے۔ میاں بیوی تھے۔ اس میں عجیب کیا تھا۔ سین کچھ تو عجیب تھا۔ ہاں ان کا رویہ۔

وقار کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی۔ اور نازش کسی بات پر زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب تھا وہ کریڈل جو وقار نے اپنے دائیں ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

بے حد خوب صورت سفید رنگ اور گلابی پھولوں کے امتزاج سے بنا وہ بے بی کریڈل ہی۔ اس کی توجہ کامرکز تھا۔ اور وہ شاپ جس سے ابھی ابھی وہ لوگ باہر آئے تھے۔

نو مولود بچوں کے استعمال اور ضرورت کی اشیاء سے سجتی ہوئی تھی۔ غانیہ کو ان کی وہاں موجودگی کا سبب جاننے میں دیر نہیں لگی۔

”تو وقار! زندگی کی یہ واحد کمی بھی اب پوری ہونے جا رہی ہے۔“ او اسی کی ایک ہلکی سی لہر اسے چھو کے گزری۔

”تو یہ وجہ تھی نازش اور تمہاری اتنے دن اپنے سرال میں قیام کی۔“

اس نے سر جھٹک کے اپنے ہاتھوں کی خالی لکیوں

کو دیکھا۔

”خدا تمہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔“ آنکھوں میں اترتی نمی کو اس نے پلکیں جھپک کے دہلیز پر بانٹ لیا۔ اور مرتضیٰ کو آتے دیکھ کر یوں ہی بے خیالی میں مسکرا دی۔

مرتضیٰ کے لیے اس کی یہ مسکراہٹ بھی بہت تھی۔ وہ بھی جواباً ”مسکرا کے گاڑی ریورس کرنے لگا۔ سنجیدگی سے اپنے ہاتھوں پر جمائی نظریں اٹھا کے اس نے سامنے کسی شناسا کو کھوجا، وہاں اب کوئی نہیں تھا، اور دوبارہ سے نظریں ہاتھوں پر جمادیں۔

اس بات سے بے خبر کہ وہ چند لمحے پہلے کسی کی نظروں میں آچکی ہے۔

\*\*\*

تابندہ بخار میں تپ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بے تالی سے لپٹ گئی۔

”میں سمجھی تھی تم نہیں آؤ گی۔“

”اب اتنی بھی بے مروت نہیں ہوں۔“ اس کے لپٹنے پر شرما سی گئی۔ مرتضیٰ سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔ تابندہ کی امی اور چھوٹی بہن بہت محبت سے ملیں۔ وہ اسے ہمیشہ تالی کی طرح ہی اہمیت دیتی تھیں۔

”کتنی گرم ہو رہی ہو، لگتا ہے میڈیسن کے معاملے میں لاپرواہی برتی ہے۔“ وہ تفکر سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”میڈیسن ہی تمہیں نا، تم تو زندگی کے معاملے میں بھی۔“

”تابندہ پلیز! کیا مجھے اس لیے یہاں۔“ اس سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ دل بتا نہیں کیوں اچانک بھر آیا تھا۔

”آئی ایم سوری غانیہ پلیز! ریلیکس کیا ہوا۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے جلدی سے چہرہ پر ہاتھ پھیر کر اپنے آپ کو کمپوز کیا۔ وہ دونوں اس وقت تابندہ اور اس کی بہن کے مشترکہ کمرے میں بیٹھی تھیں۔



تابندہ کچھ لمحے اس کی طرف کھری نظروں سے دیکھتی رہی۔  
”تم! غانیہ نے کچھ کہنا چاہا، لیکن بات گلے میں اٹک گئی۔“

”ہاں بولو، کیا میں۔ میں بہت بد تمیز ہوں۔“ تابندہ بے تابی سے بولی۔

”نہیں۔“ اس نے گہرے گہرے سانس لیے، اعتراف شکست اتنا بھی آسان نہ تھا۔

”تم ٹھیک کہتی تھیں، میں خود فریبی میں جی رہی تھی اور مجھے اب اس کے حصار سے نکل آنا چاہیے۔“ وہ آگے پیچھے اندر آتے مرتضیٰ کے دونوں بچوں سے ہاتھ ملانے لگی۔

اس کی بات مکمل ہو چکی تھی اور تابی کا مقصد بھی۔ وہ مرتضیٰ کی بیٹی سے اس کا تعارف کروانے لگی۔

”موجود سے تو تم مل چکی ہو، یہ ہیں نبیہ مرتضیٰ۔“ وہ گلابی رنگت اور کرچی آنکھوں والی معصوم سی چار سالہ بچی تھی۔ غانیہ سراپے بنانہ رہ سکی۔

”یہ بالکل اپنی ماما ہے گئی ہے۔“  
”پھر تو ان کی ماما بہت پیاری ہوں گی۔“ اس نے

کہتے ہوئے بچی کے گلابی گال چھوئے۔  
”مرتضیٰ کہتا ہے۔ تم اس سے ملتی ہو۔“ تابندہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ غانیہ کتنی دیر اسے دیکھتی رہی۔

اس بات کا کیا مطلب تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔

”اچھو نیلی تم جو پریم لگاتی ہو، وہ بہت پوز کرتی ہے، ہو سکتا ہے اس وجہ سے میل ہوتا ہے۔“ تابندہ بے وجہ وضاحتیں دینے لگی۔

اس نے بیہ کو گود سے اتار کر باہر کی طرف قدم بڑھا لیے۔

تابندہ سمجھ نہیں سکی کہ جو وہ جتنا چاہ رہی تھی غانیہ نے محسوس کیا یا یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا۔ تابندہ تھکے تھکے انداز میں بستر پر لیٹ گئی۔

وہ بیمار تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے رہے

تھے۔ وہ فوری طور پر اس کے پیچھے نہیں جاسکتی تھی۔ کھانے کے وقت بھی بمشکل باہر آئی۔ اور باہر کا منظر دیکھ کر بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

غانیہ ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کے بیہ کے منہ میں ڈال رہی تھی اور وہ اسے اپنے اسکول کی جانے کون کون سی کہانیاں سن رہی تھی۔ غانیہ کے لبوں پر مسکراہٹ بھی اور انداز میں دلچسپی۔

تابندہ نے ایک امید کو بہت تیزی سے سبز ہوتے دیکھا۔ چلتے سے اس نے غانیہ کو بھی گفت دیا۔

”مجھے پتا ہے آج تمہارا بھی برتھ ڈے ہے۔ میں نے بہت دن پہلے سے لے کے رکھا ہوا تھا۔“

غانیہ کو اس کی محبت اور اس سربراہی نے خوش کر دیا۔

آتے وقت دل اداس تھا، لیکن تابندہ کے گھر سے نکلتے وقت دور دور تک اداسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ

ہنس رہی تھی، بول رہی تھی، مرتضیٰ کی نظروں سے چھینپ رہی تھی اور تابندہ اس کی بلا میں لے رہی تھی۔



وقار اسے فلیٹ کے سامنے ہی کھڑا ہوا مل گیا تھا۔ آج دیر بھی تو بہت ہو گئی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تابندہ بخار کی حالت میں بھی، اسے مرتضیٰ کے ساتھ گھر تک چھوڑنے آئی تھی۔ اس نے ان کو اوپر فلیٹ تک آنے سے منع کیا تھا۔

اسے پتا تھا وقار اس کا منتظر ہو گا۔ اگر اپنے گھر واپس آگیا تو۔

وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی تھی، لیکن اس کے تورا لگ تھے۔

”کہاں سے آ رہی ہو؟“

”میں آفس سے صرف تابندہ کے گھر ہی جاتی ہوں۔“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جتایا اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

”اندر آئیں، دیکھ کیا رہے ہیں؟“ اسے ہنوز وہیں

کھڑا دیکھ کے اسے تعجب ہوا۔  
”دیکھ رہا ہوں تم جھوٹ بولتے ہوئے کیسی لگتی ہو۔“ وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے پلٹی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔“

”اچھا تو وہاں مارکیٹ میں کس کی گاڑی میں بیٹھی تھیں، تابندہ کی گاڑی میں۔“ اس کا مشکوک لہجہ اسے

اندر تک کاٹ گیا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔  
”بولو، میں تو سمجھتا تھا کہ تابندہ کسی لڑکی کا نام ہے، مگر یہ تو۔“

”بس وقار، اب آگے ایک لفظ نہیں بولے گا۔“  
”کیوں نہیں بولوں گا؟ میں تو بولوں گا اور ضرور

بولوں گا، ایک غیر مرد کے ساتھ اس کی گاڑی میں، آفس ٹائم کے بعد کیا کر رہی تھیں تم، بتاؤ، یہ پوچھنا میرا حق ہے۔“

”نہیں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“ اس کا لہجہ برف ہو گیا۔ ”اور کس حق کی بات کر رہے ہیں آپ، کیا لگتے ہیں میرے بولیں۔“

”غانیہ!“ وقار کا منہ کھل گیا۔  
”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ کس نے دیا آپ کو یہ حق کہ آپ میرے روزمرہ معمولات کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے پھریں۔“

دو قدم آگے بڑھ کے اس کے مقابل آگئی۔  
”کیا رشتہ ہے آپ سے میرا۔ شوہر ہیں آپ میرے۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”یا بھائی ہیں۔“ وقار کے سر پر کسی نے ڈھیروں برف اندیل دی۔ اسے لگا اس کے وجود میں جیسے بھابھڑ جل اٹھے ہیں۔

”اور چلیں اگر میں مان بھی لوں کہ بچپن سے آج تک جس جھوٹی محبت کے کھوکھلے رشتے کو لفظ دوستی میں لپیٹ کر میں نے سنبھال سنبھال کے رکھا۔ وہ کہاں گیا اس وقت جب بیوی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مستقبل کی خوشیاں خریدنے آپ اسی مارکیٹ میں مڑ گشت کر رہے تھے۔“

وقار کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اور وہ زندگی میں پہلی بار وقار سے اس لہجے میں بات کر کے ہانپ کر گئی تھی۔

”میں نے تو نہیں پوچھا آپ سے، کیوں نہیں پوچھ میں نے، اس لیے نہیں کہ نازش اور آپ ایک دوسرے پر کوئی حق رکھتے ہیں، بلکہ اس لیے کیونکہ مجھے آپ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اب بھی بول رہی تھی۔ وقار پتھر کے بت کی مانند ساکت تھا۔

”اور جس قدر غلیظ باتیں آپ کی بیوی میرے بارے میں دن رات کرتی رہتی ہے۔ میری کردار کشی کرتی ہے اور جس طرح آپ منہ بند کر کے سنتے ہیں۔ محبت؟ دوستی؟ اعتبار؟ حق؟ مجھے تو لگتا ہے ہمارے بیچ انسانیت نام کا بھی کوئی رشتہ نہیں ہے وقار صاحب۔“

وقار پھٹی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پلٹنے کو تھی۔ جب اس نے دونوں بازوؤں سے تھام کے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”تم اس طرح اپنی غلطی کو لفاظی کے پردوں میں نہیں چھپا سکتی، غانیہ، مان لو کہ تمہاری نظر میں اب میری کوئی حیثیت نہیں رہی۔ کوئی مقام، کوئی اہمیت نہیں، میری تمہارے نزدیک، تمہاری محبت، تمہارا پیار سب ایک جھوٹ، ایک ڈھونگ تھا۔ ایک دکھاوا، تم دنیا والوں کی نظر میں صرف وفا کی دیوی بن کے سب سے شاباشی لینا چاہتی تھیں۔ بولو یہ سچ ہے کہ نہیں۔“

اس کی انگلیاں اس کے بازوؤں میں گڑ سی گئیں۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”چھوڑیں مجھے، کیا پاگل ہو گئے ہیں آپ۔“  
وہ دہشت زدہ ہو کے چلائی، اور اس سے پہلے کہ وقار کچھ اور کہتا اسے اپنے پیچھے نازش کی آواز آئی۔

”وقار!“ نازش بے یقینی سے انہیں گھور رہی تھی۔ دونوں اپنی جگہ پر تھم سے گئے۔ غانیہ خوف سے سفید پڑ گئی۔ اب تک جتنی بہادری وہ دکھا چکی تھی یہی اس کی فطرت کے بہت خلاف تھا۔ اور اب متوقع ذلت کا خوف ہر چیز پر حاوی ہو گیا تھا۔



نازش کچھ کہنے کے بجائے چپ چاپ واپس پلٹ گئی۔ وقار بھی اسے چھوڑ کر نازش کو پکارتا اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

غانیہ کچھ لمحے ساکت کھڑی بے یقینی سے دروازے کی سمت دیکھتی رہی۔ ایک طوفان جو اپنے ساتھ بہت کچھ ہمالے جاتا۔ معمولی سے نقصان پر پلٹ گیا تھا واپس۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر چاروں اطراف نظر ڈالی۔ پورے گھر پہ سناٹا چھا چکا تھا۔ خاموشی کسی اندھیرے کوٹے کھد رے سے نکل کر چاروں اور پھیل گئی تھی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ لیکن اب ایک ویرانی تھی جو گھر کی ہر شے سے ٹپک رہی تھی۔ درخت سے جھڑنے والے سوکھے پتوں کے چروں پر لکھی ویرانی۔ وہ درخت جو محبت کے قدیم شکست خورہ مرقد کے سرہانے لگا۔ اس کی بربادی پر ماتم کناں تھا۔

وہ بند دروازے سے ٹیک لگا کے سسک پڑی۔ کیا کچھ ان آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ دل سے نکل کے آنسوؤں میں پکھل کے، سسکیوں میں ڈھل کے۔ اس کا وجود جھلس رہا تھا۔ آنکھوں سے بہتے گرم سیال کی تپش سے۔ وقار کے الفاظ کی سختی اس کا دل پکھلا رہی تھی۔ لگتا تھا ساعتیں ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو گئی ہیں۔

”بس یہ سننا تھا وقار! یہی باقی رہ گیا تھا۔ تمہارے منہ سے اپنے کردار پر ایسے کھٹیا الزامات اور خلوص کے منہ پر اتنے ریک طمانچے میں کیسے برداشت کروں وقار! میری محبت کی آخری ہچکیوں کا بھی گلا دبا دیا تم نے۔ کسی قابل نہیں چھوڑا۔ زندگی بھر کے لیے میری محبت کو ایک نمائش ایک دکھاوا بنا کے رکھ دیا۔“ وہ قطرہ قطرہ پکھلتی رہی ذرہ ذرہ بکھرتی رہی، مگر وہاں اسے سمیٹنے سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں۔

\*\*\*

جلتی ہوئی آنکھوں کو دھیرے سے مسل کر اس نے

بمشکل کھول کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ بالکل سر پہ جلتا ہوا بلب کسی انگارے کی طرح دکھتا، تکلیف اور درد میں اضافے کا باعث لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں شدید جلن اور بھاری سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

فضا میں تیز نوکیلی آواز گونج رہی تھی۔ موبائل کی بیل سے سماعتوں کے پردے ہٹے جا رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کے دائیں دیکھنا چاہا، لیکن ناکام رہی پورے جسم میں درد کی شدید ٹپسیں تھیں۔

”شاید! شاید بخار ہے۔“ کانپتا ہوا ہاتھ اٹھا کے اس نے خود ہی پیشانی پہ رکھا۔ ایک سی حرارت ماتھے پر بھی ہاتھ میں تھی۔

جلن زدہ آنکھیں موندے اس نے ملنے کی کوشش ترک کر دی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا جسم حرکت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں ٹٹک کے زمین چھونے لگے۔

وہ صوفے پر سر رکھے زمین پر بیٹھی سو رہی تھی، جانے کتنی دیر گزری تھی دن ڈھل چکا تھا یا ابھی نکلا ہی نہیں تھا۔ وقت کا کوئی اندازہ تھا نہ حساب۔ آنکھیں موندے وہ رنگ برنگ دائروں میں قید، ساہو سفید بکولوں اور خوف ناک ہولوں سے ڈر کے بھاگتی رہی، کبھی کسی سائے کا پیچھا کرتی رہی۔

دور کہیں کوئی شناسا چہرہ اسے آواز دے رہا تھا۔ وہ اس تک پہنچنا چاہتی تھی، اسے آواز دینا چاہتی تھی، چھونا چاہتی تھی، لیکن وہ جھٹک دکھا کے اندھیروں میں چھپ جاتا تھا۔

بدقت تمام اس نے آنکھیں کھولیں، اور فوراً ہی چند ہیا کے بند کر لیں۔ موبائل پھرنج رہا تھا۔ پر شور آواز اعصاب جھنجھوڑ رہی تھی۔

اس نے تین چار بار آنکھوں کو مسلا۔ پھر سامنے نظر ڈالی۔ صوفے کے کٹن پر رکھے رکھے اس کی گردن بری طرح اکڑ چکی تھی۔

سر سیدھا کرتے ہوئے اس کی کراہ نکل گئی۔ اور ایک دم جیسے سب یاد آتا چلا گیا۔ اس نے سر دونوں

ہاتھوں سے ہام لرو میں جھٹے دیے۔ بیل پھر تھندا ہو چکا تھا۔

صوفے پر ہاتھ پر ہاتھ ٹکا کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی جسم شدید اینٹھن اور غبار کی لپیٹ میں تھا۔

”اے! اوہ!“ کانپتے قدموں پر مشکل کھڑے ہو کر اس نے موبائل کی تلاش میں نظریں دوڑائیں حلق میں کانٹے سے بڑے ہوئے تھے۔

وہ بیل کی تلاش ترک کر کے پانی پینے کے ارادے سے کمرے سے نکلی۔ تو کال بیل چیخ پڑی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ بیل پر ہاتھ رکھ کے ہٹانا بھول گیا تھا۔

ترتیب قدموں پر گھسکتی وہ دروازے تک آئی اور پوچھنے بغیر واکر دیا۔

”مر تفضی!“

بکھرے بال سرخ چہرے، سوچی آنکھوں میں بغیر دوپٹے کے وہ حال سے بے حال کھڑی تھی۔

”آپ! دیواریں دروازے چاروں سمت گھوم گئے۔“

اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کے سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ آنے والے نے ایک قدم آگے بڑھا کے تھام لیا۔ سر جھٹکتی سنبھلنے کی ناکام کوشش کرتی وہ شدید نقاہت کا شکار ہو کے مرتضیٰ کا بازو پکڑے وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

\*\*\*

”تالی! اتم ٹھیک ہو؟“

”ہاں کیوں کیا ہوا؟“ تابندہ کو اس کا لہجہ غیر معمولی لگا۔

”پانچ منٹ میں ریڈی ہو جاؤ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

”خیریت تو ہے۔ تم ہو کہاں۔ آفس میں نہیں ہو کیا۔“

”میں غانیہ کے فلیٹ پہ ہوں۔“

”واٹ!“ تابندہ نوٹرٹ لگا وہ نیٹھے سے ایک دم کھڑی ہو گئی۔

مرتضیٰ فون بند کر دیا۔ وہ اس وقت تفصیل بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

بیڈ روم سے تکیہ لاکے اس کے سر کے نیچے رکھا۔ دوپٹہ اس کے اوپر ڈالا۔ اور دروازہ باہر سے بند کر کے میزبانی سے میزبیاں اترتا گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

”اس کی سیلری تھی میرے پاس۔ میں نے سوچا خود جا کے دے آتا ہوں۔ یا اسے کال کر لیتا ہوں۔ ایو لپ لے کر میں وہاں گیا تو پتا چلا آج آفس نہیں آئیں۔ میں سیل ٹرائی کرتا رہا۔ صبح سے یہ ٹائم ہو گیا۔ کوئی اٹھا بھی نہیں رہا فون بزی بھی نہیں ہے۔ آف بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا بات ہے۔ جا کے پتا کروں۔“

وہ تابندہ کو اس کے فلیٹ پر لے جاتے ہوئے راستے میں بتاتا رہا۔ تابندہ اس کی لاپرواہی پر کڑھتی برابر میں بسنے والے رشتے داروں کو برا بھلا کہتی رہی۔

”برا بروا لے گھر میں نہیں تھے۔ تالا لگا ہوا تھا۔“

مرتضیٰ نے اسے بتایا۔

تابندہ اس کی حالت دیکھ کر سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ دہلیز سے ذرا آگے اس کا بے سدھ وجود شدید بخار میں تپ رہا تھا۔

”غانیہ! غانیہ! اٹھو یہاں سے۔“ اس نے اس کے رخسار تھپتھا کر، تیم غنوں کی میں اسے وہاں سے اٹھایا اور سنبھال کے بیڈ پہ لائی۔ مرتضیٰ ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ اس نے دو امین، انجکشن اور چند ضروری ہدایات دیں۔ وہ ڈاکٹر کے جانے تک وہاں رکھا۔ پھر تابندہ کو اس کا بہت خیال رکھنے کی تاکید کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اسے زیادہ دیر وہاں رکنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ گھر پہنچے بھی خطر تھے۔

\*\*\*

”مرتضیٰ!“ بے یقینی میں ڈوبی، کمزور نقاہت بھری



آوازوں بھر اس کا پیچھا کرتی۔ اسے تنگ کرتی۔ اور من مندر میں اس کی یاد کی گھنٹیاں بج اٹھتیں۔ ان لبوں سے اپنا نام سننے کی خواہش تو تھی لیکن اس طرح نہیں اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ اس کے گھر جائے گا اور وہ یوں دروازے پر بیماری کے ہاتھوں بکھری بے حال چکراتی ملے گی۔ اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا لمس وہ ابھی بھی محسوس کرتا تھا۔ اور کئی بار دو سرا ہاتھ پھیر کے دیکھ چکا تھا۔ تابندہ اسے اس کے ماضی کے بارے میں کافی کچھ بتا چکی تھی۔ اسے غانیہ سے محبت تو تھی۔ پر یہ جذبہ محبت و انسیت میں کب بدل گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ جانتا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنے سے انکار کر چکی ہے مگر اسے یقین تھا اس کا یہ انتظار انتظار لا حاصل نہیں رہے گا۔ وہ ایک نہ ایک دن اپنے جذبات کو اس سے منوا ہی لے گا۔

اب انتظار تھا تو بس اس دن کا جب وہ اپنے ماضی کی تلخیوں سے پیچھا چھڑا کے اس کا ہاتھ تھام لے گی۔ اور وہ جانتا تھا۔ ماضی کو بھول کر مستقبل کی طرف قدم بڑھانا اتنا بھی آسان نہیں خاص طور پر جب ماضی سے جڑی یادیں خوبصورت بھی ہوں اور گڑبی بھی۔ کسی کا سراپا چہم سے نگاہوں میں اتر آیا۔ اور ایک نم مسکراہٹ لبوں پہ بکھر گئی۔ ساتھ ہی اس پاس وہی مانوس خوشبو۔

تیری یادیں کسی مفلس کی پونجی ہیں  
جنہیں ہم پاس رکھتے ہیں  
جنہیں محفوظ رکھتے ہیں  
جنہیں سب سے چھپاتے ہیں  
جنہیں ہم روز گنتے ہیں

\*\*\*

تیسرے دن صبح اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ تابندہ رات میں اس کے پاس رکی۔ مرتضیٰ نے اس کے گھر پہ انفارم کر دیا تھا۔

”کیا ہوا تھا۔ پرسوں رات میں۔“ تابندہ کے سوالات کے جواب دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اور اسے بھلانا بھی آسان نہ تھا۔ ضبط کے وعدے، آنسوؤں کے بند اور برداشت کے ارادے سب بھر بھری ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ وہ تابندہ کے سامنے پرت پرت دل کے اوراق پڑھتی چلی گئی۔

بچپن سے سنبھال کر رکھا گیا ایک وعدہ راتوں کی نیندیں حرام کر کے سینچا گیا ایک خواب اور کبھی نہ ملنے کے یقین کے باوجود عذاب تنہائی میں خوش خیال منظر سجاتی تعبیر۔ وقار کی باتیں اس کے انداز اس کی ازواجی زندگی میں گھلنے والی تلخیوں کی وجوہات اور ابھی تازہ بہ تازہ ملنے والی خوش خبری اور وقار کے بدلتے تیور۔

تابندہ محل کے ساتھ سب سنتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ تھک کے چپ ہو گئی۔ تابندہ صرف اس کا ہاتھ تھپتھپا کے رہ گئی۔ ساری بات سننے کے بعد اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اور اس کے خیال میں ضرورت بھی نہیں تھی۔ غانیہ کو عقل آرہی تھی یہی بہت تھا وہ مزید کچھ اور کہہ کر اس کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کے خیال میں سب سے بہترین سبق وہ ہوتا ہے جو ہم خود جوٹ کھا کے حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں اور مشاہدوں سے انسان سیکھتا ضرور ہے۔ لیکن جو بات خود تکلیف سہہ کر سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کوئی دوسرا نہیں سمجھا سکتا اور شاید انسان سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔ رخ حقیقت سے فرار کا ایک راستہ خود فریبی کے پرستان سے بھی جا کے ملتا ہے۔ انسان ساری زندگی محض چند خوش گمان خواب بن کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ زندگی گزارنے کا طریقہ نہیں۔ زندگی بھگتانے کا انداز ہے۔

اور زندگی بسر حال اتنی گئی گزری نہیں کہ اس بیش بہا نعمت کو یوں ضائع کیا جائے۔ چار دن کی چھٹی کے بعد تابندہ نے آفس میں قدم

رکھا تو تقریباً ہر کوئی اس کی اور غانیہ کی خیریت معلوم کرنے آتا رہا۔ بعض کے نزدیک ان دونوں کا ساتھ بیمار پڑنا بھی گہری دوستی کی نشانی تھا۔ وہ ہنستی رہی۔ اتنی محبتوں پر سب کی شکر گزار بھی ہوتی رہی اور ممنون بھی۔

لچ ٹائم میں ہمیشہ کی طرح مرتضیٰ کے ساتھ بیٹھ کر اس نے لچ کیا۔ مرتضیٰ اس کی شکل دیکھتا رہا۔ وہ اس پر پھبتیاں کستی رہی۔ اور آخر میں یہ خوش خبری سنائی اٹھ گئی۔

”انتظار کی گھڑیاں اختتام پذیر ہونے کو ہیں۔ غانیہ کل سے آفس آنے لگے گی اور تمہیں بہت جلد اپنے پریونل کا مثبت جواب مل جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ مرتضیٰ کے دل سے دعا نکلی تھی۔

\*\*\*

رہنگ پیپر میں لپٹا گفٹ ابھی تک جوں کا توں پڑا تھا۔ اسے کل سے آفس جوائن کرنا تھا اور وہ صبح کی تیاری کر رہی تھی جب اس کی نظر پڑی۔ گرام گرم چائے کا مک لے کر وہ اسے کھولنے بیٹھی ہی تھی۔ جب کال بیل بڑا اٹھنا پڑا۔

”اس وقت کون آسکتا ہے؟“ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ دروازے پر وقار کھڑا تھا۔ وہ وہیں ٹھہم گئی۔ نظریں اس کے بے حال چلے پر جمی تھیں اور لبوں نے بے آواز اس کا نام پکارا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، مسلا ہوا لباس بے ترتیب بکھرے بال۔

اس نے خاموشی سے ایک طرف ہو کے راستہ دیا اور معمول کی طرح چلتا ہوا اندر آگیا۔ وہ کمرے میں گئی اور بنا کچھ کے اپنا چائے کا کپ لاکے میکانیکی انداز میں اس کی طرف بڑھا دیا۔

”بہت دل چاہ رہا تھا۔ بہت طلب ہو رہی تھی چائے کی۔“ اس کے خشک لبوں پر پھلکی مسکراہٹ آئی اور چلی گئی۔

”میں تو آپ کی ہر ضرورت بنا کے ہی جان لیتی

ہوں۔“ الفاظ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے۔

”تو پھر! اب بھی جان لو نا۔“ وہ مک رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ تھام لیے۔

وہ زخمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ان خوبصورت آنکھوں کے سامنے زندگی کے بہت سے دور گزرے تھے۔

کبھی وہ ان آنکھوں میں جھانک تک نہیں سکتی تھی۔ کبھی ان میں ایک نظروں دیکھ کر پلکیں جھپک لیتی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب ان سے نظریں چرائی پڑیں۔

اور آج وہ ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

بنا پلکیں جھپکائے۔ بغیر کسی ڈر خوف، شرم کے۔ آج اسے یہ آنکھیں بالکل معمولی سی دکھ رہی تھیں۔ جو کبھی زمانے بھر سے زیادہ اہم تھیں اس کے لیے کیونکہ اب اس کی اپنی آنکھوں میں ان کے لیے کوئی خواب نہیں رہا تھا، کوئی خواہش نہیں تھی، کوئی تشنگی، کوئی رنگ، کوئی ماضی کی میٹھی یاد، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں خالی تھیں۔

اور جب وہ بولی تو لہجہ اس سے بھی زیادہ خالی اور سپاٹ تھا۔

”میں نے آپ کو معاف کیا۔“

”غانیہ!“ وقار کے دل میں دور تک اس کے خالی لہجے کا سناٹا بولنے لگا۔

”اب آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں ذرا کی ذرا نمی چمکی اور اس نے رخ پھیر لیا۔

”ایک۔ ایک کام کرو میرا۔ آخری“

اس نے جواب نہیں دیا۔ رخ پھیرے کھڑی رہی۔ لیکن وقار کو اس سے انکار سننے کی عادت تھی ہی نہیں۔

”نازش ناراض ہو گئی ہے۔ وہ گھر آنے کو تیار نہیں۔ اس کے دل میں میرے لیے بہت سے شکوک



بھر گئے ہیں۔ تم تم اسے منالو۔

”میں؟“ وہ حیرت سے پٹی۔

”میں کیسے مناسکتی ہوں اسے۔ وہ تو میری شکل بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہوگی۔“

”کچھ بھی کر کے غانیہ! پلیز۔ وہ بہت سنگدل ہے۔ خدا نے اتنے عرصے بعد میری دعا میں سنی ہیں۔ اس کا کچھ بھروسہ نہیں۔ وہ مجھے اس خوشی سے محروم بھی کر سکتی ہے۔“ وقار کا لہجہ بہت عاجزانہ تھا۔

”کوئی ماں اتنی سنگدل نہیں ہوتی کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی کوکھ اجاڑ دے۔“ اس نے سوچا ضرور مگر کہا تو صرف اتنا کہ ”میں کوشش کروں گی۔“

”میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“ جاتے جاتے وہ رک کر بولا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ”گویا باقی سب بھلا دیا تم نے۔ افسوس بہت جلدی کی۔“

وہ کتنی دیر اس کے پیچھے خالی دروازے اور ہلے ہوئے پردے دیکھتی افسردگی سے سوچتی رہی۔

”زندگی کی راہ گزر ہر جگہ تمہارے قدموں کے نشانوں پر قدم جما کے چلنا، کبھی منزل تک پہنچنے کا یقین دلاتا تھا۔ تمہیں بتاتا تھا۔ میں آرہی ہوں تمہارے پیچھے تمہارے نقش پا دیکھتی اپنے کھوجانے کا ڈر کہیں بہت پیچھے چھوڑ کر پرتم نے کیا کیا۔ تم خود تو آگے چلے ہی گئے لیکن اپنے پیچھے اپنے نشان بھی مٹا ڈالے۔ اب باقی کا سفر میں کس سہارے طے کروں گی۔ کوئی زاو راہ نہیں، کوئی سنگ میل نہیں اور تمہیں کوئی فکر بھی نہیں۔ تمہارے پاس منزل بھی ہے اور ہم سفر بھی۔ گویا ایک باب زندگی تمام ہوا۔“

گہری سانس بھر کے اس نے گفٹ بیک پر سے ریپر اتارا۔ اندر دو گفٹ تھے اور دونوں ہی بزبان خود دینے والے کا تعارف تھے۔

ایک خوبصورت برسلیٹ جو یقیناً ”تابندہ کی طرف سے تھا۔“

اور دوسرا۔ گلابی رنگ کی کلنچ کی بوتل اور مخصوص خوشبو۔ ”پلی گینس۔ (پاکیزگی)۔“

لیوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی کسی کا خیال پوری شدت سے ذہن و دل پر حاوی ہو گیا۔

\*\*\*

فراز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں لب و ذہن بھی ملا گفتگو کا فن بھی ملا مگر جو دل سے گزرتی ہے کہہ سکوں بھی نہیں میری زبان کی لکنت سے بدگمان نہ ہو جو تو کہے تو تجھے عمر بھر ملوں بھی نہیں وہ کافی دیر سے ٹیبل کی چکنی سطح پر سر جھکائے نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ بہت ہمت کر کے یہاں تک آتو گئی تھی لیکن بات کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔ مرتضیٰ بہت صبر سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا۔ چھوٹے چھوٹے کام نبٹاتا فون کا لڑائینڈ کرتا رہا۔

وہ سمجھ رہا تھا۔ سمجھتا تھا۔ اسے اپنی کہنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ لیکن اتنی دیر سے وہ جس ہمت کو مجتمع کرنے کی کوشش میں تھی۔ وہ اس کوشش میں دھن اندازی کر کے اسے ناکام نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس نے گلا کھنکھار کے سر اٹھایا۔

”وہ۔“ وہ ایک بار پھر رکی۔

”وہ اس دن جب آپ کمر آئے تھے تو۔“ اس نے تھوک نگلا۔ مرتضیٰ اسے دیکھا رہا۔ اسے دیکھنا اچھا لگتا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ہم اس کے علاوہ کوئی اور بات کریں۔“ اس نے نرمی سے اسے اس دن کی شرمندگی سے نکالا۔

وہ خود بھی ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ایک گہرا سانس لے کر خود کو کسی نا دیدہ بوجھ سے نکالا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کافی منگواؤں۔ آج تو پی لیں گی۔“ اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے پھر سر ہلا دیا۔ مرتضیٰ نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری۔

”شادی کریں گی مجھ سے۔“ اس نے جس قدر روانی سے پوچھا تھا۔ وہ اسی روانی سے سر ہلاتی گئی۔ پھر ایک نظر اسے دیکھا۔

”جی۔“ مرتضیٰ کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔

”سر ہل رہا تھا آپ کا۔ آج کسی بات پر نا نہیں ہوئی۔“ اس نے کہتے ہوئے سر کو دائیں بائیں گھمایا۔ ”میں نے سوچا موقع اچھا ہے۔ یہ بھی پوچھ لوں۔ جو اب مل گیا ہے۔ اب مکرمت جائیے گا۔“

وہ مزے سے بول رہا تھا۔ غانیہ کو بھی دھیرے سے ہنسی آگئی۔

اس کی بہت سی باتیں ماہم سے بہت ملتی تھیں۔ آغاز سفر میں ہی پچھڑ جانے والی من پسند ریفیقہ حیات، ہیڈم اور آج پتا چلا اس کی ہنسی بھی بالکل ماہم جیسی تھی۔ مدھم، نرم پھوار جیسی۔ مرتضیٰ ایک جذب کے عالم میں اسے دیکھ گیا۔

غانیہ کی نظر بڑی تو ایک دم جھینپ گئی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اب اپنی بات سے پھرؤ گی تو نہیں۔“ اس نے دھیمی آواز میں اسے چھیڑا۔ انداز مخاطب میں استحقاق در آیا تھا۔

غانیہ نے بہت دھیرے سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

\*\*\*

اپنے قدموں پر ایک آخری نگاہ ڈال کے اس نے چند جملوں کو دل میں دہرایا اور کال نیل پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ کھولنے والی بسما تھی۔

”غانیہ تم۔“ وہ بے حد محبت سے گلے ملی۔ اسے حیرت تھی کہ بسما اسے دیکھ کر اتنی خوش کیسے ہے۔

”کیا بتاؤں یہاں آ کے بیٹھ گئی ہے۔ وقار بھائی معافیاں مانگ مانگ کے تھک چکے ہیں۔ اچھا ہوا۔ تم آگئیں۔ تم ہی بتاؤ کیا ہوا تھا اس دن۔“

اس کی گرم جوشی کی وجہ اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی اس نے گہری سانس لے کر پرس میں سے کارڈ نکالا۔

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

## حمران ڈائجسٹ

جولائی 2012ء کے شمارے کی جھلک

تین سلسلے دار تحریریں

اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ معروف مصنف اسلم راہی کے قلم سے

وہ دیوتاؤں اور دیویوں جیسے حسن کی مالک تھی۔ اس کو ناجانے کون کون سی شکستیاں حاصل تھیں۔ غزالہ جلیل راؤ کی تہلکہ خیز سلسلہ دار تحریر

سرزمین پنجاب کی حسین وادی جہلم کا ایک سادہ لوح جوان جو دشمن کے لیے ناقابل تسخیر فولاد بن گیا۔ ایم اے راحت کے قلم سے

اس کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ”برائے انصاف“ ایم الیاس کی ”زخمی شیرنی“ صفدر شاہین کی ”ہولناک ایڈوچر“ محمد مقصود خان کی ”حسب الحکم“ حسن علی خان کی ”ہم ذوق“ وقار بن سعید کی ”آمد و شد“ دانش کمال کی ”تشنہ جاں“ محمد صدیق طاہر کی ”مریض کا قتل“ صابر علی ہاشمی کی ”بیکار مباحش“ اردو ادب سے انتخاب میں شوکت صدیقی کی ”خان بہادر“ ابراہیم جلیس کی ”کالے چور کے نام“ رام لعل کی ”پہلا آدمی“ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ”یا گل نہ ہو جاؤں“ نوازش شاہین کی ”داغ دار“ محمد سلیم اختر کی ”شاہو“ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کے قلم سے معاشرتی ناول ”زرگزشت“

آج ہی قریبی بکسٹال سے تازہ شمارہ حاصل کریں









بیٹا جی۔۔۔ ”مدثر نے چیلنجنگ انداز میں منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور کرسی پیچھے دھکیل کر غصے سے کیفے ٹیریا سے نکل گیا۔“

”جانے۔۔۔“ مجھے پتا ہی نہیں آج صبح نوٹس بورڈ پر اسپیشل وارننگ تھی کہ کوئی لڑکا گرلز کالج کے قریب نظر نہ آئے بصورت دیگر بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔“ ضیا اسعدی نے مسکراتے ہوئے کہا اور بک دوبارہ کھول لی تھی۔

”اف اللہ انیلا جتنی تیاری تم نے میم حیرا کی برتھ ڈے پر آنے کے لیے کی ہے اگر اس کا دس فیصد بھی ان کے مضمون کو وقت دے دو تو تمہیں سپر ز میں دوسروں سے مدد کی ضرورت نہ پڑے۔“ بریرہ نے انیلا کو زرق برق کپڑے اور میچنگ جیولری اور تیز میک اپ کیے ہوئے دیکھ کر تنقیدی لہجے میں کہا۔ جسے انیلا نے ہمیشہ کی طرح درخور اعتناء نہیں جانا تھا۔

”یار کتنی فضول بات کی تم نے۔۔۔ یہ تیاری تو ایک دن کے لیے کرنی تھی سو دل لگا کر تیار ہوئی اور مضمون پر توجہ تو روزانہ کا کام ہے اور میں وقت سے پہلے اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتی۔ یونہی کہ دماغ پر بوجھ ہو تو اس کا اثر ڈائریکٹ دل پر ہوتا ہے اور میرا دل تو پہلے ہی کمزور سا ہے۔“ انیلا کے لہجے اور آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

”ویسے تم ذہن پر بوجھ تو نہیں ڈالتی لیکن ایک مزے کی بات بتاؤں تمہیں کہ ابھی تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے ایک اناؤنس منٹ ہوئی ہے۔“

”یار اسعدی اب مان بھی جا۔۔۔ اتنی منتیں اگر میں واپس والوں کی کروں تو وہ لوڈ شیڈنگ کرنا ختم کر دیں۔“ مدثر نے جھنجھلاتے ہوئے اسعدی کے ہاتھ سے بک لیتے ہوئے کہا وہ لوگ اس وقت یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے اور پچھلے آدھے گھنٹے سے مدثر، ضیا اسعدی سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گرلز کمپس میں جائے کیونکہ وہاں کے ایک لیکچرار اسعد کے والد کے دوست تھے اور وہ کبھی کبھار ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔

آج مدثر کا وہاں جانے کو اس لیے بھی دل چل رہا تھا کیونکہ آج وہاں کی ایک سینئر پیپر کی برتھ ڈے پارٹی لڑکیوں نے ارتج کی تھی اور صبح سے ہی وہاں سے میوزک اور ہلے گلے کی کافی آوازیں آرہی تھیں اور سدا کا حسن پرست اور دل پھینک مدثر کا دل بھی آج قدرت کی رعنائیوں اور ہوشیار حسن کو سامنے دیکھ کر داد تحسین دینے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن جس بہانے سے وہ وہاں جا سکتا تھا ضیا اسعدی پروں پہ پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔

”دیکھ مدثر اگر روٹین کا دن ہوتا تو میں تمہیں ساتھ لے کر وہاں جا سکتا لیکن آج جو ہلا گلا اور انجوائے منٹ وہاں ہو رہی ہے میں منہ اٹھا کر وہاں نہیں جا سکتا۔ اس لیے میری منتیں کرنے کے بجائے کوئی اور راہ نکالو۔“ ضیا اسعدی نے مدثر کو صاف ہری جھنڈی دکھاتے ہوئے کہا۔

”ہونہ۔۔۔ اب تو میں تجھے اکیلا وہاں جا کر دکھاؤں گا“



بریرہ نے برتختس لہجہ بتاتے ہوئے کہا۔  
”اناؤنس منٹ۔۔۔ کیسی اناؤنس منٹ۔“

”صبح مجھے سیماب سے بھی اس کا پتا چلا تھا لیکن میں مذاق سمجھ رہی تھی لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے میم اسماء نے آکر وارننگ بھرے انداز میں تمام گرلز سے کہا تو مجھے یقین ہو گیا کہ خبر واقعی ہی سچی تھی۔“ بریرہ انیلا کے تجتس کو مزید ہوا دے رہی تھی۔

”اب آگے بکو۔۔۔ میم اسماء نے کہا کیا ہے؟“ انیلا نے جب دیکھا کہ بریرہ اصل بات کی طرف نہیں آ رہی تو جھنجھلا گئی۔

”اوسے ہوا اتنی جلدی کیا ہے۔ بس ایک تنبیہ کی گئی ہے کہ چونکہ گرلز اور بوائز کا گراؤنڈ مشترکہ ہے اور کیمپس بھی کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں اس لیے لڑکیاں جو اتنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئی ہوئی ہیں اپنے کیمپس تک ہی محدود رہیں اور گراؤنڈ میں چل قدمی آج منسوخ کر دیں ورنہ میم رخشندہ کے عتاب کی مستحق قرار پائی جائیں گی۔“ بریرہ نے آخر کار تمام

تفصیل سے انیلا کو آگاہ کر دیا تھا جس کا منہ ایسا بنا تھا بس کڑوے کر لیے منہ میں ڈال لیے ہوں۔

”دفع دور۔۔۔ تو کیا ہم نے اتنی تیاریاں ان داوی تانیوں کی عمر کی لیکچرارز کو یا پھر مالی بابا کو دکھانے کے لیے کی تھیں۔“ انیلا نے شک کی کیفیت سے نکلتے ہی عصلے لہجے میں کہا۔

”مانڈاٹ ڈیر۔۔۔ ہم نہیں تم یا تمہارے قبیلے کی دوسری لڑکیاں ویسے مالی بابا بھی اپنے نام کی طرح ہر ایک پر فدا ہو جاتا ہے۔“ بریرہ نے ہنستے ہوئے مالی بابا کا نام قد خان کوٹا گٹ کیا۔

”ویسے بھی دل ہوندا چائی دا جوان عمراں جے کی رکھائے اے (دل جوان ہونا چاہیے عمروں میں کیا رکھا ہے) اور وہ کیا مشہور گانا ہے نا۔۔۔ جو مالی بابا گارہے ہوتے ہیں۔“

”ابھی تو میں جوان ہوں۔۔۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔“ بریرہ انیلا کے منہ کو دیکھ کر مزید دل جلائے والی باتیں کر رہی تھیں کہ ماریہ وغیرہ کلاس روم

میں داخل ہوئیں۔

”ہائے گرلز۔۔۔“ ماریہ نے اپنے شولڈر کٹ بالوں کو اواسے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”واقعی آج تم گرلز کے منہ سے ہائے ہائے ہی نکل رہی ہے۔“ بریرہ نے ماریہ کے ہائے کے جواب میں پنجابی لہجے میں ہائے بول کر کہا۔

”تمہاری بہت ہنسی نکل رہی ہے مولانی صاحبہ۔۔۔“ انیلا نے مسلسل بریرہ کو ہنستے اور بولتے دیکھ کر دانت پیس کر کہا۔

”ہوا کیا ہے۔۔۔ آخر ہمیں بھی تو پتا چلے؟“ ناویہ کے گروپ کی ایک اور تیز طرار لڑکی رینا نے حیرت سے انیلا اور بریرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہونا کیا تھا اور ہو گیا گیا ساری بات ہی یہی ہے۔“ بریرہ آج واقعی ہی فل فارم میں تھی۔

”لگتا ہے آج بریرہ بہت خوش ہے ویسے خوش ہونا بھی بنتا ہے کیونکہ آخر اس کی پسندیدہ ٹیچر اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہی ہیں۔“ ماریہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اللہ کا نام لو ماریہ۔۔۔ مس حمیرا شکل سے 25 سال سے بھی کم کی لگتی ہیں۔“ انیلا نے صاف گوئی سے کہا۔

”شکل سے نا، عمر سے تو نہیں۔۔۔“ ماریہ نے لقمہ دیا تھا اور اس کے گروپ کا مشترکہ تہقہہ گونجا تھا۔

”جو بات میں تمہیں بتانے لگی ہوں۔ دیکھنا وہ سنتے ہی کیسے منہ پر نحوست اودھ۔ میرا مطلب ہے او اس بلبلیوں کی طرح بیٹھ جاؤ گی۔“ انیلا نے ان کو ہنستے دیکھ کر کہا اور پھر انتہائی غمناک لہجے میں اناؤنس منٹ کے متعلق بتانے لگی۔ جس کو سنتے ہی ماریہ اور اس کی فرینڈز کے منہ ویسے ہی بن گئے جسے کچھ دیر پہلے انیلا کا اپنا تھا۔ جبکہ بریرہ نے افسوس بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔



”اب بس بھی کریا رمد بڑ۔۔۔ پچھلے ایک گھنٹہ سے

تمہیں منا رہا ہوں اور تو ہے کہ پھیلتا ہی جا رہا ہے۔“ ضیا اسعدی نے جھنجھلا کے مدثر کے ہاتھ سے کتاب کھینچی۔ وہ لوگ اس وقت یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں بیٹھے تھے اور مدثر جو کل ہر ممکن کوشش کے باوجود گرلز کیمپس میں نہ جاسکا تھا۔ اپنی ناکامی کا اور اتنے بڑے موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا ذمہ دار اسعدی کو سمجھ رہا تھا۔ اس لیے ضیا اسعدی کی منتوں اور وضاحتوں کو سن کر بھی ان سنی کر رہا تھا۔

”میں نے تجھے کہا ہے منانے کے لیے؟ ارے جابار ایک دوست کے لیے تمہیں منٹ نہیں نکال سکے یہ سامنے کیمپس تھا بس جانا اور آنا تھا۔“ مدثر نے پہلے غصے اور پھر گرلز کیمپس کی طرف دیکھ کھنڈی آہ بھری۔ یہ اور بات کہ اسعدی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی وہ ہنسا اس لیے تھا کہ نارمل رویں میں گرلز بوائز مشترکہ گراؤنڈ استعمال کرتے تھے جب کہ اس وقت

”مدثر ایک بات سچ سچ بتاؤ۔۔۔“ اسعدی نے یکدم

سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا جبکہ مدثر جو حسرت بھری نظروں سے کیمپس کی طرف سے آنے والی گرلز دیکھ رہا تھا۔ یکدم اپنی نگاہیں اسعدی کی طرف استفہامیہ انداز میں کیں وہ اسعدی کی سنجیدگی پر حیران ہوا تھا۔

”تمہارے نزدیک زندگی کا مقصد کیا ہے؟“ ضیا اسعدی نے اس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے نزدیک زندگی کھیل کود اور انجوائے کرنے کا نام ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اسے الجھنوں مگناہ ثواب کے چکر میں الجھ کر برباد نہیں کرنا چاہیے۔“ مدثر نے آخر میں آنکھ مارتے ہوئے اسعدی کو جواب دیا۔

”بہت افسوس ہوا مدثر! تمہاری سطحی سوچ کو سن کے۔“ ضیا اسعدی نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے ویسے بھی سطح پر نظر آنے والی چیز کی ہی اہمیت ہوتی ہے۔ جو ڈوب جائے اسے کون دیکھتا ہے۔ اسی طرح سطحی سوچ ہی کامیابی کا پہلا زینہ ہے اور۔“ مدثر نے مزید بے تکلف جھارٹا

چاہا۔ وہ اسعدی کی بات کو مذاق کے پیرائے میں لے رہا تھا۔

”بس بس۔۔۔ تجھے سمجھانا یا کچھ عقل کی بات کی توقع رکھنا عبث ہے۔“ ضیا اسعدی نے خفگی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور بکس اٹھا کر کلاس کی طرف جانے لگا۔

”ارے سن تو یار۔۔۔ کیا ہر وقت مولانا اسعدی بنا رہتا ہے۔ زندگی کو جینا سیکھو۔۔۔ اللہ نے یہ رنگ یہ رعنائیاں ہم جیسوں کے لیے ہی تو بنائی ہیں۔“ مدثر نے اسعدی کو یوں ناراض ہو کر جاتے دیکھ کر پیچھے سے ہانک لگائی۔ مگر اسعدی نے پیچھے مڑ کر دیکھنا تھا نہ دیکھا۔

”ہائے ری قسمت۔ مجھے بھی کس پاگل۔۔۔ اودھ نہیں نہیں۔۔۔ کس بے وقوف نے مشورہ دیا تھا کہ ایک ہی دوست بنانا ہے اور وہ بھی مولویوں کے خاندان سے۔“ مدثر جو بے دھیانی میں تشبیہ دینے لگا تھا ایک دم اپنے سر پر چپٹ لگاتے ہوئے کہا اور کتابیں اکٹھی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

مسٹر

رخسانہ نگار عدنان

قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمر

ڈائجسٹ



بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- ✽ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✽ بے بال آگاتا ہے
- ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- ✽ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✽ یکساں مفید
- ✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھیج کر جسر ڈپارٹمنٹ سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے مئی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اروہ بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

ہونے پہ چوٹ کی تھی انیلا منہ کھولے اس کی جانب پہنچے ہوئے کچھ نہ بولی تو مجبوراً اسے دوبارہ مخاطب کر رہا۔

”کیا۔ آپ کے قیمتی لمحات میں سے چند لمحے متعارف لے سکتا ہوں جب تک آپ کی شاہی سواری میرا مطلب ہے پوائنٹ نہیں آجاتا۔“ مدثر نے دوبارہ ہیٹ بن کا مظاہرہ کرتے ہوئے درباری انداز میں جھک کر کہا تو انیلا اس کے طرز تخاطب پر بے ساختہ مسکرائی۔

”مستر آپ ہیں کون۔۔۔ یونین کونسل کے ممبر بھی نہیں۔ ہاں بکس اور حلیہ دیکھ کر لگ رہا ہے کہ یونیورسٹی کے چشم و چراغ ہیں مگر آپ کو تو کبھی پہلے نہیں دیکھا پھر بات کرنے کی وجہ؟ جبکہ آپ کو تو بھی غیر انصافی سرگرمیوں میں بھی کبھی منظر عام پر نہیں آئے۔“ انیلا نے بھی بڑے ٹھٹھے انداز میں مدثر کو ہری جھنڈی دکھائی۔

”اچھا جی۔۔۔ اگر یہ بات ہے تو یونیورسٹی کے باہر تو بات ہو سکتی ہے نا اور بات کے بعد پہچان بھی کیونکہ میں بھی آپ جیسے ہی خواب اور خیالات کے ساتھ اس یونیورسٹی میں آیا تھا مگر کنبے اور خشک مزاج پردیسوں کو دیکھ کر اور سن سن کر دل اوب گیا ہے۔ زندگی میں کچھ رنگینی کچھ تبدیلی کا خواہاں ہوں اور یقیناً مانع دوست بھی آپ کی گریلا دوست کی طرح ملا۔ جسے کسی مسجد میں مولوی ہونا چاہیے تھا۔ مگر غلطی سے یونیورسٹی میں آگیا۔“

مدثر نے انتہائی درد بھرے انداز میں اپنی حالت زار کی تصویر کشی کی کہ انیلا کو ہنسی آگئی۔

”ارے واہ۔۔۔ آپ تو ہنستی بھی ہیں اور کیا خوب ہنستی ہیں جیسے کسی خوب صورت دادی میں کوئی جھرنہ بہتا ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے جو سننے والے کو مسحور کر دیتی ہے اور اور۔۔۔“ مدثر نے ایک دفعہ ہی جال پھینکے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی بات سن کر انیلا کے دماغ میں جھماکا ہوا یہ صبح والا لڑکا تھا جو اس کی اور بریرہ کی بحث میں بے ساختہ ہنسنا تھا۔

وہ ٹل کلاس کی لڑکی تھی جو لڑ جھگڑ کر یونیورسٹی تک صرف تفریح کے لیے آئی تھی۔ مگر یہاں آکر اسے احساس ہوا کہ اس سے تو بہتر کالج تھا جہاں کم از کم ہر حرکت پر نظر تو نہیں ہوتی تھی۔

”انیلا۔۔۔ کچھ خوف خدا کرو۔ یونیورسٹی کا مطلب تم نے یہی سمجھا ہے جہاں آکر لڑکوں سے دوستیاں کی جائیں ماں باپ کی عزت کو سرعام نیلام کیا جائے اور تمہیں بتا ہے تم جیسی لڑکیوں کی ایسی حرکتوں سے کتنی لڑکیوں کے لیے تعلیمی راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں سچے خواب کبھی تعبیر نہیں پاسکتے۔ تم جیسوں کے قصے جب انہی لڑکوں کی زبانی باہر لوگوں تک پہنچتے ہیں تو بہت سے باپ اور بہت سے بھائی اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو ان اداروں تک نہیں آنے دیتے۔“ بریرہ نے غصے سے انیلا کو کھری کھری سنا کر اپنی بکس اٹھا کر کلاس کی راہ لی جبکہ انیلا مارے شرمندگی کے کچھ بول نہیں سکی۔ بد مزہ تو مدثر بھی ہوا تھا مگر اس کے شیطانی دماغ میں آنے والے خیال نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیری۔

انیلا باقی کے پیریڈز میں بریرہ کو چاہ کر بھی مخاطب نہیں کر سکی اور اسٹاپ پر بھی اکیلی ہی آگئی تھی اور مدثر جو ضیا اسعدی کے ساتھ یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکلا۔ انیلا کو اسٹاپ پر اکیلے کھڑا دیکھ کر اسعدی سے انتظار کرنے کا کہہ کر ہٹا کر اس کے پاس آیا۔

”ایکسکیوز می۔ کیا ہم تھوڑی دیر بات کر سکتے ہیں۔“ مدثر نے گلا کھنکھارتے ہوئے انیلا کے پاس جا کر بہت ادب سے کہا تھا۔

انیلا جس کے دماغ میں ابھی تک بریرہ کی باتیں گونج رہی ہیں مروانہ آواز بہت قریب سے سن کر چونک سی گئی۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ اس نے غائب دماغی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”نہیں تو۔۔۔ یہ جو آپ سے دس قدم دور آئی نما لڑکی کھڑی ہے نا۔۔۔ انہیں کہا ہے۔“ مدثر نے مسکراتے ہوئے اس سے تھوڑی دور کھڑی لڑکی کے

کرنے لگا کہ کلاس میں جائے اسی دوران اس سے چار قدم کے فاصلے پر دو لڑکیاں آپس میں تکرار کرتی ہوئی گرنے کے سے انداز میں گراؤنڈ میں بیٹھیں اور کتابیں جوانی میں سے ایک لڑکی کے ہاتھ میں تھیں۔ نمن پر پختی تھیں۔ جس پر اس کے ساتھ والی لڑکی نے اسے غصے سے ڈانڈا مارا جو بکس اٹھا کر جا رہا تھا انجل نے خیال کے تحت وہیں بیٹھ گیا۔

”انیلا جو ہمیں شعور دیں ہمیں دنیا میں جینا سکھائیں ہماری راہیں روشن کریں اور سب سے بڑی بات ہماری بہترین ساتھی ہوں۔ انہیں یوں بے دردی کے ساتھ نمن پہ نہیں پہنچتے۔ علم کا ادب کرنا چاہیے۔“ بریرہ نے پہلے غصے سے اور پھر رسانیت سے انیلا کو سمجھاتے ہوئے کہا جو کہ اپنے ہاتھوں کی کیونکس ایسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کلاس میں ٹیچر نے اسی چیز کے مارکس دینے تھے۔ جبکہ دوسری طرف مدثر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا جس پر دونوں نے بے اختیار اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ جبکہ مدثر یکدم احساس ہونے پر جھل ہو گیا اس کا قہقہہ بے ساختہ اس لیے تھا کہ اسے لگا یہ لڑکی بھی شاید ضیا اسعدی کے خاندان سے ہے جو مخلوط تعلیمی اداروں میں آکر بھی اپنی سوچوں کو آزاد نہیں کر سکتے۔ اب اس کا ارادہ یہاں سے اٹھنے کا نہیں تھا۔ وہ انیلا اور اس لڑکی کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کیے بظاہر بیک کھول کر بیٹھ گیا مگر وہ ان لڑکیوں کی طرف ہی تھا۔

”بس کرو بریرہ۔۔۔ یہ تمہیں کیا ہر وقت لیکچر دینے کا بخار چڑھا رہا ہے۔ کبھی یہ بھی دیکھ لیا کرو۔ اگلا کس حال میں ہے۔ ارے میرے یونیورسٹی کے حوالے سے دیکھنے جانے والے تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔ یہ کوئی مخلوط تعلیمی ادارہ ہے۔ نہ بندہ پوچھے اگر ایسی یونیورسٹی بنائی تھی تو درمیان میں دیوار چڑھا دیتے۔ یہ کیا؟ آمنے سامنے رہتے ہوئے بھی کھل کر بات نہ کر سکو۔ انجوائے نہ کر سکو اور باہر پورڈ لگا ہوا ہے۔ یونیورسٹی بوائز اینڈ گرلز اور اندریاک انڈیا سرحدی نظام چل رہا ہے۔“ انیلا نے جلتے کٹے لہجے میں کہا۔



”بس بس۔ مسٹر؟“

”مدثر۔۔۔ خادم کو مدثر کہتے ہیں۔“ مدثر نے ایک بار پھر درباری انداز میں جھکتے ہوئے کہا۔

”جی تو مدثر۔۔۔ آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا اور واقعی آپ کے اور میرے خیالات بہت ملتے جلتے ہیں مگر یہاں کی انتظامیہ کے خیالات ہم سے بالکل نہیں ملتے۔ سواب آپ یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں تو بہتر ہے۔“ انیلا نے ہنستے ہوئے کہا وہ بھی اتنی جلدی باتوں میں آنے والی نہیں تھی۔

”بے شک یہ اسٹاپ ہے مگر دیکھنے والے قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ پھر میری دوست بریرہ مجھے آتی دکھائی دے رہی ہے آپ سے بات کرتے دیکھ کر مجھ سے واقعی بات کرنی چھوڑ دے گی۔“ انیلا نے بریرہ کو آتے دیکھ کر فوراً ”مدثر کو وہاں سے ہٹانے کی جلدی کی۔“

”اوکے۔۔۔ اوکے لیکن میں کل آپ کا۔۔۔ ہیں انتظار کروں گا اور مجھے یقین ہے آپ اپنی استانی دوست سے بچ بچا کر مجھ سے چند لمحے بات کر لیں گی۔“ مدثر نے کچھ اس انداز میں اس سے کل کی ملاقات کا ٹائم سیٹ کیا کہ انیلا نے فوراً ”اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اور مدثر اس کی طرف دوستانہ مسکراہٹ اچھال کر فوراً ”ضیاء اسعدی کی جانب بھاگا جو کہ بکس پکڑے، ادھر ادھر دیکھتے دیکھتے گاہے گاہے اس پر بھی ایک نظر ڈال رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ مدثر کیسے اس لڑکی کو جانتا ہے اور پھر لڑکی بھی دو تین جملوں کے بعد اس سے بہت دوستانہ موڈ میں بات کر رہی تھی۔ اس کی نظر میں دونوں کے لیے تاسف ہی تھا۔

وہ مدثر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ کلج کے دو سال بھی اس نے ان سرگرمیوں میں گزارے تھے۔ وہ مستقل مزاج بندہ نہ تھا۔ ہر خوب صورت چہرے سے اسے محبت ہو جاتی تھی اور یہ محبت چار دن کا خمار ثابت ہوتی۔ پھر اس کی زندگی اور اس کے میل سے وہ لڑکی اور اس کا نمبر Delete ہوتے چند لمحے ہی لگتے وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ

فطرت کبھی بدلتی نہیں تو مدثر پہلے دن کی طرح اپنی زندگی میں ملن تھا اور ضیاء اسعدی اپنے کام میں۔ چاہ کر بھی مدثر سے دوستی ختم نہ کر سکا۔ کیونکہ اسے لگتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب مدثر اس کا نقطہ نظر سمجھے گا اور ان حرکتوں سے باز آجائے گا۔

اب بھی انیلا اور اس کو باتیں کرتے دیکھ کر اسے اس لڑکی پر افسوس ہوا کہ لڑکیاں کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ چند تعریفی جملوں سے ہی زیر ہو جاتی ہیں۔ انہی خیالوں میں اس کا پوائنٹ آگیا اور وہ سر جھٹک کر اس طرف متوجہ ہوا جبکہ مدثر بھی اس کے پاس آکر ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔

\*\*\*

انیلا اور بریرہ کلج فرینڈز تھیں۔ بریرہ تھوڑی موڈی لڑکی تھی۔ زیادہ تر پردھانی پر توجہ رکھتی اور مطلب کی بات کرتی کلج کے آغاز کے دنوں میں وہ لڑکیوں کی پیچ کو سمجھ چکی تھی۔ اس لیے اس نے کسی کی طرف پیش رفت نہیں کی اور جس مقصد کے لیے کلج جوائن کیا اس طرف لگ گئی۔ اس کے برعکس انیلا ہنس مکھ اور چلبلی لڑکی تھی۔ اسے کلج، یونیورسٹی کی لائف بہت فیسسی نیٹ۔۔۔ کرتی تھی۔ اسکول ٹائم سے ہی رسالوں اور ٹی وی ڈراموں میں جو تصوراتی دنیا دیکھتی رہی تو کلج اور یونیورسٹی کے حوالے سے اس کے ذہن میں بہت سے خواب بن گئے تھے۔ کلج میں آکر چند لڑکیوں کو دیکھا دیکھی وہ بھی پردھانی سے بھاگتی اور کوشش کرتی کہ ادھر ادھر سے کمک حاصل کر کے پاس ہو جائے۔ ایسے میں اسے کلاس میں بریرہ واحد ایسی لڑکی لگی جو مکمل طور پر پردھانی کی طرف متوجہ تھی اس نے اپنی ہنس مکھ اور چلبلی طبیعت کے باعث چند دنوں میں ہی بریرہ کو دوستی کے لیے راضی کر لیا۔

شروع شروع میں تو بریرہ اس کی باتوں سے الجھن کا شکار ہوتی تھی اور بعض اوقات دوستی ختم کرنے کا بھی سوچتی مگر پھر انیلا کی آنکھوں میں بسی معصومیت اور باتوں میں چھپی سادگی اور تھوڑی تھوڑی بے وقوفانہ

حرکتوں کی وجہ سے باز رہتی۔ وہ انیلا کو سمجھ گئی تھی۔ اس کا حال ویسا ہی تھا۔ بعض جوٹل اور لوٹل کلاس لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ جو اپنے ارد گرد کے ماحول سے فرار چاہتی ہیں اور خوابوں کی دنیا بسا لیتی ہیں اور پھر ان خوابوں کا تعاقب کرتے کرتے اپنے پاؤں چھلتی کر سکتی ہیں۔ وہ سراسر حقیقت تک کے سفر میں بہت کچھ گمراہ ہوتی ہیں اور یوں دو سال کی کلج لائف میں بریرہ اور انیلا کی دوستی کب بچھڑی کی منزلیں طے کر گئی۔ پتا ہی نہیں چلا انیلا بریرہ کو بہت عزیز ہو گئی۔

کلج کے بعد جب بریرہ نے یونیورسٹی جوائن کرنے کا بتایا تو انیلا اپنے گھر کی حالت کو دیکھتے ہوئے بھی نظریں چرا کر یونیورسٹی جوائن کرنے کے لیے چل گئی اور خوب شور وادیا کر کے اور بھوک ہڑتال کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے کر رہی۔ اس کے والد سرکاری ملازم تھے اور ان کی تنخواہ میں بمشکل سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے گزارہ ہو رہا تھا۔ مگر انیلا نے اپنی ضد کی خاطر ان کو مجبور کر دیا کہ وہ ادور ٹائم بھی لگا میں اور اس کی والدہ جو پہلے کبھی لوگوں کو کپڑے سلائی کر دیتی اور اضافی خرچے کے پیسے نکال لیتی تھیں تاکہ مہینے کا بجٹ خراب نہ ہو۔ اس کے یونیورسٹی جوائن کرنے پر دن رات اس مشقت میں بھی لگ گئیں۔

انیلا بہت اونچے اونچے خواب دیکھ رہی تھی وہ شارٹ کٹ کے ذریعے کسی اونچے مقام تک جانا چاہتی تھی اور اس کے لیے اس کے ذہن میں ایک ہی حل تھا کسی امیر کبیر لڑکے سے شادی۔۔۔ انیلا سے چھوٹی رباب آویز تھی۔ بڑی بہن کے برعکس وہ بہت حساس اور ماں باپ کا خیال رکھنے والی لڑکی تھی۔ میٹرک کے بعد ہی اس نے یوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا اور اپنی پردھانی کا خرچا وہ خود اٹھا رہی تھی بلکہ کبھی کبھی انیلا کو اگر کسی فرینڈ یا اپنے لیے کوئی چیز لینی ہوتی تو وہ پیسے بھی نہ چھوٹی بہن سے لیتی یوں انیلا ان ناشکری لڑکیوں میں سے تھی۔ جو کبھی بھی اللہ کے دیے ہوئے پہ خوش نہیں رہتیں۔

اس کی پھپھو شروع سے ہی اس کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں انیلا سے دو سال بڑا اس کا پھپھو زاد قلب علی بہت ہی سلجھا ہوا لڑکا تھا اور MBA کرنے کے بعد ایک بینک میں جاب کر رہا تھا۔ اس کا جھکاؤ بھی انیلا کی طرف تھا۔ اسے اپنی یہ بے وقوف سے کزن بہت عزیز تھی۔ انیلا کی آنکھوں میں چھپے خواب اس سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس لیے وہ پوری تندہی سے آگے بڑھنے کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ اس کے برعکس انیلا کبھی بھی قلب علی کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ کوفت کا اظہار ہی کرتی اور پھپھو کی محبت اور لگاؤ سے بے زار ہو جاتی جبکہ رباب آویز جو انیلا کی طرح ظاہری خوب صورتی میں تو یکتا نہیں تھی۔ مگر باطن بہت خوب صورت تھا۔ اسے اپنی اکلوتی پھپھو اور ان کے اکلوتے بیٹے سے بہت لگاؤ تھا اور ان کی آؤ بھگت کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتی۔ مگر کبھی بھی پھپھو یا قلب علی کی نگاہوں کا مرکز نہ بن سکی۔

دوسری طرف بریرہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد آرمی آفیسر تھے اور والدہ ہاؤس وائف۔ اس کی شخصیت کا اعتماد اس کے والد کا دیا ہوا تھا وہ چاہتے تھے کہ بریرہ زندگی کے کسی میدان میں بھی مار نہ کھائے۔ انہوں نے کبھی اس پر اپنی مرضی نہیں تھوپی۔ جو اس نے چاہا وہ ملا کلج، یونیورسٹی میں بھی جو اس نے پڑھنا چاہا وہی مضامین پڑھے۔ بریرہ کے والد صفدر کیانی کے مطابق بچوں کو ان کا راستہ خود منتخب کرنے دینا چاہیے اور راستے میں لگنے والی ٹھوکریں انہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی ہیں اور ان کی شخصیت میں اعتماد آتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے تھے۔

آج جب بریرہ اپنی تعلیمی کیریئر کو مکمل کرنے کے آخری مراحل میں تھی۔ اس کی شخصیت میں پایا جانے والا اعتماد اور آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اس کے والد کا دیا تحفہ تھا۔ یوں دو مختلف بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ دونوں آہستہ آہستہ ایک



اجارہ داری میں دخل دینے کی کوشش کی شاید اللہ نے سب محبتیں اس کے حصے میں لکھی ہیں۔ مگر چند دنوں سے مجھے صرف ایک شخص کی محبت اس کے لیے اچھی نہیں لگ رہی۔ کیوں؟ کیوں؟ رباب آویز تم کہاں اور انیلا کہاں۔ انیلا کو اللہ نے حسن کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ تم میں کیا ہے جو وہ تمہاری طرف دیکھے تمہارے نخرے برداشت کرے۔ ایک عام شکل و صورت کی مالک عام سی لڑکی۔ ”رباب آویز کے اندر سے آواز آئی۔ اس نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ گال پہ رکھا تو آنسوؤں کی کمی نے اسے چونکا دیا کہ وہ بے آواز روئے جا رہی تھی اور اسے معلوم ہی نہیں تھا۔

”میں پاگل تو نہیں ہوں۔ کیوں ایسی سوچیں میرے ذہن و دل کو پریشان کر رہی ہیں میں تو اپنے والدین کی پیار بیٹی ہوں جو ان کی پریشانیوں کو سمجھتی ہے۔ جو وہ کہتے ہیں فوراً مان لیتی ہے۔ کیا ہوا۔ جو وہ مقام گھر میں نہیں۔ میں لوگوں کو اگر خوشی میں یاد نہیں آتی تو ضرورت اور دکھ میں تو یاد آتی ہوں نا۔ اس سے بڑھ کر اللہ کی مجھ پر کیا رحمت ہوگی۔ اگر میرے دل میں اس کا خیال آگیا ہے اور محبت کی کوئٹھ پھوٹ پڑی ہیں تو اللہ اسے میرے نصیب میں بھی لکھ دے گا۔“ رباب آویز کے ضمیر نے اسے سمجھاتے ہوئے ہلکی سی سرزنش بھی کی۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اپنے آنسو صاف کر کے مسکراتے لبوں کے ساتھ چوٹے پر چائے کا پانی رکھا تاکہ پھپھو اور قلب علی جو کھانے کے بعد چائے پینے کے عادی تھے بنا کے ان کی طلب پوری ہو جائے۔

\*\*\*

مدرثر کی باتیں جنہیں ضیاء اسعدی نے شغل کے طور پر لیا تھا۔ چند دنوں میں ایک سچائی کے طور پر سامنے آگئیں۔ میڈم کو الوداعی پارٹی دی گئی تھی اور نئے پرنسپل نے چارج سنبھالا تھا۔ سرذیشان علی چوہدری کی پرنسپلٹی کی تعریف تو لڑکوں تک نے کر دی۔ بہت ڈینٹ اور ہنڈسم تھے اور عمر کے لحاظ سے

ابھی جوانوں میں شمار کیے جاسکتے تھے۔ ان کی پہلی تقریر نے لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکوں کو بھی ان کا دلدادہ کر دیا تھا۔ وہ بہت Ambitious انسان تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ ساتھ آگے بڑھنا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی باتوں میں جھلکتی شغف انگیز طرز خطاب ان کی پرسنالٹی کا منہ بولتا ثبوت تھا اور جب انہوں نے کہا۔

”آج سے یونیورسٹی میں وہی رولز فالو کیے جائیں گے جو پانی شہروں کی یونیورسٹیاں کر رہی ہیں اور امید ہے کہ نظم و ضبط کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ماحول کو بھی برامین رکھا جائے گا اور یونائیٹڈ گزٹل کر اس یونیورسٹی کا نام روشن کریں گے۔“

مدرثر نے اپنی سیٹ پر چڑھ کر تالیاں بجائی تھیں۔ اسعدی نے اسے بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچا۔ جبکہ بہت سے اسٹوڈنٹس نے اس کی بے ساختگی کو سمجھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ وہ اپنی خجالت چھپاتے ہوئے دوبارہ سر ذیشان کی طرف متوجہ ہوا۔ جو یونیورسٹی کی بہتری اور بہترین انداز تعلیم کے متعلق اپنے منصوبے اور ارادے شیئر کر رہے تھے۔

یوں مدرثر اور انیلا جیسے بہت سے اسٹوڈنٹس کی دلی خواہشوں کو راہ ملی اور انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

\*\*\*

”یار میں تو دیوانی ہو گئی ہوں پرنسپل کی۔ واہ کیا شخصیت ہے۔ بندے پر سحر طاری کر دیتے ہیں۔ دل چاہتا ہے بندہ سنتا ہی جائے۔“ انیتا نے لہک کر بات کی ابھی وہ اور بھی کچھ کہتی مگر ماریہ کے ٹھوکے نے اسے روک دیا۔

”بس بس۔ زیادہ امپریس نہ ہو۔ پرنسپل ہیں۔ تم خود پر ان کا سحر طاری کرنے کے بجائے دائیں بائیں والوں کو یہ موقع دینا۔“ ماریہ نے اسے آنکھ دبا کر ہنستے ہوئے اسے احساس دلایا کہ اوپر نظریں کرنے کے بجائے مقابل میں نظریں دوڑائے۔ ابھی وہ لوگ یہی باتیں کر رہی تھیں کہ انیلا اور بریرہ بھی کلاس میں

دخل ہوئیں۔ ”ہائے گزرتے۔ مبارک ہو۔ تم لوگوں کی نا آسودہ خواہشات اب حقیقت کا روپ دھارنے والی ہیں بلکہ دھار چکی ہیں۔“ بریرہ نے مسکراتے ہوئے ان پر طنز کیا تھا۔ جبکہ اس کی بات پہ انیلا نے خوشی سے کھنکھتی ہوئی آواز میں اقرار کیا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔

”دل۔۔۔ ہمیں پہلے کوئی تکلیف تھی اور نہ اب کوئی تکلیف ہے۔ ہاں بے جا پابندیاں ختم ہونے شکر کیا ہے۔ ویسے بھی وہ رولز ان لڑکیوں کے لیے تحت تھے۔ جس کے پاس انجوائے منٹ کا صرف ایک ہی ذریعہ ہو۔ ہمارے لیے نہیں۔ ہم پہلے بھی آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہی تھیں اور آگے بھی کوئی مسئلہ ہی نہیں۔“ ماریہ نے بریرہ کے طنز کو سمجھتے ہوئے نخوت سے اپنے بال جھٹکے۔

”یس۔۔۔ یو آر رائٹ تمہاری آزادی یہ تو بہت سے لڑکیاں رشک کرتی ہیں۔“ بریرہ نے درپردہ اس کی حرکتوں اور اس کے متعلق ہمہ وقت یونیورسٹی کی لڑکیوں کی زبانی اس کے قصوں کا حوالہ دیتے ہوئے بات کی اور اپنے بیگ میں پین تلاش کرنے لگی۔ انیلا نے دیکھا کہ اس کی بات نے ماریہ کا چہرہ غصے سے سرخ کر دیا تو بات آگے نہ بڑھے۔ فوراً ”بریرہ کو ٹوکا تھا۔

”بس کرو بریرہ۔ کیا فضول باتیں لے بیٹھی ہو چلو اٹھو کلاس شروع ہونے والی ہے۔“

\*\*\*

”ایکسکیوز می۔۔۔ میں غلطی یہ نہیں تو۔۔۔ آپ کا نام انیلا ہے۔“ مدرثر کافی دنوں سے انیلا کو فالو کر رہا تھا۔ یہ لڑکی اس کے خیال کے برخلاف کافی تیز یا محتاط نکلی تھی کہ اگلے دن انتظار کے باوجود اسٹاپ پر نہیں آئی اور کافی دیر بعد بریرہ کے ساتھ ہی آئی اور اسے یوں نظر انداز کیا جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو۔ وقتی طور پر تو وہ چپ ہو گیا۔ پھر یونیورسٹی میں ہونے والی تبدیلیوں نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ آج جب کیفیئر میں انیلا کو اکیلے بیٹھ دیکھا تو فوراً ”چلا آیا کیونکہ اب کسی کو یہ ڈر

نہ تھا کہ کون کیا گفتگو کر رہا ہے۔ سو وہ آرام سے انیلا کے پاس کرسی کھینٹ کر بیٹھ گیا۔ اور یوں تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کا مکمل تعارف حاصل کر چکے تھے۔ آج خوش قسمتی سے بریرہ یونیورسٹی آئی ہی نہیں تھی اور انیلا کا یہ دن جو یورگزر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک نیا راستہ بنا گیا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ آگے چل کر یہ قہقہے اس کے لیے کیا سامان تیار کرنے والے ہیں۔ وہ صرف حال میں جینا چاہتی تھی۔

\*\*\*

جہاں یونیورسٹی میں آنے والی تبدیلی نے اسٹوڈنٹس کو کانفیڈنس دیا تھا وہیں بہت سے اسٹوڈنٹس نے اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ پھر جو چیز حاصل کرنا چاہتا تھا کر رہا تھا۔ بہت سے اسٹوڈنٹس ایک دوسرے کی قابلیت سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور پڑھائی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش نے بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں میں تعلیمی میدان میں مقابلے کا میدان گرم کر دیا تھا۔ وہاں بہت سے طلبہ اور طالبات ایسے بھی تھے جو غیر نصیبی سرگرمیوں میں الجھ گئے تھے مختصر یہ کہ ہر بندہ اپنی سوچ اور خواہشات کے مطابق آگے بڑھ رہا تھا۔ پرنسپل ذیشان بھی گاہے بگاہے اسٹوڈنٹس کے ساتھ ان کے مسائل سننے اور ان کے حل کے لیے کوشاں تھے۔ سمسٹر قریب تھا۔ جہاں ضیاء اسعدی مدرثر کو نظر انداز کیے پوری طرح اپنی پڑھائی پہ توجہ دے رہا تھا۔ وہیں بریرہ بھی انیلا سے غافل تھی اور یہ وقت انیلا اور مدرثر کے لیے گولڈن بریڈ ثابت ہوا۔ انیلا وقتی طور پر اپنے خوابوں کو بھلائے بس مدرثر کی لمحے دار گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور غیر محسوس طریقے سے اس کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔

وہیں مدرثر یونیورسٹی میں انیلا اور رنگ نمبر پہ بھی بہت سے لڑکیوں کے جذبات سے کھیل رہا تھا وہ انیلا کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ اس کے دل میں انیلا اور اس جیسی کسی لڑکی کے لیے عزت نہیں تھی جو دو بول



محبت کے سن کر آپ سے باہر ہو جاتی ہیں۔ وہ رات گئے تک انیلا سے گپ شپ کرتا اور یونیورسٹی میں بھی جتنی دیر دور رہتے پیغامات ایک دوسرے سے جاری رکھتے اور موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے رکھتے۔ انیلا کے لیے صرف مدثر اہم ہوتا جا رہا تھا۔ جبکہ مدثر اس کے بڑھتے ہوئے التفات دیکھ کر مزے لے رہا تھا۔ ان کی انہی مصروفیات میں امتحانات کے دن آ گئے اور وہی ہوا۔ انیلا کا رزلٹ بہت خراب آیا تھا۔ بمشکل پاس ہوئی تھی اور مدثر بھی ہمیشہ کی طرح جیسے تیسے کر کے سمسٹر کلیئر کر ہی گیا۔ ہاں بریرہ کی یونیورسٹی میں سیکنڈ پوزیشن آئی تھی اور یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے والا بندہ ضیاء اسعدی تھا۔

بریرہ نے انیلا کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔ مگر اس کی سمجھ میں پہلے کچھ آیا تھا نہ اب آیا۔ ہاں بریرہ اس کے بدلے اطوار سے بہت کچھ سمجھ گئی۔ اور بہتر یہی جانا کہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دے اور بریرہ کا یہی فیصلہ غلط تھا کیونکہ بریرہ کا منہ موڑنا انیلا کو بالکل ہی بے پروا کر گیا اور وہ کھلم کھلا مدثر کے ساتھ وقت گزارنے لگی کے خبر تھی کہ آنے والا وقت اس کے لیے کتنے پچھتاوے لے کر آ رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

”ایک بات بتاؤ رباب۔“ قلب علی نے رباب کو سنجیدہ آواز میں پکارا تو وہ جواسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے بنانے کچن کی طرف جا رہی تھی۔ فوراً مڑی وہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی پہ چونک اٹھی۔

”جی۔۔۔ پوچھیں علی۔“ رباب واپس پلٹ آئی۔ ”انیلا مجھ سے اس قدر روڈے لہجے میں بات کیوں کرتی ہے۔ کیا وہ امی کی خواہش سے ناواقف ہے یا یہ بات جان کر ناخوش ہے۔“ قلب علی کو جو بات کتنے عرصے سے پھانس کی طرح دل میں چبھ رہی تھی۔ اسے آج زبان دے ہی دی۔

”میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ آج کل امی باقاعدہ انیلا اور مجھے ایک رشتے میں باندھنا چاہ رہی ہیں

وہ ماموں لوگوں سے بات کرنا چاہتی ہیں کہ چھوٹی سہیلی تقریب رکھ کر ہماری مستثنیٰ کردی جائے اور شادی اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد کر لی جائے گی۔ لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ انیلا شاید ہماری اس خواہش کا مثبت جواب نہ دے۔“ قلب علی نے اپنی الجھن رباب کو بڑے شیر کی تھی۔ اس بات سے انجان کہ اس کی باتوں نے رباب کے اندر بے چینی پھیلا دی تھی۔ وہ مسلسل قلب علی کے چہرے پہ محبت کے پھڑپھڑانے کا خوف دیکھ رہی تھی۔

قلب علی نے جب اپنی بات کا کوئی رد عمل نہ سنا تو سر اٹھا کر رباب کی طرف دیکھا اور اک لمحے کے لیے چونک گیا۔ رباب کے چہرے پہ لکھی تحریر کچھ اور کہہ رہی تھی یا وہ سمجھ غلط رہا تھا اس نے سر کو جھٹک دیا۔ شاید میرے دل و دماغ پہ سوچوں کی یلغار نے الٹا اثر کر دیا ہے اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈھٹایا۔

”رباب آویز۔۔۔ تم تو میری سویٹ کزن ہو۔۔۔ یار میری پریشانی کا حل بتاؤ۔ یہ کیا صنم بکلم بیٹھ گئی ہو۔“ قلب علی نے لہجے کو بٹاش کرتے ہوئے شکستگی سے کہا۔

”جج۔۔۔ جی۔۔۔ میں انیلا سے اس کے دل کی بات اس کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کروں گی دیے تو وہ مجھ سے کم ہی کچھ شیر کرتی ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ اس معاملے میں آپ کی پوری مدد کروں گی۔ آگے جو ہوا۔ وہ آپ کا نصیب۔“ رباب نے کھوئے کھوئے لہجے میں بات مکمل کی اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

اور قلب علی جو اسے دوبارہ پکارنے ہی والا تھا۔ اس کے روپے پہ چپ سا ہو گیا۔ وہ دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ رباب گو ہوا کیا ہے۔ اس کزن کو وہ ہمیشہ خاموش اور بے ضرر سی لڑکی سمجھتا تھا۔ جس کی اپنی مرضی اپنی خواہش اپنے کوئی خواب نہیں مگر۔ آج رباب آویز پہ بدلی بدلی لگ رہی تھی یا اس کا وہم تھا۔ فی الوقت وہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ صرف یہ دعا کر رہا تھا کہ جو خدشے وہم اس کے دل میں انیلا کے

آ رہے ہیں وہ جھوٹے ثابت ہوں اور انیلا کے دل کی خواہش اور اس کے دل کی مسند پہ بھی صرف قلب علی ہی براجمان ہو۔

☆ ☆ ☆

”مدثر۔۔۔ ہم کب تک یونہی فون پہ باتیں کرتے رہیں گے اور چھپ چھپ کر ملاقاتیں۔۔۔ تم گھر میں بات کرونا۔“ انیلا جو کب سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی۔ آج جب مدثر نے معمول کے مطابق رات کو کل کی تو انیلا نے دل کی بات کو زبان دے دی۔ وہ سمجھ رہی تھی رباب ہمیشہ کی طرح سوچتی ہے۔ دونوں ایک ہی کمرہ شیئر کرتی تھیں۔ مگر یڈ الگ الگ تھے۔ رباب دن بھر کی تھکن کی وجہ سے جلد ہی نیند کی وادی میں اتر جاتی تھی۔ مگر انیلا آدھی رات کے بعد مدثر کے ساتھ محبت بھری باتیں کرنے کے لیے جاگ رہی ہوتی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ آج قلب علی کی دن کی باتوں نے رباب آویز سے نیندیں چھین لی ہیں۔ وہ سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ مگر حقیقتاً ”جاگ رہی تھی اور جب انیلا نے کال پک کی اور آہستہ آواز میں گفتگو شروع کی تو رباب آویز اس کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اسے انتہائی دکھ اور صدمہ ہوا تھا کہ ان کے والدین ان کے لیے کیا کیا کر رہے تھے اور انیلا کیا کر رہی تھی۔ اس نے دو دن پہلے انیلا کی چیزیں درست کرتے ہوئے اس کے سمسٹر گریڈز بھی دیکھے تھے۔ مگر موقع نہیں ملا کہ انیلا سے پوچھتی۔ مگر اس وقت اس کی گفتگو نے اسے ساری صورت حال سمجھا دی تھی۔ اس نے آنکھیں بند ہی کیے رکھیں تاکہ انیلا کو شک نہ ہو۔ وہ بے سکون اور مطمئن ہو کر اپنی باتوں میں لگی ہوئی تھی۔

”ہوں۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔ مگر زیادہ دیر مت کرنا۔ میں نے تم سے ذکر کیا تھا نا۔۔۔ اپنے اسٹوڈنٹ کزن اور اس کی پینڈو ماں کا۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وہ جلد ہی امی ابو کے سامنے رشتے کی بات کریں گے۔ انہیں تو خیر میں دیکھ لوں گی۔ مگر آگے کیا ہو۔ یہ نہیں جانتی اس

لیے تمہیں کہہ رہی تھی۔“ انیلا نے انتہائی حقارت آمیز لہجے میں پھپھو اور علی کا ذکر کیا تھا۔ رباب اس کی باتیں سن کر حیران رہ گئی تھی اسے انیلا پر غصہ بھی آیا اور دل چاہا کہ ابھی اٹھ کر اس کی طبیعت صاف کر دے کہ وہ اپنے خاندان اور اپنے پیاروں کے بارے میں کیسی رائے رکھتی ہے مگر کچھ سوچ کر چپ سادھ لی اور جان بوجھ کر کروٹ لی اور اس کے کروٹ بدلنے پہ انیلا نے فوراً موبائل آف کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”اسعدی میں نے کبھی تمہاری ذاتی باتوں اور زندگی میں مداخلت کی ہے۔ نہیں نا۔۔۔ تو تم بھی نہ کرو۔۔۔ اچھا ہوا برا۔۔۔ میں اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہوں گا۔“ مدثر نے جھنجھلا کر ضیاء اسعدی کو جواب دیا۔

”سچ ہے جب انسان بھٹک جائے تو پھر اسے کچھ راستہ بھٹائی نہیں دیتا اور اپنے اچھے برے کی تمیز بھی نہیں رہتی۔“ یہی حال مدثر کا تھا۔ اس کے دوستوں میں اضافہ ہو چکا تھا اور دوست بھی وہ جو اسی کی طرح کے خیالات کے مالک اور سرگرمیوں میں ہر وقت مصروف عمل رہتے تھے۔ اسے میں اب مدثر کو ضیاء اسعدی کی نصیحتیں چھینے لگی تھیں۔ اسے ضیاء اسعدی کے ساتھ وقت گزارنا اور بیٹھنا پور کرنے لگا۔ محسوس تو ضیاء اسعدی بھی کر رہا تھا۔ مگر وہ مدثر کو اس انجام سے بچانا چاہتا تھا جو ایسے لوگوں کا نصیب ٹھہرتا ہے۔

”مدثر میں تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں چاہتا۔ ایک اچھے دوست کی طرح تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ جس رستے پہ تم چل پڑے ہو۔ وہ ٹھیک رستہ نہیں پہلے میں تمہاری حرکتوں کو لڑکھن اور جوانی کی دہلیز پہ گھرے لڑکے کی نادانیاں سمجھ کر انور کر دیتا تھا۔ مگر جب سے تم نے پاشا لوگوں کے گروپ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم بری طرح پھنس جاؤ گے۔ اس کے گروپ کے بارے میں تو پوری یونیورسٹی بلکہ علاقہ جانتا ہے کہ کس قدر آوارہ



اور بد معاش ٹائپ لڑکے ہیں اور پھر وہ برائی کی کوئی حد نہیں دیکھتے۔ لڑکیوں کی عزت سے کھیل کر بھی دندناتے پھر رہے ہیں تم پلیز ان سے بچ کر رہو۔ تمہاری شوخ مزاجی اور شرارتیں ابھی شیطانی چالوں اور حیوانی حرکتوں میں نہیں بدلیں۔ پلیز مدثر میرا کہنا مانو اور پاشا کے گروپ کو خیر یاد کہہ دو۔“

اسعدی نے ہر ممکن طریقے سے مدثر کو سمجھایا اور آخر کار بے چارگی سے اس کے سامنے التجا کی۔  
”بس ہو گئی تمہاری بات ختم مجھے اکیلا چھوڑ دو مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔“ مدثر نے ایسی بے گانگی سے اسعدی کی محبت بھری نصیحتوں کا جواب دیا کہ وہ بے بسی اور دکھ سے چپ کر کے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ وہ لوگ اس وقت یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں تھے اور مدثر نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے روزی کو کال ملانی یہ لڑکی اپنی بے باک باتوں اور حرکتوں کی وجہ سے جلد ہی یونیورسٹی کے تمام لڑکوں کی نظروں میں آگئی تھی حالانکہ اسے یونیورسٹی جو ان کیے چند دن ہوئے تھے۔

\*\*\*

”یار اگر وہ لڑکی تمہارے لیے اتنا ہی مر رہی ہے تو اسے بلاؤ۔ اسے کہو کہ محبت امتحان مانگتی ہے اور اگر وہ تمہارے امتحان میں کامیاب ٹھہری تو تم اگلے روز ہی اس کے گھر رشتہ لے کے چلے جاؤ گے۔“ پاشا نے مدثر کی زبانی انیلا کے شادی کا اصرار سن کر خباثت سے ہنستے ہوئے کہا اور مدثر اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس سچ پہ تو اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ لڑکیوں سے دوستی کرتا تھا۔ مگر کبھی نوبت یہاں تک نہیں آئی کہ وہ یا دوسری لڑکی کسی دائمی رسوائی کا نتیجہ بھگتے۔ یہ پاشا اسے کس طرف لے کے جا رہا تھا۔

”نن۔۔۔ نہیں یار۔۔۔ میں کسی لڑکی کو ایسی سزا نہیں دے سکتا کہ وہ تمام عمر خود سے بھی منہ چھپاتی پھرے۔“ مدثر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پاشا کو

جواب دیا۔

”اوائے ہوئے۔۔۔ تو تو بالکل می ڈیڈی بچہ نکلا ہے۔ اب اگر انہیں اپنی عزت بے عزتی کا اتنا ہی خیال ہو تو یوں لڑکوں کے ساتھ چوری چھپے تعلقات قائم نہ کریں۔ یہ سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ کچھ ذرا اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے شادی شادی کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔“ پاشا نے نفرت سے عورتوں کا تمسخر اڑایا تھا۔ وہ جس معاشرے سے تعلق رکھتا تھا اور جس کلاس میں پروان چڑھا تھا۔ وہاں ایک ہی سبق ملا تھا کہ ماں اور بہن کے علاوہ کسی عورت کو عزت نہیں دینی کسی کے کردار کی صاف ہونے پر یقین نہیں کرتا۔

”مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے پاشا یار۔۔۔ مگر انیلا ان لڑکیوں سے مختلف ہے یا ہماری دوستی کو دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ مگر آج تک وہ ایک حد سے آگے نہ بڑھی نہ مجھے بڑھنے دیا ہے۔“ مدثر نے چاہتے ہوئے بھی انیلا کی طرف داری کر رہا تھا۔

”تو بڑا ہی معصوم بچہ ہے مدثر۔۔۔ یار بڑا ہو جا تیری باتوں سے تو لگ رہا ہے۔ تو بھی بزدل لڑکوں کی طرح ہی دور دور سے مداح سرائی کرنے والا ہے۔ تو نے کبھی خود پہل ہی نہ کی ہوگی ورنہ جو۔۔۔ آدھی آدھی رات تک فون پہ گفتگو کر سکتی ہیں وہ اور بھی بہت کچھ قبول اور برداشت کر سکتی ہیں۔“ پاشا اپنی بات پر قائم تھا اس لیے بے ہودگی سے بات کرتے ہوئے آنکھ ماری تھی۔

\*\*\*

”انیلا میرے گھر آج کچھ لوگ آرہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یونیورسٹی سے واپسی پہ میری طرف آؤ۔ میں بہت کنفیوز ہو رہی ہوں۔“ بریرہ نے ساری ناراضی ایک طرف کرتے ہوئے انیلا کو کال کی تھی انیلا ناشتا کر رہی تھی بریرہ کی کال آتے دیکھ کر حیران ہوئی مگر جب کال کی وجہ پتا چلی تو وہ بھی سب بھول بھال اپنی ایکسانٹمنٹ چھپا نہیں سکی۔  
”ارے واہ۔۔۔ بہت چھپی رستم نکلی ہو۔ بتایا بھی

میں کون ہے وہ۔ موصوف لرنے لیا ہیں۔“ انیلا نے دو ہاتھوں کی طرح ایک ہی سانس میں سب پوچھ ڈالا۔  
”ارے مجھے خود معلوم نہیں۔ می کے جاننے والے ہیں یہاں آنا رسمی ہے۔ کیونکہ وہ مجھے کسی تقریب میں دیکھ چکی ہیں۔ مگر میری لائسنس کے میں انہیں نہیں جانتی حالانکہ ان کے بقول وہ مجھے ملی نہیں۔ ان کا بیٹا ہے ابھی بڑھ رہا ہے۔ مگر وہ مفتنی کرنا چاہتی ہیں تاکہ زندگی میں تھوڑی تبدیلی آئے۔ میری بہنیں ان کے۔۔۔ اچھا بانی باتیں بعد میں۔ گھر آؤ گی تو سب بتاؤں گی امی مسلسل آوازیں دے رہی ہیں۔“

بریرہ نے جلدی جلدی میں اسے اہم باتیں بتادیں وہ جانتی تھی انیلا نے آنے سے پہلے اس کا دماغ کھا جانا ہے اس لیے اس کو سکون دینے کے لیے مسلسل بولتی گئی اور امی کی پکار پر بات ختم کی اور ہنستے ہوئے موبائل آف کیا کیونکہ انیلا مسلسل ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔ وہ اس کی بے چینی سمجھ گئی تھی کہ جب تک انیلا الف سے ے تک سب سن نہ لے گی آرام نہیں کرے گی اور یونیورسٹی میں بھی جلے پاؤں کی بلی کی طرح وقت کاٹے گی۔

انیلا یونیورسٹی جانے کے بجائے سیدھی اسی کی طرف آگئی۔ اور آتے ہی اس کے سر ہو گئی۔ لگ نہیں رہا تھا کہ ان کے درمیان اتنے لمبے عرصے سے بات چیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ لوگ آج پرانی دوستوں کی طرح ہی لگ رہی تھیں۔ انیلا اور بریرہ کی نوک جھوک میں ہی مہمانوں کے آنے کا ٹائم ہو گیا اور ہمیشہ کی طرح انیلا خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور ڈرائنگ روم میں جھانکنے چلی گئی۔ وہ لڑکا دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اور لڑکا دیکھ کر تو اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی اور سر پٹ بھاگی تاکہ بریرہ کے سامنے جا کر نیوز بریک کرے اور بچن میں سے نکلتی بریرہ سے جا کر ٹکرائی۔ دونوں کی ٹکرائی شدید ہوئی تھی کہ اونٹنی کی آوازوں کے ساتھ ہی آنسو بھی نکل آئے بریرہ اپنے سر کو دباتے ہوئے اسے

کھا جائے وہی نظروں سے دیکھ رہی سی۔ جبکہ انیلا چوٹ کو بھولے جو دیکھ کر آئی تھی اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ بریرہ کی والدہ چلی آئیں۔

”کیا ہوا بیٹا۔۔۔ ڈرائنگ روم تک تم لوگوں کی آوازیں آئی ہیں۔ میں نے کہا اللہ خیر ہی کرے۔ کوئی چوٹ ووش نہ لگ گئی ہو۔ کیا ہوا۔ مجھے تو لگ رہا ہے تم دونوں کی آپس میں ٹکرائی ہوئی ہے۔“ نزہت بیگم نے ہنستے ہوئے بریرہ اور انیلا کو سرسہلا تے دیکھ کر کہا۔ جبکہ ان کی بات سن کر انیلا کھسیانی نہیں ہنس دی جبکہ بریرہ خاموش رہی۔ وہ فرحت بیگم کے واپس جانے کے انتظار میں تھی تاکہ آفت کی برکالہ سے اس بھاگ بھاگ ٹکرائی کی وجہ تسمیہ معلوم کر سکے۔

”اچھا بیٹا تھوڑی دیر بعد چائے اور اس کے ساتھ لوازمات لے کر ڈرائنگ روم میں آ جانا سب اپنے ہی ہیں تم بچپن میں ان کے ہاتھوں میں کھیلی ہو۔ کیا ہوا جو ایک لمبے عرصے بعد مل رہے ہیں۔“ نزہت بیگم نے یار سے بریرہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا اور باہر نکل گئیں۔

”اب بکو۔۔۔ کیا افتاد ٹوٹ پڑی تھی کہ اندھے نیل کی طرح سیدھی آ کے مجھے ٹکروے ماری۔“ بریرہ نے غصے سے انیلا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”چل دفع ہو۔ پہلی بات تو یہ میں نیل نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے ٹکرماری نہیں تم میرے راستے میں آئی اور تیسری بات یہ کہ جو میں دیکھ کر آئی ہوں تم دیکھتے تو وہیں چچ مار کے بے ہوش ہو جاتیں۔“ انیلا اصل بات کی طرف نہ آئی تھی۔

”تم بتاتی ہو یا یہ رے میں تمہارے سر پہ دے ماروں۔“ بریرہ کو اب اس کی باتوں سے بے چینی ہو رہی تھی کہ آخر حقیقت کیا ہے۔  
”بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔ کیونکہ میرے دو لہا بھائی کو دو لہا بننے سے پہلے قاتلہ کا شوہر کھلوانے لگی ہو۔“ انیلا نے شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا جب دیکھا کہ بریرہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے تو اصل بات کی طرف آگئی۔







لو۔ ضیا اسعدی نے سام میں بریرہ کے ہر ہل کی نو بریرہ نے خیر خیریت دریافت کر کے ضیاء سے کچھ باتیں کلیئر کرنے کا سوچا۔

”جی ضرور۔۔۔ کیوں نہیں کیا پوچھنا ہے آپ کو۔“

ضیا اسعدی اس کے لہجے کی سنجیدگی پہ دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ اپنے دوست مدثر کو کتنا جانتے ہیں۔“ بریرہ انیلا کی زبانی مدثر کی خوبیاں سن چکی تھی مگر مدثر کے متعلق مارپہ رینا لوگوں کی سرگوشیاں بھی سنتی رہتی تھی اس لیے یہ جانتے ہوئے کہ کسی زمانے میں ضیاء اسعدی اور مدثر بہترین دوست رہے ہیں۔ اسعدی ہی سے حقیقت معلوم کرنے کی ٹھانی۔

”ہونہ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ آپ یہ بات کیوں پوچھ رہی ہیں بریرہ اپنی دوست کو سمجھائیں۔ مدثر ڈالی ڈالی ٹھونسنے والا بھنورا ہے۔ وہ انیلا کے بارے میں تو کیا خود اپنے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں۔ اور پھر اب جس گروپ کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے وہ بدنام ترین گروپ ہے یونیورسٹی کا۔ بلکہ یونیورسٹی سے باہر بھی ان کی سرگرمیاں کوئی قابل تعریف نہیں میں تو مدثر کو اپنے تئیں سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔ وہ بنا ٹھوکر سبق حاصل نہیں کرے گا آپ انیلا سے کہیں کہ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ مدثر سے کنارہ کش ہو جائے ورنہ ذلت اور رسوائی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ آل ریڈی پوری یونیورسٹی میں ان کے افسوس کی باتیں گردش کر رہی ہیں۔“ ضیا اسعدی نے تفصیلاً ”جواب دیا۔

ضیاء اسعدی کی باتوں نے بریرہ کو مزید پریشان کر دیا تھا وہ انیلا کی بے وقوفیوں کو جانتی تھی وہ جس بات پہ اڑ جاتی۔ چاہے نقصان ہو پیچھے نہیں ہٹتی تھی اور بار بار ہاضد میں اپنا نقصان کروا چکی تھی۔ مگر اب۔۔۔ بات کروار اور زندگی کی کھی بریرہ نے ضیا اسعدی کو یقین دلایا کہ وہ انیلا سے کھل کر بات کرے گی اور اسے ہر ممکن سمجھائے گی مگر خود ہزار و سوسے لے کر بیٹھ گئی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ انیلا کو کیسے قائل کرے۔

☆ ☆ ☆

”مدثر ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ انیلا مدثر کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کہانا۔۔۔ سربراہ ہے تمہارے لیے۔“ مدثر نے ذومعنی سا جواب دیا تھا۔

”پھر بھی پتا تو چلے۔“ انیلا اس کے پراسرار اور ذومعنی انداز سے پریشان ہو رہی تھی۔ رات مدثر نے اسے کہا تھا کہ صبح یونیورسٹی سے چھٹی کرنے کیونکہ وہ اسے کہیں لے کر جانا چاہتا ہے۔ اس نے بہت پوچھا کہاں اور کیوں۔۔۔ مگر مدثر کا ایک ہی جواب تھا۔

”مجھ سے محبت ہے نا تمہیں۔۔۔ بس اعتبار کرو۔ کہیں غلط جگہ نہیں لے کر جاؤں گا۔“ تو وہ اس کی چکنی چڑی باتوں میں آگئی۔ وہ مدثر کے کہنے پہ کہ مجھ پہ اعتبار کرو۔ سب باتوں کو پس پشت ڈال چکی تھی۔ کیونکہ اس کی محبت میں جس قدر آگے بڑھ چکی تھی وہ اس کے بارے میں کچھ غلط سوچ ہی نہیں سکتی تھی اور یہی اس کی بھول اور غلطی تھی کہ یہ ایک شخص کے لیے اپنے پیاروں کو دھوکا دے رہی تھی۔

وہ سری طرف مدثر آخر کار پاشا کی پڑھائی پٹی میں آ چکا تھا۔ وہ انیلا کے ساتھ آخری گیم کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ اسے آزمانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس کی بات ماننی تو وہ اس کے ساتھ سب کچھ کر کر کے اسے چھوڑ دیتا۔ کیونکہ ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہونا چاہیے اور اگر وہ انکار کرتی۔ تو چھوڑنا تو تب بھی اسے تھا۔ انیلا کا اس کے ساتھ چلے آنا۔ اس کے ذہن میں پاشا کے ڈالے گئے خیال کو پختہ کر رہا تھا کہ سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

وہ انیلا کو اس وقت پاشا کے فلیٹ پہ جا رہا تھا جو کہ اس مقصد کے لیے پاشا نے اسے آفر کیا تھا اور انیلا بے خبری میں کس دلدل میں دھسنے جا رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی اور جانتا مدثر بھی نہیں تھا کہ پاشا اپنے ذہن میں کیا سوچے اس کا انتظار کر رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

”ہیلو ضیا پلیز پتا کرو امیں کہ آپ کا دوست انیلا کو

لے کر کہاں گیا ہے۔ وہ یونیورسٹی کے گیٹ کے باہر سے ہی مدثر کے ساتھ کار پر بیٹھ کر کہیں گئی ہے۔“

بریرہ نے انتہائی پریشانی میں ضیاء اسعدی کو کال کی۔ جو پریڈ لے کر ابھی کلاس سے باہر نکلا تھا۔ بریرہ کو کلاس کی لڑکی سے پتا چلا کہ انیلا یونیورسٹی کے باہر سے ہی مدثر کے ساتھ کہیں گئی ہے اور ضیا اسعدی کی چند دن پہلے کی گئی باتوں نے بریرہ کے بدن میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔

انیلا اپنی بے وقوفی اور سراب محبت کا پیچھے کرتے کرتے اپنا بہت نقصان کرنے والی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا تو ضیا اسعدی کو کال کر دی کیونکہ انیلا کا سیل آف جا رہا تھا۔ اور ضیا اسعدی اس کی بات سن کر مزید پریشان ہو گیا۔ بریرہ کو حوصلہ دے کر اس نے سیل باکٹ میں ڈالا اور لمحہ لگا اسے فیصلہ کرنے میں کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ آج پاشا ابھی یونیورسٹی نہیں آیا تھا اور مدثر اور پاشا کا ہر وقت کا ساتھ کوئی نئی کہانی سامنے لانے ہی والا تھا۔

وہ سیدھا پر سبل آفس کی طرف بڑھا۔ وہاں جا کر اس نے سرزیشان سے تمام معاملہ ڈسکس کیا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے فوراً پاشا کے دوستوں کو آفس میں طلب کیا اور پاشا کا موجودہ ایڈریس لے لیا۔ کیونکہ پاشا آئے دن اپنی رہائش بدلنے کا عادی تھا۔ پہلے تو اس کے دوستوں ظفر اور شیراز نے آئیں بائیں شائیں کی کیونکہ آج کی متوقع واردات کا انہیں پتا تھا مگر سرزیشان کے ڈرانے دھمکانے پہ فوراً ”سچ اگل دیا کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے اور کس ارادے سے۔۔۔ یہ خبر ان کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔ ضیا اسعدی اور سرزیشان فوراً پاشا کے گھر کے لیے نکلے۔

☆ ☆ ☆

”پاشا تم نے مجھ سے کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہے ہو۔ دیکھو اس لڑکی کے ساتھ جو بھی معاملہ ہے میرا ہے۔ چاہے میں اس کے ساتھ مخلص نہ تھا مگر میں

اسے تمہارے ہاتھوں کھلونا نہیں بننے دوں گا۔“ مدثر پاشا کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھا۔ پاشا کا مطالبہ سن کر چکر اگیا۔ پاشا اس وقت ڈرنک کر کے مکمل مدہوش ہوا بیٹھا تھا اور وہ انیلا کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بے چین تھا اسی لیے جس وقت مدثر انیلا کے ساتھ وہاں پہنچا۔ تو پاشا نے جس انداز میں انہیں ویلکم کیا۔ مدثر کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ انیلا کے چہرے سے نظرس چرا تا ہوا اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر پاشا کو لے کر اس کے بیڈ روم میں آیا گیا۔ مگر وہاں بڑی خالی بوتلیں دیکھ کر اسے جھٹکا لگا کیونکہ جتنی ڈرنک پاشا کر چکا تھا اسے کل ہی ہوش آنا تھا۔ مگر پاشا نشہ کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے ابھی اتنا بھی بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ مدثر سے کہنے لگا۔

”چھوڑو کل کا اندیشہ۔۔۔ آج اس وقت کو رنگین بنالیں۔“ اور مدثر کے ذہن پر اس کی باتوں نے حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیے۔ پاشا پہلے تو پیار سے اسے قائل کر رہا تھا پھر دھمکیوں پہ اتر آیا۔

”مدثر سیدھی طرح میری بات مان لو۔۔۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ ظفر اور شیراز کے ذمے پہلے ہی میں نے یہ کام لگا دیا ہے وہ یونیورسٹی میں مشہور کر چکے ہوں گے کہ تم اس پھلجڑی کو کس مقصد کے لیے کہاں لے کر گئے ہو۔ اب وہ مقصد تم پورا کرو یا میں۔۔۔ نام تمہارا ہی آنا ہے۔“ پاشا کی اس دھمکی نے مدثر کی رہی سہی قوت مزاحمت بھی ٹھنڈی کر دی۔ وہ پریشانی سے ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے اور انیلا جو ڈرائنگ روم میں مدثر کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو اس غرض سے کہ وہ واپس کیوں نہیں آ رہا اندر کی جانب آئی وہ سمجھی تھی کہ پاشا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کی سرخ آنکھوں کو وہ بخار سمجھ رہی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بھیڑیا اس کے لیے یہ اہتمام کیے بیٹھا ہے۔

جب وہ بیڈ روم کے دروازہ پر دستک دینے ہی لگی پاشا کی آئی آواز نے اس کے قدموں تلے سے زمین چھینچ دی وہ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ مدثر کا مکروہ



چہرہ اس کے سامنے آیا۔ مگر اسے اس سے زیادہ خود سے گھن آرہی تھی کہ اسے آئے تقریباً گھنٹہ ہو گیا تھا اور ظفر شیراز نے اب تک پوری یونیورسٹی میں یہ بات پھیلا دی ہوگی۔

وہ واپس پٹی مگر عین اسی وقت باہر گیٹ پر کسی نے نیل دی اور شاید آنے والا بہت عجلت میں تھا کہ نیل یہ ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گیا۔ انیلا کی ٹانگوں میں تو دم ہی نہیں رہا تھا کہ حرکت کرتی۔ مگر نیل کی آواز نے مدثر اور پاشا کو جگا دیا تھا پاشا حیران ہوا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے جب کہ ظفر اور شیراز بھی یونیورسٹی میں تھے اور مدثر پریشان اور خوف زدہ کہ آنے والا وقت اس کے لیے بہت کڑی آزمائش لا رہا تھا وہ نادانیوں میں دشمن کو دوست سمجھ بیٹھا تھا اور اس کے ہر کاوے میں آکر بری طرح پھنس چکا تھا۔

دونوں اکٹھے بیڈ روم سے نکلے اور بیڈ روم کے تھوڑے فاصلے پر کھڑی انیلا کے خوف سے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر مدثر بھاگ کر اس کی طرف آیا جب کہ پاشا گیٹ کی جانب بڑھا۔ پاشا کے گیٹ کھولنے پر باہر موجود دونوں نفوس بھاگ کر اندر داخل ہوئے تھے۔ سرزیشان نے پاشا کو دھکے سے پیچھے دھکیلا تھا جب کہ ضیا: اسعدی اندر کی جانب بڑھا۔

☆ ☆ ☆

آفس میں اس وقت سرزیشان علی چوہدری ضیاء اسعدی پاشا ظفر اور شیراز موجود تھے۔ اللہ کالا کھلا کھلا شکر تھا کہ وہ لوگ بروقت وہاں پہنچ گئے تھے انیلا خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی ضیا اسعدی فوراً اسے ہسپتال لے گیا اور پاشا کی حالت اور گھر میں موجود چیزوں سے اس کی طرز زندگی کا بخوبی اندازہ کرنے کے بعد سرزیشان نے انہیں اگلے دن آفس میں طلب کیا تھا۔

مدثر تو مارے شرمندگی کے نظریں نہیں ملا پارہا تھا۔ اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو چکا تھا کہ برے دوست برے انجام تک ہی لے جاتے ہیں اور ضیا اسعدی

جیسے دوست کو کھونے کا دکھ بھی تھا مگر اس کے ساتھ اپنی ذلت اور رسوائی کا خوف بھی تھا۔ جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اب اس کے پچھتاوے اسے کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ اثر اگر نہیں ہوا تھا تو پاشا اور اس کے دوستوں پر۔

”میں چاہتا تو تم لوگوں کو پولیس کے حوالے بھی کر سکتا تھا۔ ڈی ایس پی جبران میرا بھائی ہے اور تم جیسے آوارہ لوگوں کو سیدھا کرنا جانتا ہے اور اگر میں چاہتا تو تم پر دو تین کیس ڈلو کر ساری زندگی جیل میں سڑوا سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔۔۔ جانتے ہو کیوں؟“ سرزیشان کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ پاشا اور اس کے ساتھی بھی ان سے نظریں نہ ملا سکے۔

”اس لیے کہ وہ زندگی تم لوگوں کو مزید برائی کے رستے پر لے جاتی اور تم اپنی غلطیوں سے سیکھنے کے بجائے اس پر پکے ہو جاتے اور تمہارے والدین معاشرے میں کسی سے نظریں نہ ملا پاتے۔ کیا اس دن کے لیے انہوں نے تم لوگوں کو پر دھایا کہ تم لوگوں ان کے ہاتھوں پر بدنامی کی مر لگاؤ اور پاشا میری معلومات کے مطابق تمہاری فیملی میں ایک بیوہ ماں اور دو جوان بہنیں ہیں کیا تم چاہو گے کہ کل کوئی ان کے ساتھ۔“

”سر۔۔۔ پلیز میری بہنوں کا ذکر مت کیجیے گا۔“ پاشا کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا تھا۔ زیشان کے منہ سے اپنی بہنوں کا ذکر سن کے۔ اس نے تو آج تک کبھی اپنے دوستوں کے سامنے نام تک نہیں لیا تھا کہ اس کی بہنیں بھی ہیں۔

”بہت خوب۔۔۔ اپنی عزت کا نام ہی لیا گیا تو تڑپ اٹھے ہو اور جن کی عزتیں سرعام نیلام کرتے پھرتے ہو۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ تم چاروں میری ایک بات یاد رکھنا۔ دنیا مکافات عمل ہے۔ تم جس کے ساتھ جیسا سلوک کرو گے وہی نہیں سکتا کہ اس کا بدلہ دے بغیر قبر میں اتارے جاؤ۔ جو تکلف تمہاری وجہ سے کسی کو ملی ہے وہ تمہیں ضرور ملے گی اور اگر وہ بدلہ تم سے نہ لیا گیا تو تمہارے حصے کا قرض تمہاری

بہنیں بیٹیاں اتاریں گی۔“ سرزیشان کے لفظ تھے یا انگارے۔۔۔ چاروں کے منہ پر تازیانے بن کر لگ رہے تھے۔

کہتے ہیں تاکہ زندگی کا ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جس میں انسان کی کلیا پلٹ جاتی ہے۔ آج تک ان کی برائی کا جواب برائی سے ہی دیا گیا تھا شاید اسی لیے وہ برائی میں اور شیر ہوئے گئے مگر آج جب سرزیشان نے انہیں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا تو انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ اندر سے کتنے کالے ہیں ہر ایک اپنے ضمیر کی عدالت میں جا کھڑا ہوا تھا اور یہی سرزیشان علی چوہدری کا مقصد تھا۔ وہ نوجوان نسل کو یوں بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بس ان کے ضمیر کو جگانا تھا اور انہیں احساس دلانا تھا کہ جو وہ کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔ باقی اللہ یہ چھوڑ دیں۔ وہ ہمیشہ اندھیرے میں اپنے حصے کی شمع جلانے کے عادی تھے اور انہوں نے وہ کام کر دیا تھا۔ چار گمراہی کے راستے پہ چلنے والوں کو بھٹکنے سے بچالیا تھا۔ اور یہ کم کامیابی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

آج رباب آویز اور قلب علی کی بارات تھی۔ قلب علی رباب کے سنگ بہت مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا اور رباب آویز کے دل کی خوشی اور چاہت اس کے چہرے پر نور بن کر برس رہی تھی۔ اس کی فرماں برداری اور صبر و شکر کی عادت نے آج اسے اس کی من چاہی منزل دے دی تھی۔ انیلا بظاہر تو اس فنکشن میں خوش خوش نظر آرہی تھی۔ مگر اس کے اندر جو قیامت برپا تھی وہ وہی جانتی تھی۔

اس دن کے بعد وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ حالانکہ بریرہ ضیا: اسعدی اور سرزیشان علی چوہدری تک نے اسے سمجھایا تھا مگر وہ اس دنیا کو فیس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اتنے بڑے دھوکے کے بعد کسی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ جب پاشا کے فلیٹ میں بے ہوش ہو کر وہ مدثر کی بانہوں میں گری گئی تھی۔ مدثر اپنے کیے پہ ناوم اور پشیمان تھا وہ انیلا کے ساتھ اپنے

رشتے کو نام وینے کا خواہش مند تھا۔ مگر انیلا نے سرد مہری سے اس کی ہر بات ہر صفائی سننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خود کو اپنی خود سری اور لالچ اور خود پسندی کی سزا دینا چاہتی تھی وہ دوبارہ ان لوگوں کا نام بھی سنتا نہیں چاہتی تھی جو اسے بدنامی کے گڑھے تک لے گئے تھے۔ اس پر حقیقتیں آشکار ہو چکی تھیں اور اسے احساس ہو گیا تھا کہ ماں باپ کی نافرمانی اولاد کبھی بھی سکھ نہیں پاتی۔ اس نے تو ہر رشتے کو دکھ دیا تھا۔ ہر رشتے کو دھتکارا تھا اور قلب علی کو دیکھ کر اس کا احساس زیاں اور دوچند ہو جاتا۔

رباب آویز کی بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہ احساس زیاں اور احساس جرم کے پچھتاؤں میں گھری جا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے وہ اپنے گمراہی میں آکر زار و قطار رو پڑی۔ حقیقت ہے کہ انسان جب اپنے گرد موجود لوگوں کی محبتوں اور چاہتوں کی قدر نہیں کرتا۔ تو ان کے روٹھ جانے پہ وہ یونہی تہی داماں رہ جاتا ہے۔

انیلا نے اپنی آنکھوں میں سچے سب خواب نوح ڈالے تھے اور وہ ایک نئی انیلا کو اس معاشرے کے سامنے لانا چاہ رہی تھی کہ اس جیسی بے وقوف لڑکیاں اس طرح کی غلطیاں دوبارہ نہ دہرائیں۔

☆ ☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے آئیہ سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ خطی سی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو بکھر آئی	450/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021





”پھوپھو! دوپہر کے کھانے میں کیا بنانا ہے؟“  
ماہم گھر کی صفائی کرنے کے بعد سائرہ بیگم کے کمرے میں آگئی۔ جہاں سائرہ بیگم کو استری کرتے دیکھ کر وہ چلا  
اٹھی۔

”پھوپھو! یہ کیا کر رہی ہیں آپ میں کرلوں گی نا“  
چلیں چھوڑیں یہ سب۔“ وہ انہیں شانوں سے پکڑ کر  
وہاں سے ہٹانے لگی۔

”ارے ارے ماہم“ سائرہ گھبرا کر خود کو چھڑانے  
لگیں۔ مگر ماہم نے انہیں بیڑ بٹھا دیا۔  
”یہ میں سچ کے بعد کر لوں گی۔ دیے بھی اتنی لمبی  
دوپہر ہیں کہ کتنی ہی نہیں۔“

”تھک جاؤ گی اتنے سارے کام کر کے۔“ سائرہ  
کے لہجے میں بھیڑیگی کے لیے پار ہی پار تھا۔  
”یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ تم سارے گھر کے  
کام کرو اور میں فارغ بیٹھ کر پلنگ توڑتی رہوں ساتھ  
میں بور ہوتی جاؤں۔“

”بور کیوں ہونے لگیں آپ ٹی وی پر اپنے فیورٹ  
پروگرام دیکھیں۔ ڈرامے یا پھر کوئٹنگ شو دیکھیں اور  
انجوائے کریں۔ جب تک میں یہاں ہوں تب تک  
کے لیے فل آرام اینڈ نو کام۔“ ماہم نے مسکراتے  
ہوئے کہا۔

”ماہم! مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تم سے یوں کام  
کراتے ہوئے۔ تم یہاں چند روز کی مہمان ہو اور۔“  
”میں مہمان ہوں اور نہ ہی چند روز میں یہاں  
سے ٹلنے والی ہوں میں تو ڈیڑھ دو مہینے گزار کر ہی

جاؤں گی۔ تب تک کے لیے آپ کو مجھے برداشت کرنا  
ہی ہو گا۔“ ماہم سائرہ کی بات کاٹتے ہوئے شوخ لہجے  
میں بولی۔

”میرا بس چلے تو میں تمہیں یہاں سے جانے ہی نہ  
دوں۔“ سائرہ کے لہجے میں ماہم کے لیے جیسے دنیا بھر کا  
پار سمٹ آیا۔ جواب میں ماہم مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی  
کہ اس کی پھوپھو اسے بے حد چاہتی ہیں۔

ماہم سائرہ کے اکلوتے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔  
اس لیے انہیں کچھ زیادہ ہی عزیز تھی۔ ان دنوں وہ  
پشاور سے یہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ اتفاق سے  
اس کے آتے ہی سائرہ بیمار ہو گئیں۔ اس وجہ سے گھر  
کے سارے کام ماہم نے اپنے ذمے لے لیے۔ اب وہ  
ٹھیک ہو چکی تھیں۔ مگر ماہم پھر بھی انہیں کوئی کام  
نہیں کرنے دے رہی تھی۔ سائرہ بہت کم ہی دوسروں  
کے کام سے مطمئن ہوتی تھیں، لیکن ماہم نے جس  
سیلے اور ترتیب سے گھر سنبھالا تھا سائرہ حیران ہی رہ  
گئیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی لاڈلی اور  
چلبلی بیٹی اتنی سیلے مند اور گھر کے کاموں میں ماہر  
ہو سکتی ہے۔ ان چند ہی دنوں میں ماہم نے سب کو اپنا  
عادی بنالیا تھا۔ عدیم تیمور اور ثاقب جو پہلے ماں کے  
اکیلے پن کی وجہ سے اپنے کافی حد تک کام خود کر لیتے  
تھے اب ذرا ذرا سی بات پر ماہم کو آوازیں دیتے۔  
خاص طور پر صبح کے وقت گھر میں ماہم کے نام کی  
صدائیں ہی بلند ہوتیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سائرہ اپنے کمرے میں

سونے کے لیے چلی گئیں۔ وہ باقاعدگی سے دوپہر میں دو  
گھنٹے کی نیند لیتی تھیں۔ ماہم نے کچن سمیٹا اور کمرے  
میں آگئی۔ نماز پڑھ کر وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔  
وہ اپنے گھر میں اس وقت سونے کی عادی نہیں تھی، مگر  
جو تکہ یہاں وہ صبح جلدی جاگ جاتی تھی اس لیے کھانا  
کھاتے ہی اس پر نیند حملہ آور ہو جاتی۔

اسے سوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر  
ہونے والی تپیل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے  
وال کلاک پر نظر ڈالی جو چار بج رہی تھی۔

”اس وقت کون آگیا۔“ اس نے جھنجھلا کر سوچا۔  
ثاقب اور تیمور گھر پر تھے۔ اس لیے اس نے اٹھنا  
ضروری نہیں سمجھا۔ دوبارہ سونے کی کوشش کی، لیکن

نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ اسے اپنی اس عادت  
سے سخت چڑ تھی۔ ایک بار آنکھ کھلتی تو پھر مشکل سے  
ہی نیند آتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کون آیا ہو گا،  
کیونکہ انکل اور عدیم تو اس وقت آفس میں ہوتے  
ہیں۔ وہ اس سوچ میں تھی جب ثاقب آوازیں دیتا ہوا  
آیا۔









کے آگے بیٹھ جاتے یا پھر دوستوں کے ساتھ باہر نکل جاتے۔ عدم اور جمال صاحب وہ تو اپنے بزنس میں اس قدر مصروف تھے کہ گھر کے لیے ان کے پاس بہت کم وقت بچتا تھا۔ سارا دن سائرہ گھر میں اکیلی ہوتیں۔ خالی گھر انہیں کاٹ کھانے کو دوڑاتا۔ ایسے میں انہیں ماہم کی یاد ستانے لگتی۔ ان کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتیں۔

اس روز سب کھانا کھا رہے تھے جب ثاقب نے کہا۔

”میں ماہم آپنی کو بہت مس کر رہا ہوں۔“  
”صرف تم ہی نہیں۔ سب ہی انہیں مس کر رہے ہیں۔“ پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے تیمور نے بھی حصہ لیا۔

”واقعی۔ مجھے خود بھی ماہم کی بہت یاد آتی ہے۔“ سائرہ کے لہجے میں اداسی کھل گئی۔

”ماہم کی یاد پھر اس کے کام کی۔“ جمال صاحب مسکرائے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ماہم سائرہ کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

”میں اتنی خود غرض نہیں ہوں۔ مجھے ماہم سے محبت ہے اس لیے مجھے اس کی یاد آتی ہے اور یہ اس کا بھی پیار ہی تھا جو اتنے دنوں مجھے آرام سے بٹھائے رکھا، ورنہ تمہاری وہ چیتی بھانہ جہاں۔۔۔ انہیں ذرا سی توفیق نہیں ہوتی کہ بوڑھی ممانی جو اکیلے ہی ہماری خاطر داریوں میں لگی ہوئی ہیں ان کی کچھ مدد ہی کریں۔ آتے ہی ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی ہیں۔ گویا انہوں نے ٹی وی کو بھی دیکھا ہی نہ ہو۔“ جانے کیوں جمال صاحب کی بات پر انہیں غصہ آگیا۔

”بچو اس بہانے ہی سہی تم نے اپنے بوڑھا ہونے کا اعتراف تو کر لیا۔“ جمال صاحب شرارت سے بولے۔

”یہ میں نے بات برائے بات کہا، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔“ سائرہ نے جھٹ سے تردید کی۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی اپنی عمر کے بارے میں کانٹنٹس تھیں۔

”اب میں سوچ رہی ہوں کہ چھ دن اور اسے روک لیتی۔“

”تم اسے چاہے جتنے دن بھی روکتیں آخر کار اسے گھر جانا ہی تھا۔“ جمال صاحب نے کہا۔

”کیا اچھا ہوتا اگر آپی ہمیشہ یہاں رہتیں۔“ ثاقب نے اداسی سے کہا۔

”ایسا ہو بھی سکتا ہے۔“ سائرہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ بہت دنوں سے دل میں دلی بات زبان پر آئی گئی۔ جمال صاحب پل بھر میں سمجھ گئے کہ سائرہ کا اشارہ کس جانب ہے۔

”وہ کیسے ممی؟“ ثاقب بہت ہی اشتیاق سے بولا۔ تیمور بھی کھانے سے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”عدم اور ماہم کی شادی کرادیں تو۔“ سائرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ثاقب اور تیمور اچھل پڑے۔

”واؤ کیا آئیڈیا ہے۔“  
”یہ خیال آپ کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آیا۔“ تیمور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں اس نئے رشتے کا سن کر بے حد پر جوش ہو گئے تھے۔ جمال صاحب نے بھی رضامندی دے دی۔ سائرہ کی خوشی قابل دید تھی۔ اس کی ہمیشہ سے یہی خواہش تھی، لیکن ساتھ میں ڈر تھا کہ جانے جمال صاحب کیا کہیں گے۔ اب شوہر کی جانب سے گرین سگنل ملتے ہی وہ کہنے لگیں۔

”میں کل ہی بھائی جان اور بھابھی سے بات کرتی ہوں۔“

”میرے خیال میں ان لوگوں سے بات کرنے سے پہلے تم عدم سے پوچھ لو تو زیادہ بہتر رہے گا۔“ جمال صاحب نے کہا۔ عدم اس وقت گھر پر نہیں تھا، اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا۔

”عدم کو بھلا کیا اعتراض ہونے لگا۔“ سائرہ کے لہجے میں حیرانی در آئی۔

”اعتراض کی تو بظاہر کوئی بات نہیں، لیکن پھر بھی

احتیاط اچھی چیز ہے۔“ سائرہ نے عجیب نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔  
”ٹھیک ہے، وہ آتا ہے تو میں اس سے بات کرتی ہوں۔“ سائرہ نے پرسوج انداز میں کہا۔

\*\*\*

”امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ سائرہ کی بات سن کر عدم کو جیسے گرنٹ لگا۔ وہ اچھی ابھی ہی گھر آیا تھا۔ آتے ہی سائرہ نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

”کیوں۔۔۔ کیا خرابی ہے ماہم میں۔“ عدم کے اس طرح ری ایکٹ کرنے پر سائرہ ناگواری سے بولیں۔

”ممی! ماہم میں کوئی خرابی نہیں، لیکن میں نے کبھی ماہم کے لیے ایسا نہیں سوچا۔ بلکہ میں نے ہمیشہ اسے بہن ہی مانا ہے۔“ ماں کی بات سن کر وہ پریشان ہو گیا۔

”تم بالکل تو نہیں ہو گئے، وہ تمہاری گزن ہے، بہن نہیں۔ اکثر گھروں میں گزنز، بہن، بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ مگر اس سے وہ بہن، بھائی نہیں بن جاتے۔“ سائرہ کو غصہ آگیا۔

”میرے اور بھی گزنز ہیں، لیکن جو احساسات میرے دل میں ماہم کے لیے ہیں وہ کسی اور کے لیے نہیں۔ بچپن سے میرے ذہن نے بہن کا جو خاکہ بنایا ہے، ماہم اس پر پورا اترتی آئی ہے۔ میں اسے بہت پیار کرتا ہوں، بالکل اس طرح جیسے ایک بھائی اپنی بہن سے کرتا ہے۔“ سائرہ گنگ سی کھڑی اسے دیکھنے لگیں۔ عدم یہ کیا کہہ رہا تھا۔ ان کے کمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ انکار بھی کر سکتا ہے۔

”عدم! یہ تم کیا بے تکی اور بچکانہ سی بات کر رہے ہو۔“

”ممی! کیا آپ نہیں کہتیں کہ ماہم آپ کی بیٹی ہے۔“ عدم نے النان سے سوال کر دیا۔ پریشان سی کھڑی سائرہ نے بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر۔۔۔ جب میں اسے بہن مانتا ہوں تو یہ میرا بچکانہ پن کیسے ہو گیا۔ ممی! پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو آپ چاہتی ہیں وہ پاسیبل نہیں۔ میرا ذہن

اسے اس روپ میں کبھی بھی قبول نہیں کرے گا۔“ عدم کا انکار سائرہ کے لیے بہت بڑا شاک تھا۔ انہوں نے عدم کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن اس کی الگ ہی سوچ تھی۔ اسے ماہم نئے رشتے کے ساتھ قبول نہیں تھی۔ سائرہ چاہتی تو زبردستی اپنی بات منوا سکتی تھیں، مگر وہ اپنی مرضی دوسروں پر مسلط نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بچوں کی خوشی کو اہمیت دی تھی، جبکہ یہاں تو معاملہ ہی عمر بھر کا تھا۔

کئی دنوں تک وہ سخت اپ سیٹ رہیں۔ ان کی شروع سے ہی یہی خواہش تھی کہ ماہم ان کی بہو بنے، مگر جب ماہم نے یہاں آکر ان کے گھر کو بہت احسن طریقے سے سنبھالا تھا تب سے انہوں نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ ماہم کو ہی بہو بنائیں گی۔ ان کی نظر میں عدم کے لیے ماہم سے بہتر کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ماہم کی ساری خوبیاں ایک طرف کر کے بھی اس کا پلس پوائنٹ یہ تھا کہ وہ ان کی بھتیجی تھی۔ سب سے بے حد پیار کرتی تھی اور مخلص تھی۔ مگر افسوس ان کا یہ ارمان دل میں ہی رہ گیا۔ عدم سختی سے اپنی بات پر قائم تھا، اس کا کہنا تھا۔

”ممی! آپ جس سے چاہیں میری شادی کر دیں، مگر پلیز مجھے اس رشتے کے لیے مجبور نہ کریں۔“

سائرہ ابھی عدم کو منا ہی نہیں پائی تھیں کہ ماہم کا رشتہ اس کے پیانے اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ کر دیا۔ جلد ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ یہ خبر سن کر ان کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا۔

”کیا ضرورت تھی بھائی جان کو اتنی جلدی کرنے کی۔ کیا پتا عدم مان ہی جاتا۔“ انہوں نے دکھ کے ساتھ سوچا تھا۔

ماہم جس کی قسمت تھی اس کے گھر چلی گئی۔ شادی میں شرکت کے لیے سائرہ اور عدم گئے تھے۔ ان کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا، لیکن بھائی اور بھتیجی کی خوشی کے لیے انہیں جانا پڑا۔ ثاقب اور تیمور کے ایگزٹام تھے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ نہیں جاسکے۔ وہاں جا کر



ماہم سے مل کر انہیں قدرے تسلی ہوئی۔ وہ اس رشتے سے بہت خوش نظر آرہی تھی۔ خوشیوں کے خوب صورت رنگ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ وقاص سے مل کر بھی انہیں اطمینان ہوا، وہ ہر لحاظ سے ماہم کے لیے موزوں تھا۔ ان کے دل میں جو کسک تھی وہ کچھ کم ہو گئی۔

ساتھ اور عدیم واپس آچکے تھے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ ساتھ ایک بار پھر عدیم کی شادی کے بارے میں سوچنے لگیں۔ وہ اپنی تنہائی سے گھبرا گئی تھیں۔ ان کے خیال میں بہو کے آنے سے ہی گھر کی رونق برہہ سکتی تھی۔ خود لڑکی دیکھنے کے بجائے انہوں نے عدیم سے اس کی پسند پوچھی تھی۔ ”ممی! میری زندگی میں ایسی کوئی لڑکی نہیں۔ میری پسند وہی ہوگی جسے آپ منتخب کریں گی۔“ عدیم نے سب کچھ ان پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اگر میری ہی مرضی سے شادی کرنی تھی تو پھر اس وقت میری پسند کو جھٹلایا کیوں تھا۔“ ساتھ نے ناگواری سے کہا۔

”پتا نہیں ممی! آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں۔“ عدیم کے لہجے میں بے بسی در آئی۔ ساتھ کو اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ ماہم ان کی بہو بن نہ سکی اور اب عدیم کے لیے لڑکی ڈھونڈتے ہوئے یہ احساس اور بھی برہہ گیا تھا ان کی نظر میں آج کل کی لڑکیاں لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ہوتی ہیں اور پھر ایک دو ملاقاتوں میں کسی کے مزاج، عادت و اطوار کے بار میں کچھ جاننا ناممکن سی بات تھی۔

دل میں طرح طرح کے اندیشے اور دوسو سے لیے وہ مدیحہ کو بہو بنا کر لے آئیں یہ رشتہ ایک جاننے والوں کے توسط سے ہو رہا تھا۔ ساتھ پہلی ہی نظر میں مدیحہ کی من موہنی اور بھولی صورت سے متاثر ہو گئی تھیں۔ یہ الگ بات کہ ان کا دل مکمل طور پر مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ مدیحہ اس گھر میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی۔ وہ ان کی توقعات پر پوری اتر سکے گی بھی یا نہیں۔

مدیحہ ایک پیاری، سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے چند ہی دنوں میں سب گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ بڑی بہو ہونے کے ناتے اپنی ذمہ داریاں بہ خوبی نبھا رہی تھی۔ مدیحہ کے رویے کو دیکھتے ہوئے ساتھ کو اب مطمئن ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ غیر ارادی طور پر مدیحہ اور ماہم کا موازنہ کرتی رہتیں۔ ان کے خیال میں مدیحہ کچھ بھی کر لے وہ ماہم کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس سوچ کے ساتھ وہ مدیحہ کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی پکڑ کر تنقید کرتے ہوئے اسے ماہم کی مثالیں دیا کرتیں۔ ایسے میں مدیحہ ان کی ہر تنقید کو خاموشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ سنتی۔ ساتھ یہ بھول گئی تھیں کہ شوقیہ چند دنوں کے لیے کوئی کام کرنا الگ بات ہے اور حقیقی ذمہ داریاں اٹھانا اور بات۔

ماہم بھی سچی تھی اس لیے اس کی ہر ادا پیاری تھی وہ گھر کے کام کرتی یا پھر ثاقب اور تیمور کے ساتھ ہلا گلا مجائے رکھتی دونوں صورتوں میں ساتھ خوش تھیں۔ لیکن اگر اب مدیحہ دیوروں کے ساتھ کھیلتی شور شرابا کرتی تو شاید ساتھ کو یہ سب برا ہی لگتا۔ سچی اور بہو میں جو فرق ہے انہوں نے وہ فرق نظر انداز کیا ہوا تھا۔

گھر میں پوتی کی قلقاریاں گونجیں تو انہیں لگا کہ برسوں کی تمنا پوری ہو گئی، سب گھر والوں کی خوشی قابل دید تھی۔ خوب خوشیاں منائی گئیں، دعوتیں ہوئیں۔ ثاقب اور تیمور بھی چاچا بننے پر بے حد خوش تھے سارا دن ننھی بچی کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ اس کے روئی کی طرح نرم گالوں کو چومتے تو کبھی اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھتے رہتے تھے۔

ننھن کے آجانے سے مدیحہ کی ذمہ داریاں برہہ گئی تھیں لیکن اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ ساتھ کو کوئی شکایات نہ ہو۔ انہی دنوں ماہم کے شوہر وقاص کا تبادلہ کراچی ہو گیا اور وہ لوگ یہیں شفٹ ہو گئے۔ اس روز ساتھ اور مدیحہ کو ماہم کے گھر جانا تھا۔ ساتھ

صبح صبح ہی تیار ہو کر بیٹھ گئیں ماہم سے عرصے بعد ملنے کی خوشی ان سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ ماہم کی شادی کے بعد ان کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی اور اب ماہم دو بیٹوں کی ماں تھی۔

”ممی! آپ عدیم کے ساتھ چلی جائیں۔ ننھن کی طبیعت ٹھیک نہیں اسی لیے میں نہیں جاسکوں گی۔“ سارہ مدیحہ کے تیار ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب مدیحہ نے آکر بتایا۔

”کیوں؟ کیا ہوا ننھن کو؟“ وہ ایک دم سے پریشان ہو گئیں۔

”اس وقت تو ہلکا سا نپریچر ہے مگر بعد میں طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے اس وجہ سے میں نے سوچا کہ گھر پر رک جاتی ہوں۔“ انہیں یوں پریشان ہوتا دیکھ کر مدیحہ جلدی سے بولی۔

”میرے خیال سے میں بھی پھر کبھی چلی جاؤں گی۔“ ننھن کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئی تھیں۔

”ممی! فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ چلی جائیں ماہم انتظار کر رہی ہوگی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر۔“ وہ تذبذب میں پڑ گئیں۔ ”میں نے کہا تھا ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں اور پھر میں ہوں نا۔“ مدیحہ نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ مدیحہ کا خود بھی بہت دل چاہ رہا تھا ماہم سے ملنے کو۔ اس نے ماہم کا اتنا ذکر سنا تھا کہ اسے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مگر ننھن کی طبیعت کی ناسازی کی بنا پر اس کا جانا ملتوی ہو گیا۔



ساتھ ماہم کے گھر میں اس کے ساتھ بیٹھی تھیں، عدیم کچھ دیر بیٹھ کر جا چکا تھا۔ وقاص بھی آفس گیا ہوا تھا۔

”ماہم! تم خوش تو ہونا؟“ اس نے جاچختی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں پھوپھو! میں بے حد خوش ہوں۔ وقاص میرا

بہت خیال رکھتے ہیں۔“ ماہم نے ماں بھرے لہجے میں کہا۔

”تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو؟“ انہوں نے استفسار کیا جیسے ماہم کی بات پر انہیں یقین نہ آیا ہو کیونکہ وہ جب سے آئی تھیں ماہم کے جلے کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھیں۔ اچھے بے ترتیب بال، ملجاسا لباس اور اس پر بے ڈول سا جسم دیکھنے میں وہ کہیں سے بھی پرانی ماہم نہیں لگ رہی تھی بس بات کرنے کا انداز اب بھی وہی تھا بلکہ بولنے کی اسپیڈ کسی حد تک برہہ گئی تھی۔ پہلے تو اس کی حالت دیکھ کر شک ہوا کہ کہیں وقاص کے ساتھ جھگڑا نہ ہو گیا ہو مگر اس کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے ایسا کچھ نہیں لگ رہا تھا۔

”ماہم! لگتا ہے تم اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتیں۔“

”وقاص بھی یہی کہتے ہیں مگر آپ خود سوچیں کتنے کام ہوتے ہیں گھر کے۔ فرصت ہی کہاں ملتی ہے اور اب میں کسی ماڈل کی طرح جن ٹھن کر گھر میں تو نہیں رہ سکتی نا۔“ بہت ہی لاپرواہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”پھر بھی بیٹا! انسان کو خود اپنے لیے بھی وقت نکالنا چاہیے۔“

”چھوڑیں پھوپھو! یہ بتائیں مدیحہ کیسی ہے۔ اس کے بارے میں بتائیں۔ مجھے بہت اشتیاق تھا اس سے ملنے کا۔“ اس نے بات ہی بدل دی۔

یہ دیکھ کر ساتھ مسکرا دیں اور اسے مدیحہ کے بارے میں بتانے لگیں۔ اسی اثنا میں ماہم کا گول مٹول سا بیٹا رونے لگا۔

”لگتا ہے اسے بھوک لگی ہے۔ پھوپھو! آپ اسے تھوڑی دیر کے لیے سنبھالیں۔ میں اس کے لیے سیر لیک بنا کر لاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ماہم نے صدمہ کو انہیں پکڑایا اور خود کچن کی جانب چل دی۔

صدمہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ساتھ اسے گود میں اٹھائے ماہم کے پیچھے کچن میں آ گئیں۔ وہاں کی حالت دیکھ کر ساتھ حیران رہ گئیں۔ سنگ گندے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ سلپ پر آنے کے ذرات پھیلے ہوئے تھے۔



ایک جانب انڈے کے چھلکے پڑے تھے۔

”ماہم! یہ برتن رات کے پڑے ہوئے ہیں۔“ سائرہ نے صمد کو اسے پکڑاتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔  
”جی پھوپھو! رات کو میرے سر میں درد تھا۔ اس لیے میں یہ دھونہ سکی۔“ کمال بے نیازی سے جواب دیا گیا۔

”رات تمہارے سر میں درد تھا تو صبح سے تم کیا کر رہی تھیں؟“ یہ سائرہ محض دل میں کہہ سکیں۔  
ڈرائنگ روم میں بھی بہت بے ترتیبی تھی لیکن کچن کی تو حالت زیادہ خراب تھی۔ سائرہ بہت ہی صفائی پسند طبیعت کی مالک تھیں۔ گندگی اور بے ترتیبی ان سے بالکل ہی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے یہ سب دیکھ کر انہیں بہت عجیب لگ رہا تھا۔

”ماہم! تم صمد کو سیریلیک کھلاؤ تب تک میں یہ برتن دھو دیتی ہوں۔“ اس سے رہانہ گیا۔

”ارے پھوپھو! میں یہ بعد میں دھولوں گی۔“ اس کا فی الحال بھی برتنوں کو دھونے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہم باتیں بھی کریں گے اور ساتھ میں کام بھی ہو جائے گا۔“ صمد کو کھلانے کے بعد مارے شرم کے ماہم بھی کچن کی صفائی میں ان کا ساتھ دینے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہاں کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔

ماہم سائرہ کو لے کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ وہاں کی حالت بھی باقی گھر سے مختلف نہیں تھی۔ گیلا تولیہ ابھی تک بیڈ پر پڑا تھا۔ سائرہ کو ماہم پر بے انتہا حیرت ہو رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آج ان لوگوں نے آنا تھا پھر بھی اس نے نہ تو گھر صاف کیا اور نہ ہی خود پر کوئی توجہ دی تھی۔

کھانے کا وقت قریب ہونے کو تھا مگر ماہم کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ سائرہ سے اس بار بھی صبر نہ ہوا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

”وقاص! کچھ کرنا ہے؟“

”نہیں پھوپھو! کچھ تو وہ آفس میں ہی کرتے ہیں لیکن آج میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ کھانا باہر سے

لے آئیں۔ میری پھوپھو آرہی ہیں۔ میں ان کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔“ ماہم ان سے پیار جتاتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔ میرا تو خیال تھا کہ آج میں اپنی بیٹی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاؤں گی۔“

”چلیں پھر کبھی سہی۔ ویسے بھی میرے ہاتھ میں ذائقہ بالکل بھی نہیں۔ شاید اس لیے کہ مجھے کھانا پکانے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ وقاص اکثر باہر سے تیار کھانا ہی لے آتے ہیں۔“ ماہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن پہلے تو تمہیں بے حد شوق تھا کوکنگ کا۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”وہ تو چند دنوں کا شوق تھا جس سے میں جلد ہی بور ہو گئی تھی۔“ ماہم صمد کا ڈانپو بدلتے ہوئے بولی۔  
ساتھ میں اس نے گندہ ڈانپو بیڈ کے ساتھ نیچے کارپٹ پر رکھ دیا۔ آج اپنی ہریات سے ماہم حیران کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

”ماہم! گندہ ڈانپو رکھنے کی یہ جگہ تو نہیں تھی۔“  
”اس وقت میرا اٹھنے کا موڈ نہیں ہے۔ جب کسی کام سے اٹھوں گی تو اسے بھی دیکھ لوں گی۔“ بہت ہی لاپرواہ انداز میں جواب ملا۔ سائرہ یہ سوچ کر رہ گئی کہ کم از کم ہاتھ تو دھولو۔ ساتھ میں انہیں ماہم کے موٹاپے کی طرف مائل جسم کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔  
سارا دن ماہم کے ساتھ گزار کر جب شام کو وہ واپس جا رہی تھیں تو ایک ہی بات ان کے ذہن میں تھی۔

”شکر ہے آج مدیحہ میرے ساتھ نہ آسکی ورنہ وہ دل میں کیا سوچتی کہ یہ ہے وہ ماہم جس کی میں اسے مثالیں دیا کرتی تھی۔“ ایک بار پھر وہ ماہم اور مدیحہ میں موازنہ کرنے لگیں مگر اب ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ ماہم کی محبت جو ان کے دل میں تھی ہرگز کم نہیں ہوئی تھی وہ اب بھی اس سے بے انتہا پیار کرتی تھیں مگر اسے بہونہ بنانے کی جو پھانس اب تک دل میں چبھی ہوئی تھی وہ نکل گئی تھی۔



# وکالیسی ضد

”عید ایک بات کہوں؟“ تھوڑی دیر بعد باتوں کے دوران انہوں نے استفسار نہ انداز میں محبت سے بھرپور لہجے میں کہا مبادا وہ ہمیشہ کی طرح ہتھ سے نہ اکھڑ جائے۔

”جی کیسے۔“ وہ تھکی تھکی بند آنکھوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے بولا۔

”تم جرمنی ہمارے پاس آ جاؤ بیٹا اور ہمیں آ کر اپنا بزنس۔۔۔“ ان کی بات پر اس کی بند آنکھیں یکدم کھل گئیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ ان کی اس بات پر چڑسا گیا تھا تب ہی ان کی بات کاٹ کر تیزی سے گویا ہوا۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کئی بار کہا ہے میں پاکستان میں بالکل ٹھیک ہوں اور میں یہیں رہوں گا۔ اس کے علاوہ میرا بزنس یہاں اچھی طرح Stable ہو چکا ہے اسے میں سب کچھ ختم کر کے جرمنی آ جاؤں یہ کہاں کی عقلمندی ہے اینڈ یونو ویری ویل ماما میں یہاں کس کی وجہ سے ہوں؟“

آخری بات کہتے ہوئے اس کا لہجہ کچھ ٹوٹ سا گیا تھا وہ مزید کچھ نہ بول سکا اور خاموش ہو گیا۔

یقیناً ”ماما کو بھی اس کی کیفیت کا بخوبی علم ہو چکا تھا اسی لیے وہ بھی چپ ہو گئیں پھر چند ثانیہ بعد وہ کمزور سی آواز میں گویا ہوئیں۔

”اس کا کچھ پتا نہیں ہے وہ کہاں ہے پھر بھی تم اسے۔“

”ماما پلیز کلوز دس ٹاپک ناؤ۔ میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔“

”ہیلو۔“ وہ ابھی ابھی آفس سے گھر لوٹا تھا اور گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے لاؤنج کی طرف بڑھ رہا تھا جب وہ اس ہاتھ میں موجود سیل پر ماما کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً ”فون کان سے لگالیا۔“

”کیسے ہو عید؟“ دوسری طرف اس کی آواز سننے ہی ماما نے بے تابی سے اس کی خیریت دریافت کی۔

”ٹھیک ہوں“ آپ کیسی ہیں اور پیلا کابلڈ پریشیول نارمل ہوایا نہیں؟“

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے ہاتھ میں پکڑے کوٹ کو صوفے کی طرف اچھالتے ہوئے پوچھا پھر خود بھی سنگل صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا اور ٹائی کی ٹائڈ ڈھیل کرنے لگا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا اور اللہ کا شکر ہے اب تمہارے پیلا بھی پہلے کی نسبت بہتر ہیں۔ تم سناؤ تم تو ٹھیک ہو نا؟“ ان کے انداز میں خالصتاً ”ماؤں والی فکر نمایاں تھی۔“

”کہا تو ہے میں ٹھیک ہوں پھر بار بار کیوں پوچھ رہی ہیں آپ؟“ پتا نہیں کیوں اس وقت ان کی یہ نشوونما اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”تمہاری ماں ہوں بیٹا اور تم ہم سب سے دور اکیلے ہو تو کیا میں پریشان نہیں ہوں گی؟“ اس کے لہجے سے چھلکتی ناراضی کو وہ با آسانی محسوس کر سکتی تھیں تب ہی نرمی سے بولیں۔

”سوری۔“ جلد ہی اسے اپنے رویے کا احساس ہو گیا تھا سو فوراً ”معذرت کر ڈالی۔“



اس نے اتنا کہہ کر فوراً "کال ڈس کنیکٹ کر دی اور پھر دیکھتے سر کو صوفے کی پشت پر گرا کر آنکھیں موند لیں۔

اسے پاکستان آئے تقریباً "دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان دو سالوں میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا تھا جب وہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر نہ بھٹکا ہو لیکن نتیجہ وہی۔۔۔ خالی نظر اور خالی ہاتھ۔

"صاحب جی کھانا لگا دوں؟" وہ اگلے کئی لمحوں تک صوفے کی پشت پر سر گرائے آنکھیں موندے بے ترتیبی سے ایک ہی پوزیشن میں نیم دراز تھا جب بشیر کی آواز پہ اس نے اسی حالت میں رہتے ہوئے بمشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو اس کے بالکل سامنے مودبانہ انداز میں دونوں ہاتھ آگے کی جانب باندھے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ خالی خالی نظروں سے کچھ دیر وہ بشیر کو تکتا رہا پھر ایک گہرا سانس لیتا سیدھا ہو بیٹھا اور کف لنکس کھولتے ہوئے گویا ہوا۔

"نہیں یار بھوک نہیں ہے مجھے۔ تم ایسا کرو میری گاڑی کی چھلی سیٹ پر ایک فائل رکھی ہوگی وہ لے کر آ جاؤ۔" اس نے ٹیبل پر رکھی گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی جس کو بشیر نے آگے بڑھ کر تھاما اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر صوفے پر پڑا کوٹ اور سنٹرل ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھا کر ست روی سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

\*\*\*

"چائے پیو گے؟" آج صبح سے ہی وہ طبیعت میں عجیب سا بوجھل پن محسوس کر رہا تھا جس کے باعث آفس میں بھی وہ پوری توجہ سے کام نہیں کر رہا تھا اس لیے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر احسن کی طرف چلا آیا کہ شاید طبیعت کچھ بہل جائے لیکن احسن کے ساتھ معمول کی طرح باتیں کرنے کے بجائے وہ بس ہوں

ہاں میں جواب دے جا رہا تھا۔ "نہیں موڈ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کچھ زبان ہی ڈسٹرب دکھائی دے رہے ہو آج رات بھر جاگتے رہے ہو؟" احسن نے نیند کی کمی کے باعث اس کی سرخ پڑتی آنکھوں اور تھکے تھکے سے وجود کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواباً اس نے محض ایک نظر اٹھا کر احسن کو دیکھا پھر دوبارہ ہاتھ میں پکڑے پیپر ویٹ کی جانب متوجہ ہو گیا جس کو وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کے شغل میں مصروف تھا۔

"سیرس آئی نے جو ایڈریس دیا تھا وہاں گئے تھے۔"

اسے مستقل خاموش دیکھ کر احسن نے اگلا سوال کیا جس پر اس نے ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ ٹیبل پر رکھا اور دھیمے مگر یاسیت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"گیا تھا۔"

"کیا ہوا؟"

"دو ماہ پہلے وہ لوگ وہاں سے کہیں اور شفٹ کر گئے ہیں۔" وہ تفکر سے پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

"جواب وہاں رہتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے کہاں شفٹ کیا ہے؟" احسن کمپیوٹر آف کر کے پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

"نہیں۔ انہیں کچھ نہیں پتا۔" اس کے بتانے پر احسن بھی ایک لمحہ کے لیے مایوس سا ہو گیا۔ لیکن اس کی حالت دیکھ کر وہ قدرے عام سے لہجے میں بولا۔

"کوئی بات نہیں یار اور ویسے بھی مہران انکل نے بتایا تھا کہ پچھلے مہینے۔"

"اوکے میں چلتا ہوں۔" وہ احسن کی بات سننے بغیر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"دن منٹ عدید۔" احسن کے روکنے پر وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے یار یوں اچانک کیوں چل پڑے ہو؟"

کوئی بات بری لگی ہے تو بتاؤ۔" احسن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ہے بس دل گھبرا رہا ہے اس لیے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" احسن نے ٹوکا تو وہ ایک لمحہ کے لیے چپ ہو گیا پھر آرزو لہجے میں گویا ہوا۔

"اور کیا کروں احسن، دو سال سے بالکلوں کی طرح پورے شہر کو چھان رہا ہوں لیکن۔۔۔ لیکن کچھ اتا پتا نہیں ہے اس کا جس نے جہاں بتایا ہے وہاں لمحے سے پہلے پہنچ جاتا ہوں مگر خالی ہاتھ ہی گھر لوٹتا ہوں۔

کسی بھی رشتہ دار سے کانٹیکٹ میں نہیں ہے وہ۔ آخر ایسی کون سی جگہ ہے جہاں میں پہنچ ہی نہیں پا رہا ہوں۔" وہ بہت دل گرفتہ دکھائی دے رہا تھا۔ احسن نے تسلی آمیز انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

"تمہاری لگن سچی ہے عدید اور تم دیکھنا ان شاء اللہ اسے ضرور پا لو گے۔" احسن کی بات پر وہ ایک گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

"چلو باہر چلتے ہیں کھانا وانا کھاتے ہیں۔ تھوڑی واک بھی ہو جائے گی کم آن۔" اس کا موڈ بحال کرنے کی خاطر احسن زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر آفس سے باہر لے آیا۔

"تم جرمنی کب جا رہے ہو؟" کھانا کھانے کے دوران احسن نے پوچھا۔

"کل صبح کی فلائیٹ ہے۔" پانی کا گلاس منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے بتایا۔

"ہوں اور واپسی کب ہوگی؟" احسن نے اگلا سوال کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا بٹ مے بی مہینہ لگ جائے۔" اس نے جواب دیا۔

"اتنے دن خیریت تو ہے نا؟" احسن ایک مہینہ کا سن کر حیران ہوا تھا۔

"ہاں خیریت ہی ہے جرمنی تو ماما کے بلانے پر جا رہا

ہوں۔ وہ کئی دنوں سے مسلسل فون کر رہی تھیں اور جرمنی آنے پر اصرار کر رہی تھیں سو میں نے سوچا ان سے مل کر واپسی میں آسٹریلیا بھی چلا جاؤں گا وہاں سے کال آ رہی ہے دو ہفتے بعد میٹنگ ہے تب تک ماما پاپا کے ساتھ وقت گزار لوں گا۔ بس دعا کرنا یا رہ وہ انٹرنیشنل کمپنی آرڈر پاس کر دے۔"

وہ کھانا کھا کر فارغ ہو چکا تھا اور اب احسن کو اپنی فیکسٹ پلاننگ سے آگاہ کر رہا تھا۔ پہلے کی نسبت وہ اب کافی حد تک ریلیکس دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاں بالکل یار۔ اللہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا ان شاء اللہ۔"

بل پے کرتے ہوئے احسن نے صدق دل سے دعائیہ انداز میں کہا تو وہ ممنون نظروں سے احسن کو دیکھنے لگا۔ جو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ تھا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے احسن نے اسے گھر ڈراپ کر دیا۔

احسن اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا تب ہی اس کی اداسی اور پریشانی کو بھانپ کر اسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا اور آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ احسن اپنی اس کوشش میں اکثر ہی کامیاب بھی ہو جاتا تھا جیسے آج ہوا تھا۔



وہ جب بھی اس کو تلاش کرنے کے بعد تنہا گھر لوٹا تھا تو دونوں تک اپنے ٹوٹے دل اور وجود کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش میں ہلکان رہتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب سے وہ سیرس آئی کے بتائے ایڈریس پر گیا تھا اور وہاں سے بھی کوئی نشان نہ پا کر واپس آیا تھا دل عجیب سی کیفیت میں گھر گیا تھا۔

لیکن اب وہ پہلے کی نسبت خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں احسن کا شکریہ ادا کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا جو اسے مایوسی کی حد پر جانے سے پہلے واپس لے آتا تھا۔



ہمیشہ کی طرح گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے آج بھی وہ ارادی و غیر ارادی طور پر سڑک کے دائیں بائیں جانب دیکھ رہا تھا۔ اس امید پر کہ کہیں بالکل اچانک روڈ کراس کرتے ہوئے ٹشاپنگ مال سے ٹکلتے ہوئے یا پھر ٹریفک سگنل پر رکتی ٹیکسی میں سے کسی ایک میں بیٹھی وہ اسے نظر آجائے۔ لیکن ان دو سالوں میں ایک بار بھی وہ اسے دکھائی نہیں دی تھی۔

”کاش ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار وہ اسے مل جائے پھر چاہے اپنا آپ گنا کر بھی اسے پانا پڑا تو وہ گریز ہرگز نہیں کرے گا۔ اس کے بغیر تو اسے اپنا وجود پے بھی بہت بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ ایک اس کی تلاش ہی تھی جو اسے جینے اور سانس لینے پر مجبور کیے ہوئے تھی وگرنہ۔“

آفس آچکا تھا۔ سوچوں میں گم کب آفس آیا اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس نے فوراً گاڑی کو بریک لگایا اور دند اسکرین سے دکھائی دینے والے اپنے آفس کی بلڈنگ پر ایک نظر دوڑائی۔ کتنی محنت اور لگن کے بعد وہ شہر کے اس مصروف ترین ایریا میں اپنا آفس اور ملک بھر میں بزنس اسٹیبلشمنٹ کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ یہ وہی جانتا تھا لیکن جس کے لیے اس نے یہ سب کچھ پایا تھا اسے ہی کھو چکا تھا۔

”نہیں میں نے اسے نہیں کھویا۔ وہ میرے پاس ہے اور رہے گی جیسے ہمیشہ سے تھی۔“

اس نے اپنے خیال کی سختی سے نفی کی۔ اسے کھونے کے احساس کو وہ اپنے اندر کہیں محسوس کرنا ہی نہیں چاہتا تھا سو جلدی سے اپنی سوچ کو رد کرتا فرنٹ سیٹ کی بیک پر رکھا اپنا کوٹ اٹھائے گاڑی سے باہر نکل آیا اور گاڑی لاک کر کے ڈرائیونگ ایریا کو کراس کرتا بلڈنگ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ لفٹ کے ذریعے تھرڈ فلور پر پہنچتے ہی اس نے بائیں ہاتھ میں بندھی رسٹو لانچ پر نگاہ دوڑائی۔ صبح کے آٹھ بجے تھے۔

وہ شروع سے ہی بہت ہنکچو سٹل تھا اسی لیے ٹائم پر آفس پہنچنا اس کی عادت میں شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا پورا اسٹاف آن دا ٹائم آفس میں موجود ہوتا تھا۔ آگے کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے دائیں بازو پر رکھا کوٹ پہنا اور ٹالی کی ناٹ کو درست کرتا چند قدم کے فاصلے پر موجود اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ ”گڈ مارننگ سر۔“ جیسے ہی اس نے اپنے شاندار آفس میں قدم رکھا۔ دائیں اور بائیں جانب بنے کیبن میں کام کرتے ورکرز ایک دم حرکت میں آچکے تھے اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر اسے سلام کرنے لگے۔ ایک سیکنڈ کے لیے اس نے آفس میں موجود تمام لوگوں پر ایک طائرانہ سی نظر دوڑائی پھر مضبوط قدموں سے چلتا ہوا براعتماد انداز میں سر کے اشارے سے سب کے سلام کے جواب دیتا اپنے روم کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظروائیں جانب روم میں بنے کیبن میں سے ایک کیبن پر جا پڑی۔ بے ساختہ اس کے قدم زمین پر جم گئے تھے وہ محض لمحے بھر کو ہی اسے دیکھ پایا تھا اور اس ایک لمحے میں جتنی بار اس کا دل زور زور سے دھڑک سکتا تھا دھڑک اٹھا تھا۔ اسٹاف کی موجودگی کا احساس شدت سے غالب آچکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس پر دوسری نظر ڈالے بغیر اسی رفتار اور پروقار انداز سے چلتا ہوا اپنے روم کا ڈور کھول کر اندر چلا آیا۔

دروازہ بند کر کے وہ کئی ثانیے تک دروازہ کے ساتھ ہاتھ رکھا اور اس ایک لمحے کو سوچنے لگا۔ اس نے صرف چند قدموں کے فاصلے پر اسے اب سے چند منٹ پہلے دیکھا ہے خود کو یہ یقین دلانا اسے بہت دشوار رہا تھا۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ خوب صورت حقیقت۔

بے ترتیب سانسوں اور سرشار وجود کو بمشکل سنبھالے وہ اپنی چیئر کی طرف بڑھ گیا اور کوٹ اتار کر بیٹ کی بیک پر پھیلا دیا۔ پھر خوشی سے بھرپور انداز میں چیئر پر بیٹھ گیا۔ دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکائے نظریں ایک نقطہ پر مرکوز کیے نہ جانے کتنی دیر تک وہ اس بل کو سوچتا اور محسوس کرتا رہا جب بالکل اچانک اس نے اسے دیکھا تھا۔ اسے اپنے بدن میں رواں خون تیزی سے دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے ابھی اور اسی وقت اپنے سامنے لا کھڑا کرے اور خود پر گزری اذیت کا احوال اسے کہہ سنائے لیکن ابھی یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ جانتا تھا اس کی شکایت اور ناراضی کو ایک دم دور نہیں کیا جاسکتا سوار اوہ ملوثی کر دیا۔ وہ اس سے بے حد خفا تھی اس کا اندازہ اسے تھوڑی دیر پہلے اس کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی ہو چکا تھا۔ بہر حال کچھ بھی تھا اس کی روح کو تو جیسے اب قرار سا مل گیا تھا۔ سو جتن کر کے بھی اسے منانا پڑتا تو ہرگز پیچھے نہیں ہٹتا کہ اب وہ اسے خود سے دور کرنے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ جو دو برسوں سے یہاں سے وہاں اسے ڈھونڈ رہا تھا تو اس کے بے حد قریب تھی اس کے اپنے آفس میں۔ یہ احساس کس قدر خوشگوار تھا یہ تو وہی جانتا تھا۔

اس نے طمانیت بھرا سانس اپنے اندر اتارا اور بیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے سوچنے لگا۔ سکرپٹ تھی کہ خود بخود اس کے چہرے پر ہنسی جا رہی تھی۔ اپنی یہ کیفیت اسے بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔



”ہو سکتا ہے تسمینہ آئی نے اس کی شادی کردی ہو اللہ نہ کرے۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو کیا کرو گے؟“ چند دن پہلے کہے گئے احسن کے لفظوں کی بازگشت نے اس کے ہلکے پھلکے ہوتے وجود کو یکدم بوجھ تلے دبا ڈالا تھا۔

جس وقت احسن نے یہ بات کی تھی تب بھی وہ اندر تک لرز اٹھا تھا اور اب تھوڑی دیر پہلے والا اطمینان اور اندر تک اترتی سرشاری کہیں معدوم ہو چکی تھی۔ لمحے بھر میں وہ حد درجہ پریشان اور مضطرب ہو کر رہ گیا تھا۔

اضطراب کے عالم میں وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے یہاں سے وہاں چلنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کیسے اس کے بارے میں معلوم کر لے؟ ”مے آئی کم ان سر؟“ اسی اثناء میں پینتالیس سالہ توقیر صاحب دروازے پر دستک دے کر اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

تو وہ خود کو سنبھالتا دوبارہ اپنی چیئر پر جا بیٹھا۔ ”یس کم ان توقیر صاحب۔“ وہ کل رات ہی آسٹریلیا کے ٹور سے واپس آیا تھا اور اب توقیر صاحب اسے آفس سے متعلق گزشتہ ایک ماہ کے دوران ہونے والی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے جن کو وہ غائب دماغی سے سن رہا تھا۔

”اس کے علاوہ آپ کی غیر موجودگی میں میں نے دو ایمپلائز کو کمپیوٹر سیکشن کے لیے اپائنٹ کیا تھا۔ ان میں سے ایک جبران خان ہیں جبکہ دوسری ایمپلائے ماہین عزیز ہیں اور فیکٹری کے۔“

”دونوں ایمپلائز کا ڈیٹا ہے آپ کے پاس؟“ ماہین عزیز کے نام پر اس نے یکدم چونک کر سامنے بیٹھے توقیر صاحب کو دیکھا جو فائل میں درج تمام پوائنٹ کو باری باری پڑھ کر سن رہے تھے۔

”یس آف کورس سر۔“ توقیر صاحب نے خاصے اعتماد انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ مجھے ان کا ڈیٹا بھیجوا دیجئے میں ان

ایمپلائز کے بورڈنگ ریکارڈز کو چیک آؤٹ کرنا چاہتا ہوں۔ باقی تفصیل میں آپ سے بعد میں معلوم کر لوں گا۔“

اپنے چہرے کے تاثرات اور اندرونی حالت کو بمشکل چھپاتے ہوئے عام سے انداز میں کہا پھر ٹیبل پر رکھے اپنے لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ توقیر صاحب اٹھ کر جا چکے تھے جبکہ وہ اضطراری کیفیت میں چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے توقیر صاحب کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ توقیر صاحب ہاتھ میں دونوں ڈیٹا فائلز اٹھائے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تو اس نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ہاتھ بردھا کر فائلز تھام لیں۔

”تھنک یو توقیر صاحب۔“ وہ اتنا کہہ کر ماہین عزیز کی ڈیٹا فائل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ توقیر صاحب جا چکے تھے۔

”میں ایم سی ایس کر کے رہوں گی، دیکھ لینا۔“ کو الیفیکیشن پروفائل میں درج ماہین عزیز کی کو الیفیکیشن پر نظر پڑتے ہی اس کے کانوں میں اس کی یقین سے بھرپور آواز سنائی دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شروع سے ہی کمپیوٹر میں انٹرٹسڈ تھی اور اسی لیے ایم سی ایس کرنا چاہتی تھی لیکن پھو بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ایم سی ایس کرے کیونکہ وہ تو پہلے ہی اس کی کمپیوٹر میں حد درجہ دلچسپی سے خائف رہتی تھیں۔ اگر وہ ایم سی ایس کرنے کا ارادہ کرتی تو یقیناً اس کی صورت کسی کو بھی دیکھنے کو نہ مل پاتی۔ لیکن وہ ماہین ہی کیا جو کہہ کر پیچھے ہٹ جاتی۔

اس کے ارادے کی مضبوطی پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر وہ انتہائی غلٹ میں مطلوبہ پروفائل پر پہنچا۔ پرسنل پروفائل میں موجود Marital Status (ازدواجی درجہ) پر اس کی نظر ٹھہری گئی تھی۔ نہ جانے آگے کیا لکھا ہو گا؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ آگے پڑھنے کی سکت وہ خود میں ہرگز پیدا نہیں کر پاتا

تھا۔ اگر۔۔۔ اگر وہ میرٹھ ہوئی تو۔۔۔؟ ”نہیں، نہیں۔“ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے غیر ارادی طور پر ڈیٹا فائل بند کی اور تیز چلتی سانسوں کی رفتار کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”وہ صرف میری تھی اور میری ہی ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں خود سے مخاطب ہوا۔ پھر ٹیبل پر رکھی ماہین عزیز کی فائل کو اٹھا کر دیکھنے لگا اور اس بار بھی اس کا دل انجانے خدشے کے تحت زور سے دھڑک اٹھا تھا لیکن کبھی تو یہ عقدہ کھلتا تھا تو پھر ابھی کیوں نہیں؟

یہی سوچ کر اس نے فائل کے صفحے پلٹنے شروع کر دیے اور کو الیفیکیشن پروفائل پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ Marital Status کی لائن میں Unmarried کا لفظ پڑھتے ہی گویا اس کا دل اپنی جگہ پر آ رہا تھا اور بے ترتیب سانسوں کو یکدم قرار سا مل گیا تھا۔

اس نے انتہائی اطمینان بھر سانس اپنے اندر اتارا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے فائل بند کر کے ٹیبل پر رکھا پھر دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے چیئر سے مطمئن انداز میں ٹیک لگائے اسے سوچنے لگا جس کو وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر پایا تھا اب اچانک اسے اپنے سامنے دیکھنے کی خواہش اس کے سینے میں مچلنے لگی تھی۔

وہ بے تابی سے سیدھا ہو بیٹھا اور اس سے ملنے، اس سے باتیں کرنے اور اسے جی بھر کر دیکھنے کا طریقہ سوچنے لگا۔

”مس کرن ابھی پورے اسٹاف کو میٹنگ روم میں کلیکٹ کیجیے ایک آرجنٹ میٹنگ کرنی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ سوچ کر انٹرکام پر اسٹنٹ کو ہدایت دی پھر اس کی فائل اٹھا کر پیپر پر لکھے اس کے نام کو محبت سے نکتے لگا۔

”ماہین عزیز۔“ اگلے دس منٹ بعد جس وقت وہ میٹنگ روم میں داخل ہوا لمبی میز کے آگے سامنے رکھی چیئر پر کمپنی کا پورا اسٹاف براجمان اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو میٹنگ روم میں داخل ہوتے

دیکھ کر سب یک لخت اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”پلیز سیٹ۔“ وہ سائیڈ پر رکھے ڈائس کی طرف بڑھتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا تو اس کے ڈائس پر پہنچتے ہی سب اس کی پرمیشن پر اپنی اپنی چیئر پر بیٹھ گئے۔

”آپ سب کو اچانک کال کرنے کا مقصد آپ کو انفارم کرنا تھا کہ آسٹریلیا کی جس کمپنی سے ہماری کمپنی کا دو سالہ معاہدہ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔“ وہ بڑی روانی سے انگلش لب و لہجے میں باری باری سب کی جانب دیکھتے ہوئے مخاطب تھا۔ جبکہ اس کے بتانے پر سب کے چہروں پر خوشی پھیل گئی اور اس سمیت سب ایک دوسرے کو اتنی بڑی کامیابی پر مبارکباد دینے لگے۔ اس دوران اس نے اپنے بائیں رو میں تیسری سیٹ پر بیٹھی ماہین عزیز کو بڑی محتاط نظروں سے دیکھا جو ٹیبل پر رکھے پیپر پر توجہ مرکوز کیے گرد و پیش سے لاتعلقی سی بیٹھی تھی۔

ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد دوسری نظر اس نے پورے اسٹاف پر دوڑائی پھر دوبارہ اپنے سابقہ انداز میں گویا ہوا تو پورا اسٹاف اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مجھے آپ کی محنت اور کمپنی سے آپ کی محبت آپ کے بہترین کام کی صورت میں نظر آ جاتی ہے لیکن اس بار میں اگر ان دونوں چیزوں پر زور دے رہا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا کی کمپنی سے ہونے والا ہماری کمپنی کا یہ پہلا کانٹریکٹ ہے۔ فرسٹ ایمپیریشن از دالاسٹ ایمپیریشن سو میری آپ سب سے بہت زیادہ توقعات ہیں جن پر آپ کا پورا اترنا میرے لیے اور کمپنی کے لیے نہایت اہم اور فائدہ مند ہے۔“

پندرہ منٹ کی اسپیچ دینے کے بعد اب وہ اپنی چیئر پر آ بیٹھا تھا۔

بے اختیار اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ فوراً نظریں جھکا گئی۔

”ماہین عزیز آئی وائٹ ٹوٹیک یور انٹرڈکشن اینڈ



یوراپہنیں لباؤٹ آر کمپنی پلیز۔“ (میں آپ کا تعارف اور کمپنی کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔)

اس کے مخاطب کرنے بروہ لحوہ کی تاخیر کے بغیر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نہایت مطمئن انداز میں چلتی ہوئی اس کی چیئر کے بائیں جانب رکھے ڈائس پر جا کھڑی ہوئی اور دھیمے مگر پر اعتماد انداز میں اپنا انٹرویویشن کرانے لگی۔

بولتے بولتے اس نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی جو اپنی ریوالونگ چیئر کا ہلکا سا رخ اس کی جانب موڑے دائیں ہاتھ کی کنسی ٹیبل پر ٹکائے بند مٹھی کو ٹھوڑی کے نیچے رکھے اس کے چہرے پر نظریں جمائے انتہائی وارفتگی سے اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔ اسے یوں مسلسل اپنی جانب کھٹاکر

ایک لمحہ کے لیے اسے اپنی آواز میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی مگر جلد ہی اس نے اس پر قابو پاتے ہوئے انٹرویویشن کھلیٹ کیا اور دوبارہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تو اس نے فوراً ”میننگ اور کردی۔“

”ماہین عزیز۔“ ایک ایک کر کے سب روم سے باہر نکل رہے تھے جب اس نے اسے پکارا۔

اس کی آواز پر بے اختیار اس کے قدم اپنی جگہ پر جم سے گئے تھے۔ چند ثانیے بعد اس نے پلٹ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا جو ٹیبل پر رکھی فائل پر سائن کرنے میں مصروف تھا۔ اسی لمحے اس نے فائل بند کی اور سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی پھر چیئر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔

”کیسی ہو؟“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں اس کی خیریت دریافت کی۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اس نے مختصر جواب دیا۔

”تمہیں یہاں اس طرح اچانک دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں۔“

سامنے مجھے کنفیوز کرنے کی کوشش نہ کرتے۔“ اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولی تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں تمہیں کنفیوز کیوں کروں گا بھلا میں تو جسٹ آفیشل فارملٹی پوری کر رہا تھا کیونکہ۔“

”ڈائس پر کھڑے شخص کو مسلسل دیکھتے رہنا تمہاری کون سی فارملٹی میں شامل ہے مسٹر عزیز مہراں۔“

ایک بار پھر اس کی بات پوری سنے بغیر وہ قدرے طنزیہ لہجے میں بولی۔ تو وہ اس کی بات پر یکدم اٹھ آنے والی مسکراہٹ کو نہ دبا سکا اور خاموش ہو گیا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”تمہیں دیکھنے کا اور دیکھتے رہنے کا اختیار تو ہم کیا خود میں بھی اپنے آپ سے نہیں چھین سکتے۔ کیونکہ تمہیں نہ دیکھوں تو سانس رک رک کر آنے لگتا ہے میرا۔“

”نہ جانے اس کے دھیمے لہجے میں کیا بات تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے کچھ بھی نہ کہہ پائی پھر خامے چہنے والے انداز میں بولی۔

”جن کو دیکھے بغیر سانس رک رک کر آنے لگتا ہے نا ان سے اتنا عرصہ دور نہیں رہا جاتا۔ مائنڈ اٹ۔“ اتنا کہہ کر کہ وہ جانے کے لیے آگے کی جانب بڑھ رہی تھی جب وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو وہ یکدم رک گئی اور ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا۔

”پانچ سال تم سے دور رہا ہوں تو وہ صرف تمہاری وجہ سے۔ تمہاری مرضی کے مطابق کیا جو بھی کیا۔ کیونکہ تم ہم تو میری شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہی کہا تھا نا تم نے مجھ سے تو ایسے میں کیا کرتائیں کہاں جاتا میرا تو ہر راستہ تمہاری طرف ہی جاتا تھا اور تم نے میرے لیے تمام راستے بند کر ڈالے تھے۔ تم سے دور میں نہیں ہوا تھا بلکہ بلکہ تم نے مجھے خود سے دور کر دیا تھا۔“ وہ ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا جبکہ لہجے میں دکھ نہیں تھا۔

”میں نے کہا تھا تمہیں دور رہو اور تم ہو گئے تھے تو کیا پر ابلم ہے کیوں بات کر رہے ہو مجھ سے اس باپ پر دور کیا تھا نا تو دور ہی رہو۔“

وہ قطعی انداز میں کہہ کر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

اسے اس کے سخت رویے کی توقع تھی اس کے وجود اس کے الفاظ نے بے حد تکلیف پہنچائی تھی۔

گلے کئی لمحوں تک وہ اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا پھر اس کی قدم اٹھاتا اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔

”ماہین۔“ جب سے وہ آفس سے آئی تھی کچھ بپ چپ سی تھی۔ کسی سے بھی زیادہ بات نہیں کر رہی تھی اور اب پچھلے آدھے گھنٹے سے ٹیبل پر رکھے کھانے کو کھانے سے زیادہ غور سے دیکھنے پر اکتفا کر رہی تھی جب فاطمہ بجو کی آواز پر اس نے چونک کر سامنے کی جانب دیکھا۔ فاطمہ بجو زین کے لیے چولے پر رکھے گرم دودھ کو گلاس میں اندیل رہی تھیں۔

”جی۔“ اس نے ہاتھ میں لیا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے جب سے آفس سے آئی ہو کھوئی کھوئی سی ہو خیریت تو ہے نا۔“ بجو نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل خیریت ہے بجو آپ پریشان مت ہوں۔“ وہ مسکرا کر کہتی دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”پریشان کیسے نہ ہوں پہلے تم آفس سے آنے کے بعد ایک ایک گھنٹہ زن اور پانی کے ساتھ کھیلتی تھیں اسی سے ڈھیروں باتیں کرتی تھیں لیکن آج ہاف ڈے تھا اس کے باوجود تم۔“

کو دیکھ کر کہا۔ ان کی بات سن کر وہ محض مسکرا کر رہ گئی۔

”تم ایسا کرو تھوڑی دیر ریسٹ کر لو شام کو فریش اٹھو گی۔ ٹھیک ہے؟“

انہوں نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے یہ کیا پہلے کھانا تو مکمل کر لو۔“ اسے ہاتھ میں لیے نوالے کو پلیٹ میں رکھتے دیکھ کر انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”نہیں بجو مجھے بھوک نہیں ہے اتنا بھی میں نے بہت مشکل سے کھایا ہے۔ رات کو نل ڈنر کر لوں گی آپ کے ساتھ آؤں گے؟“

اس نے منانے والے انداز میں ان کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ چپ ہو گئیں۔

”اچھا تم اپنے کمرے میں جاؤ میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“ ان کے کہنے پر وہ خاموشی سے کچن سے باہر نکل آئی اور اپنے کمرے میں آکر ریڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

جب سے اس کا سامنا عدید سے ہوا تھا وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو کر رہ گئی تھی۔ اتنے برسوں بعد اچانک اسے دیکھ کر ایک دم سے وہ سب یاد آنے لگا تھا جس کو وہ کب سے بھلانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر لگا کہ وہ تو کچھ بھی بھول نہیں پائی تھی۔ سب کچھ پہلے دن کی طرح اس کے ذہن کے خاکے پہ نقش تھا۔

عدید مہراں کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے اسکرین کی مانند چل رہا تھا۔ کس قدر خوب صورت تھے وہ دن جب وہ اس کے ساتھ تھا اور صرف اس کا تھا لیکن پھر نہ جانے ایسا کیا ہوا تھا جس کے باعث وہ اس سے اتنی دور چلا گیا تھا کہ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ پڑمرہ قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں موجود واحد کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی اور آسمان کو تنگے لگی۔



”ماہین کہاں ہو تم میں کب سے تمہارا نمبر ٹرائی کر رہی ہوں لیکن تم ہو کہ نہ جانے کن خیالوں میں گم ہو۔ میرا فون ہی ریسو نہیں کر رہی۔“

وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ آسمان پر نظریں جمائے ڈھلتی شام اور فضا میں پرندوں کی بچتی پازیب کو سننے میں محو تھی جب سویرا کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر سویرا کی جانب دیکھا جو ہاتھ میں پکڑی چائے کی ٹرے کو ٹیبل پر رکھ رہی تھی جو بچو نے اسے تھما دی تھی۔

”نہیں ہوں اور مجھے کہاں ہونا ہے؟“ وہ سویرا کی طرف بدھتے یاسیت سے مسکرا کر بولی پھر اس کے گلے لگ گئی۔

”کیا ہوا سب ٹھیک تو ہے نا؟“ اسے یوں اپنے گلے لگتے دیکھ کر سویرا تشویش سے بولی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت پریشانی میں بے اختیار اس کے گلے لگ جاتی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ سویرا سے الگ ہوتے ہوئے بمشکل مسکرا کر بولی۔

”لیکن مجھے تو لگ رہا ہے کہ کچھ ہے جو ٹھیک نہیں ہے۔“ سویرا نے جاچتی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم بیٹھو نا چائے پیو۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور ایک مک سویرا کی طرف برہا دیا جس کو اس نے خاموشی سے تمام لیا۔

”اب تم مجھے بتاؤ گی کہ کیا ہوا ہے تم ٹینس کیوں ہو؟“

وہ چائے کے گھونٹ اپنے حلق میں اتار رہی تھی جب سویرا کو کھدبہ ہونے لگی۔ اس نے مک ٹیبل پر رکھ دیا اور پھر دن بھر کی روداد اسے سنا ڈالی۔ جس پر سویرا حیرت سے اس کو تنگ لگی۔

”دہاٹ۔“ سویرا بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یومین تم نے ابھی ایک ماہ پہلے جس کمپنی کو جوائن کیا ہے اس کو عدید مہران اون کر رہا ہے۔“ سویرا نے استفسار نہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تو اس نے

اثبات میں سر ہلادیا۔

”ہاں اور مجھے یہ بات آج معلوم ہوئی ہے وہ پچھلے ایک مہینے سے آؤٹ آف کنٹری تھا اور اس کی غیر موجودگی میں تو قیر صاحب جو کہ کمپنی کے ایم ڈی ہیں وہی سب دیکھ رہے تھے۔ مجھے اسی لیے یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کہ کمپنی کا اوپر کون ہے اور کہاں ہوتا ہے؟ اب جب مجھے پتا چل گیا ہے تو میں۔۔۔ یہ جاب چھوڑ دوں گی۔“

”وائے تم تم ایسا کیوں کرو گی ماہین۔“ اس کا رازہ جان کر سویرا نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ جو قدرے لاپرواہی سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر لگی کیونکہ اس کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس وقت پورے گھر کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اگر تم ہی جاب چھوڑ کر گھر پر بیٹھ جاؤ گی تو تمام گھر والوں کا کیا ہو گا۔ آئی فاطمہ بچوان کے بچے اور مریم۔ سب تم پر ڈھینڈھ کرتے ہیں اور تم ہو کہ۔۔۔“

”تو میں کون سا اپنی ذمہ داریوں سے انکار کر رہی ہوں۔ میں تو اس جاب کو چھوڑنے کی بات کر رہی ہوں کیونکہ۔۔۔“

”کیونکہ کیا؟“ سویرا ایک بار پھر تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بحث کرنے والے انداز میں بولی۔

”کیونکہ جس کمپنی میں تم جاب کر رہی ہو اس کو عدید مہران اون کر رہا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا ریزن ہے تمہارے پاس اتنی اچھی جاب چھوڑنے کا تو بتاؤ۔“ سویرا کی بات سن کر وہ ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

”تم مجھے نہیں سمجھ سکتی سویرا۔“

”ہاں تمہاری بے وقوفیوں کو میں واقعی نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن یاد رکھنا یہ جاب چھوڑ کر تم بہت بڑی غلطی کرو گی۔ تمہیں پتا ہے نا کتنی مشکل اور تنگ دود کے بعد تمہیں یہ جاب ملی تھی اب اتنی آسانی سے اس کو چھوڑنا غلط فہمی نہیں ہے ماہین۔“ اسے چپ دیکھ کر سویرا نے قدرے نرمی سے اسے سمجھایا۔ جواب ابھی

بھی سی لگ رہی تھی۔

”تمہارا پر اہم کیا ہے؟“ اسے تذبذب کا شکار ہوتے دیکھ کر سویرا نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا تو اس نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا پھر آنکھوں میں آنی کی کو ایک ہاتھ کی بند سے صاف کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”تم جانتی تو ہو میں اسے ہر روز فیس نہیں کر سکتی۔ میں۔۔۔ میں اپنا بھرم نہیں کھونا چاہتی اس کے سامنے۔“

”بی بیو ماہین۔ وہ وہی عدید مہران ہے جس کی موجودگی تمہیں Protect کرتی تھی۔“ سویرا نے پار سے اس کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ پرے کر دیے اور تیزی سے گویا ہوئی۔

”وہ وہی عدید مہران ہی تو نہیں ہے سویرا جی تو اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ جس طرح اس نے میرا مان توڑا ہے میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ مجھے اس وقت بالکل تنہا۔۔۔ چھوڑ کر چلا گیا وہ جب مجھے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن اب کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے اس کی۔“

آخری بات کہتے ہوئے اس نے سختی سے آنکھوں میں آئے آنسو۔۔۔ رگڑ کر صاف کیے اور خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کی یہ کنڈیشن دیکھ کر سویرا فوراً ”کچھ بھی نہ بول سکی پھر تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد سمجھانے والے انداز میں قدرے نرمی سے گویا ہوئی۔

”آئی انڈر اسٹینڈ ماہین۔ لیکن میں پھر بھی تمہیں یہ مشورہ دوں گی کہ اس وقت ان سب باتوں سے ہٹ کر صرف اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بالفرض تم یہ جاب چھوڑ بھی دیتی ہو تو کیا گارنٹی ہے کہ تمہیں اگلے ہی دن اچھی سی جاب مل جائے گی۔ ایسے میں گھر کا کرایہ، گھر کا خرچ، بچوں کی اسکول فیس اور مریم کی شادی یہ سب کس طرح باہل ہے پلیز سوچنا ضرور اس بارے میں۔ تم بھول

جاؤ کہ تم کہاں جاب کر رہی ہو اوکے؟“ سویرا کی بات سن کر وہ چپ ہو گئی تھی۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ پچھلے کئی ماہ اس کے گھر والوں نے جتنی تکلیف میں گزارے تھے اس کا احساس اب بھی باقی تھا۔ جبکہ اس جاب کی سیلری اتنی اچھی تھی کہ ایک ماہ میں ہی بہت سی ضروریات پوری ہو گئی تھیں۔ بچوں کی اسکول فیس سے لے کر امی کی دوائیاں اور مریم کے لیے بھی وہ تھوڑا بہت پس انداز کر چکی تھی۔

”اچھا میں اب چلتی ہوں ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔“

سویرا اسے سوچتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی تو وہ اپنے آپ میں الجھ کر رہ گئی۔

کیا کرے کیا نہ کرے کی پوزیشن میں وہ کافی دیر تک ایک ہی جگہ پر بیٹھی رہی۔ سویرا کی باتوں نے اسے شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی تو سر جھٹک کر بیڈ پر آ لی۔

”خالہ جانی۔“ وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطیاں تھی جب چھ سالہ ہالی اور چار سالہ زین اسے پکارتے ہوئے اس کے پاس بیڈ پر آ بیٹھے تو وہ فوراً ”ان کی جانب متوجہ ہو گئی اور انہیں اپنے قریب بٹھالیا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ تھوڑی دیر پہلے والی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔ ان کی معصوم سی باتوں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”خالہ جانی آپ میرے لیے ایروپلین امانیں گی نا۔“

”اور میرے لیے باربی۔“ اچانک باتوں کے دوران زین اور ہالی باری باری اپنی فرمائشیں سنانے لگے تو وہ بے اختیار ان کے گالوں پر پیار کرنے لگی۔

”جی ہاں ضرور لاؤں گی میری جان۔“

”ماہین امی کی میڈیسن لیتی آنا کل آفس سے واپسی پر۔“ اسی وقت بجو کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کی طرف نسخہ برہایا اور مزید گویا ہوئیں۔

”ماہین تم ان کی فضول فرمائشوں پر ذرا کلن مت دھرا کرو ان کا بس چلے تو یہ۔۔۔“



”اونہہ بجو“ ایسی باتیں مست کیا کریں پلیزان کی چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں پوری کر کے مجھے جتنی خوشی ملتی ہے اس کا آپ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتیں۔“ اس نے ان کی پوری بات سنے بغیر جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے میں ان دونوں کے لیے جھلکتی محبت کو وہ با آسانی محسوس کر سکتی تھیں لیکن آئے دن کی فرمائشوں کے باعث وہ اسے اکثر منع کرتی تھیں پر اس بارے میں وہ ان کی ایک نہیں سنتی تھی۔

”میں اس لیے کہتی ہوں ماہین کس۔“  
”جی نہیں آپ کچھ نہیں کہیں گی یہ بتائیں موم کے سرال والے کب آرہے ہیں کھانے پر؟“ اس نے بات کا سرخ پلٹ دیا۔

”اسی جمعہ کو آرہے ہیں میں نے چیزوں کی لسٹ بنا دی ہے صبح یاد سے لیتی چانا۔ میں چاہ رہی ہوں جمعہ آنے میں ابھی تین دن باقی ہیں تو کچھ تیاری پہلے سے ہی مکمل کر لوں تاکہ وقت پر کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ آخر کو وہ لوگ پہلی بار آرہے ہیں۔ سب کچھ بہت اچھا ہونا چاہیے نا۔“ جب سے موم کی بات پکی ہوئی تھی اسی اور بجو بے حد خوش تھیں۔ رضوان ہر لحاظ سے موم کے لیے بہترین لڑکا تھا۔ اسی اور بجو دونوں جلد سے جلد موم کی شادی کی خواہش مند تھیں۔ بجو کے چہرے سے چھلکتی خوشی کو دیکھ کر وہ اندر تک سرشار ہو گئی تھی۔

”آپ بالکل فکر نہ کریں بجوان شاء اللہ سب کچھ بہت اچھا بنی ہوگا۔ آپ مجھے وہ لسٹ دے دیجیے گا میں سارا سامان لے آؤں گی۔“ وہ انہیں تسلی دینے والے انداز میں بولی تو بجو محبت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

”اللہ تمہیں بہت خوش رکھے۔ میں سوچتی ہوں اگر تم نہ ہوتیں تو ہمارا کیا بنتا، کتنا مشکل ہو جاتا نا وقت گزارنا؟“ بجو ابدیدہ ہو رہی تھیں۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔

”بجو پلیز ایسا مت کہیں۔ اگر آج ہم خود کو اچھے طریقے سے اسٹبلش کر پائے ہیں تو اس میں صرف

میرا ہی نہیں ہم سب کا ہاتھ ہے۔ میں وہ وقت نہیں بھولی جب آپ محض چند سو روپوں کی خاطر اسکول چھوڑ کر گئی تھیں جس کی پر پیل اتنی سخت تھیں اس وقت اگر میری انجکشن کیپیٹ ہوئی تو میں کبھی بھی آپ کو وہ جاب کرنے نہ دیتی۔“

”تو اب کون سا کرنے دیتی ہو؟“ بجو نے شکایتی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں کرنے دوں۔ میں ہوں نا پھر کیا ضرورت ہے کسی کو کچھ کرنے کی۔“ اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو بجو دھیرے سے مسکرا دیں۔

وہ جانتی تھیں کہ وہ انہیں جاب کیوں نہیں کرنے دیتی۔ ان کی کمر میں مسلسل رہنے والے درونے جہاں انہیں ادھ مو کر ڈالا تھا وہیں اسے بھی اپنی ذمہ داریوں سے باور کرا دیا تھا ورنہ انہی تو وہ نہ جانے کیا کیا رہنا چاہتی تھی لیکن بدلتے حالات نے اس کے اندر نیتے سارے خوابوں کو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور کر ڈالا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہیں بجو؟“ اس کی آواز پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کچھ نہیں تم اب آرام کرو صبح آفس بھی جانا ہے تمہیں۔ چلو ہائی زین آجاؤ بیٹا خالہ کو رسٹ کرنے دو اٹھو شاباش۔“ وہ اسے کہہ کر ان دونوں سے مخاطب ہوئیں جو اس کے قریب ہی بیڈ پر ایک دوسرے کے ساتھ کھینے میں مصروف تھے۔ ان کے کہنے پر فوراً بیڈ سے نیچے اتر آئے اور بجو کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے ہاتھ میں پکڑے اس نسخے کو تنگنے لگی جو تھوڑی دیر پہلے بجو نے اسے تھمایا تھا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس وقت پورے گھر کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اگر تم ہی جاب چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤ گی تو تمام گھر والوں کا کیا ہوگا۔ آئی فاطمہ بجوان کے نیچے اور موم سب تم پر ڈھنڈ کرتے ہیں اور تم ہو کہ۔“ تھوڑی دیر پہلے کہے گئے سویرا کے الفاظ اس

کے کانوں میں گونجے۔

”خالہ جانی آپ میرے لیے ایرویلین لائیں گی نا؟“

آف کر کے احسن کی طرف دیکھ کر صبح کرنے والے انداز میں گویا ہوا۔  
”وہ مجھے ابھی صرف دکھائی دی ہے، ملی نہیں ہے یار۔“

”دکھائی دی ہے تو ان شاء اللہ مل بھی جائے گی۔ تم دکھائی دینے کی تو ریٹ ورجب ملے گی تو اس کے بدلے میں تو دیکھنا میں تم سے کتنی ہار ریٹ لیتا ہوں۔“ احسن کی بات پر وہ آہستگی سے مسکرا دیا۔

”ہوں، تمہاری مسکراہٹ دیکھ کر لگتا ہے منزل قریب قریب ہی ہے، ہے نا؟“ اتنے دنوں بعد اسے خوش دیکھ کر احسن کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔  
”ہاں شاید۔“ تھوڑی دیر پہلے والی مسکراہٹ اس کے چہرے سے معدوم ہو چکی تھی۔

”شاید کیوں یقیناً؟“ کیوں نہیں؟“ احسن نے اچھی سے اسے دیکھا جس کے لہجے سے چھلکتی یاسیت کو وہ با آسانی محسوس کر سکتا تھا۔

”میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ مجھے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ ابون وہ میرے روم میں آنے سے بھی گریز کرتی ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیسے اسے کنوینس کروں؟“ وہ حقیقتاً پریشان دکھائی دے رہا تھا۔  
”آئی تھنک تمہیں کچھ زیادہ ٹائم spend کرنا پڑے گا اسے کنوینس کرنے کے لیے۔“ احسن نے کہا۔

”کچھ زیادہ نہیں بہت زیادہ۔“ اس نے تپ کر ایک بار پھر احسن کی تصحیح کرتے ہوئے کہا تو احسن اپنی ہنسی نہ دبا سکا اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ تو وہ اسے گھورے بغیر نہ رہ سکا۔

”تمہیں مجھ پر غصہ آ رہا ہے یا ماہین پر سچ بتانا یار۔“ احسن دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے استفسار نہ انداز میں بولا۔

”بہت بہتر ہوگا اگر تم اس وقت مجھ سے بات نہ کرو تو۔“ اس نے اپنے کندھے پر رکھے احسن کے ہاتھ کو ہٹاتے ہوئے ناراضی سے کہا۔

”اور میرے لیے باربی۔“  
زین اور ہانی کے معصوم سے چہرے اس کی نظروں کے سامنے آکھڑے ہوئے بڑی آس سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یکدم اس کے دل کو نہ جانے کیا ہوا وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”ٹھیک کہتی ہے سویرا مجھے بھول جانا چاہیے کہ میں کہاں جاب کر رہی ہوں۔ مجھے تو اپنے کام سے غرض ہونی چاہیے نا۔“ وہ خود سے ہمکلام تھی۔  
تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد مطمئن انداز میں بیڈ کی پشت سے سر نکالے آنکھیں موندے نیم دراز ہو گئی۔



”چل یار اب میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا ابھی اٹھ اور مجھے میرے فیورٹ ہوٹل میں کھانا کھلا۔ اٹھ جا شاباش۔“

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی احسن نے با آواز بلند جوش سے معنی خیز انداز میں کہا پھر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اس نے سوالیہ نظروں سے احسن کی جانب دیکھا۔

”کس خوشی میں؟“  
”کمال کرتے ہو یار تمہیں تو میرے کہنے سے پہلے شاندار سی پارٹی کا اہتمام کر دینا چاہیے تھا میرے لیے۔ لیکن تم ہو کہ خوشی کی وجہ پوچھ رہے ہو؟“ احسن شکوہ کرتے اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ واقعی نہیں سمجھتا تھا۔

”چار سال بعد تمہیں ماہین ملی ہے اور تم خوشی کی وجہ پوچھ رہے ہو اسٹریج۔“ احسن نے باقاعدہ طور پر اسے گھورا۔

”واٹ یو مین ملی ہے؟“ وہ ریموٹ سے ٹی وی



”سوری یار مذاق کر رہا تھا۔ غصہ نہ کھا چل کسی اچھی سی جگہ پر چلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں غصے میں کیا رکھا ہے؟“ حسن زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے آرام سے کہا پھر اسے باہر لے آیا۔

”عدید یار تم اسے کہیں باہر لے جا کر بات کرو۔ ہو سکتا ہے۔“

”بہت خوب احسن بہت خوب۔“ اس نے جلد سے انداز میں اسے سراہا۔

”وہ مجھ سے آفس میں بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ غلطی سے اگر میں اسے نظر آجاؤں تو وہ مجھے اس طرح اگنور کرتی ہے جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو اور تم کہہ رہے ہو میں اسے کہیں باہر لے جاؤں۔ آئی ایم شیور وہ یہ سب میرے ساتھ باہر جانے کے لیے ہی تو کر رہی ہے“ وہ گاڑی میں روڈ پر ڈالتے ہوئے بولا۔ وہ بری طرح کھولا ہوا تھا احسن کی بات پر۔

”سوری یار میں نے تو بس یونی کہہ دیا تھا۔“ احسن اس کی حالت سے اچھی طرح محظوظ ہو رہا تھا۔ اسے یوں بات بات پر چڑتے دیکھ کر احسن کو خواہ مخواہ ہنسی آرہی تھی۔

”ارے یہ کیا یار یہاں گاڑی کیوں روک دی؟“ احسن کی ہنسی کو یکدم بریک لگ گئے تھے۔

”تم نے کھانا نہیں کھانا؟“ اس نے بدستور اسی انداز میں احسن سے پوچھا۔

”کھانا ہے یار لیکن تم جانتے ہو میں چائینز شوق سے نہیں کھانا پلیز تم کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلو۔“ احسن نے التجا کی جس کو اس نے فوراً نظر انداز کر دیا۔

”اتنی دیر سے لطف اٹھا رہے ہو میرے دوست تھوڑا سا لطف اور سی۔“ وہ جانتا تھا احسن کو چائینز کھانے کچھ خاص پسند نہیں تھے لیکن اب وہ احسن کی حالت سے حفظ اٹھا رہا تھا جس کی شکل اتر سی گئی تھی اور اب وہ اسے ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ابھی تو وہ مجھے دکھائی دی ہے اس لیے یہاں لایا ہوں جب وہ مجھے مل جائے گی ناں تو پر اس یار شہر کے

سب سے بہترین چائینیز ریسٹورنٹ میں لے کر آؤں گا۔ چلو باہر آؤ اب اس طرح بیویوں والی نظروں سے نہ دیکھو مجھے جو صرف شوہر کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ نکلو باہر۔“

احسن کی حالت دیکھ کر وہ اب قدرے پرسکون تھا جو پچھلے آدھے گھنٹے سے بات بات اس پر ہنسے جا رہا تھا جبکہ احسن مظلوم۔ نظروں سے کبھی اسے اور کبھی اس ریسٹورنٹ کی بلڈنگ کو تنگ رہا تھا۔

”بہت برا لگ رہا تھا نا میں تمہیں ہنستے ہوئے۔“ احسن اس کے ساتھ اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بے چارگی سے بولا۔ تو وہ کھل کر ہنس پڑا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شگفتہ لہجہ میں گویا ہوا۔

”تم پوچھ رہے تھے کہ مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے یا اس پر تو مجھے اب سمجھ میں آیا ہے کہ مجھے تم پر غصہ آ رہا تھا۔“ وہ اب کی بار ہنستے ہوئے احسن سے مخاطب تھا۔

”اگر میری حالت تمہیں خوش رکھ سکتی ہے تو ہو جاؤ خوش۔“ احسن ٹیبل پر رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈھلتے ہوئے بولا۔ جبکہ وہ مسکراتے ہوئے مینو کارڈ دیکھنے لگا۔



وہ کتنی ہی دیر سے ہاتھ میں پکڑی فائلز کو مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ جن پر سائن کرنا بے حد ضروری تھا لیکن وہ اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کی ہمت جمع نہیں کر پا رہی تھی۔ اس وقت بھی شدید ضرورت کے باوجود وہ دوبار اس کے روم کے باہر سے ہی واپس پلٹ آئی تھی۔

”طوبی۔“ وہ پریشان پریشان سی اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی جب اس نے اپنے کیبن ڈور کے سامنے سے گزرتی طوبی کو پکارا جو غالباً اسی کے آفس روم کی طرف جا رہی تھی۔

”ہاں۔“ طوبی رک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”تم سائن کرانے جا رہی ہو؟“ طوبی کے ہاتھ میں

پکڑی فائلز کو دیکھ کر اس نے پوچھا تو طوبی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ہاں بولو۔“ طوبی نے کہا۔

”یہ میری فائلز پر بھی سائن کرنا پلینز مجھے ابھی کچھ کام ہے اس لیے میں۔“

”نو پر ایلم میں لے جاتی ہوں۔“ اس کی بات پوری سننے بغیر۔ بھرپور خلوص کے ساتھ مسکرا کر کہا اور اس کے ہاتھ سے فائلز لے کر آگے کی جانب بڑھ گئی تو اس نے صد شکر ادا کیا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔

”ماہین۔“ کچھ ہی دیر بعد طوبی کی آواز پر اس نے کمپیوٹر پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”سوری ماہین میں سائن نہیں کر سکی۔

ابھجیو ٹیلی عدید سر بہت غصے میں ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں جس کا کام ہو وہ خود چیک کرائے اگر۔“

طوبی نے فائلز اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا پھر اپنے کیبن کی طرف بڑھ گئی تو وہ شش و پنج میں مبتلا کافی دیر تک یو سی بیٹھی رہی پھر اپنے اندر اپنی ساری ہمت جمع کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

آخر کب تک وہ اس کا سامنا کرنے سے گریز کرے گی؟

جس وقت وہ ڈور ٹاک کر کے ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی وہ ٹیبل پر رکھے اپنے لیپ ٹاپ پر انتہائی محویت سے نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”مے آئی کم ان؟“ اس نے اجازت طلب کی۔

”لیس۔“ مصروف مصروف سے انداز میں اس پر ایک نظر ڈال کر وہ دوبارہ اپنے کام کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

اس کی اجازت ملنے پر وہ مناسب قدم اٹھاتی اس کی ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چیئر پر بیٹھنے کو کہا جس کو اس نے فوراً نظر انداز کر دیا۔

”ان پیپرز پر سائن چاہیے تھے۔“ اس کے سامنے ٹیبل پر فائلز رکھتے ہوئے اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ لیپ ٹاپ پر سے نظریں ہٹا کر مکمل طور پر اس

کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے فائلز کھولتے ہوئے ایک بار پھر بیٹھنے کو کہا مگر وہ انکار کر گئی۔

”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ اس کا لہجہ قدرے خشک سا تھا۔ اس نے پیپرز پر سائن کرتے ہوئے ایک اچھتی سی نگاہ اس پر دوڑائی۔

بلیک کلر کے جارجٹ سوٹ میں سلیقے سے دوپٹہ شانوں پر پھیلائے، سلکی بالوں کو کھچو میں قید کیے، جھکے سر کے ساتھ سیاہ لائبرائی ٹی پگلیں بچھائے، کسی بھی قسم کی مصنوعی آلائش سے پاک اس کے صبح چہرے پر پھیلی ناراضی پر اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔

وہ زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکا اور ایک گہرا سانس اپنے اندر اتار تا ایک کے بعد وہ سری فائل میں موجود پیپرز کو چیک آؤٹ کرنے لگا۔

”پچھو کیسی ہیں؟“ پیپرز پر سائن کرتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوا۔

”ٹھیک ہیں۔“ اس نے ناچار جواب دیا۔

”فاطمہ بچو اور۔۔۔“

”سب ٹھیک ہیں۔“ اس کی بات مکمل سننے بغیر اس نے تیزی سے اُٹتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

اس کے اس طرح کرنے پر اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا جو یقیناً اس سے ہرگز بات کرنے کی روادار نہ تھی وہ خاموشی سے دوبارہ پیپرز سائن کرنے میں مصروف ہو گیا۔

”ماہی۔“ وہ فائلز چیک آؤٹ کر چکا تھا اور اب وہ فائلز سمیٹ کر پلٹ رہی تھی جب وہ بالکل اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تو بے اختیار وہ اپنی جگہ پر رک گئی۔

”ڈونٹ کال می ماہی پلیز۔“ اس کے لہجے میں سختی نمایاں تھی۔

”تمہیں ہمیشہ اسی نام سے پکارا ہے اور پکارنا رہوں گا تم یا کوئی اور مجھے اس حق سے متبردار نہیں کر سکتا۔“ وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں



بیٹے ہوئے مصبوط بچے میں بولا۔

اس نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور آگے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”ون منٹ مانی۔“ وہ ایک بار پھر اس کے مقابل تھا۔

”میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سوری۔“ وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا۔

”پلیز مانی ڈونٹ بی ہیولا تک اسٹریٹجرز م جانتی ہو تمہارا یہ رویہ مجھے کتنی تکلیف دیتا ہے؟“ اس نے دکھ سے کہا۔

”تو میں کیا کروں؟“ اس نے تنک کر کہا۔

”تمہیں دوسروں کی تکلیف کا کتنا احساس ہوتا ہے جو دوسرے تمہارے درد کو محسوس کریں۔“

”ایسا کیا کیا ہے میں نے؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار نہ انداز میں بولا۔

”تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟“ جواباً اس نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا پھر سر جھٹکتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”مانی پلیز مجھ سے بات کرو۔“ وہ دو قدم تیزی سے آگے کی طرف بڑھا اور ڈور ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنا چاہا۔

”مجھے جانے دو۔“ اب کی بار اس کے لہجے میں قدرے سختی در آئی تھی۔

اس نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں صرف غصہ تھا۔ وہ یقیناً اس وقت اس کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھی لہذا اس نے خاموشی سے ہینڈل پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور اسے راستہ دیتا ایک سائیڈ پر ہو گیا تو وہ فوراً باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

”امی کیا پکایا ہے آج؟“ وہ ابھی ابھی آفس سے آئی تھی اور اب ہاتھ منہ دھو کر امی کے پاس کھن میں

رہے تھے پر ابھی سی۔

”آج کون سے بنائے ہیں فاطمہ نے، تمہیں پسند ہیں نا؟“ امی دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت سے بولیں۔

”ہوں پھر تو مزا آجائے گا۔“ اس نے چٹکارہ لیتے ہوئے کہا۔

”مریم کے سرال والے آئے تھے آج۔“ باتوں کے دوران امی نے اسے بتایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بغور ان کی باتیں سننے لگی۔

”وہ اگلے مہینے کی دس تاریخ تک شادی کرنے کے خواہش مند ہیں۔“ ان کے بتانے پر خوشی کی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔

”سچ امی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ بہت پر جوش دکھائی دے رہی تھی۔

”میری تو خواہش تھی کہ تم دونوں ہی اپنے اپنے گھروں کی ہو جاؤ تاکہ میری ساری فکریں ختم ہو جائیں۔“

امی یکدم متفکر نظر آنے لگیں۔ ان کی بات سن کر وہ چپ ہو گئی تھی۔

”جی امی بالکل اگر ماہین راضی ہو جاتی تو دونوں ساتھ ہی اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتیں اور۔۔۔“ بچو ابھی ابھی چائے کی ٹرے ہاتھ میں پکڑے وہاں آئی تھیں جب انہوں نے امی کی بات سن کر ان کا ساتھ دیا تو وہ خاموشی سے پاؤں میں سلیر پنے اندر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ لیکن بچو نے اسے وہیں روک دیا۔

”کھو ماہین۔“ بچو کے روکنے پر وہ وہیں رک گئی۔

”تم اس موضوع پر بات کیوں نہیں کرتیں امی ٹھیک کہہ رہی ہیں اگر تم بھی شادی کے لیے راضی ہو جاتیں تو امی کو تمہاری طرف سے بھی بے فکری ہو جاتی۔“ بچو آرام سے سمجھا رہی تھیں۔

”بچو ابھی جلدی کیا ہے۔ شادی ایک نہ ایک دن تو ہونی ہے نا، ہو جائے گی۔ آپ خود سوچیں اگر میں شادی کرنے کے چکر میں پڑ جاؤں تو گھر کے اخراجات اور ضروریات کیسے پوری ہوں گی۔“ چند لمحے خاموش

رہنے کے بعد اس نے وضاحت دی۔

”اللہ مالک ہے بیٹا۔“ امی نے محبت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اللہ تو مالک ہے امی لیکن یہ بھی دیکھیں نا ابھی ہم لوگ پوری طرح اسٹیبلش نہیں ہوئے۔ گھر کی مختلف ضروریات کے علاوہ زین اور ہانی کی اسکول فیس اور اسکول کے دوسرے اخراجات کہاں سے پورے ہو سکتے ہیں؟ آپ کے پاس صرف زیور ہے جو آپ نے ہمارے لیے رکھا ہوا ہے جبکہ شادی میں صرف زیور کی ہی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرے اور بھی کام ہوتے ہیں جن میں پیسہ چاہیے ہوتا ہے۔ ابھی جو کچھ آپ نے بنایا ہے وہ مریم کے لیے ہی ناکافی ہے پھر ایسے میں میرے لیے سوچنا کیا معنی رکھتا ہے؟ پلیز امی ابھی ڈیڑھ

دہائیہ مریم کی شادی خیریت کے ساتھ ہو جائے اور زین ہانی اچھے اسکول میں اچھی تعلیم حاصل کر لیں۔

آپ کی میڈمسن وقت پر آجایا کریں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے میں اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ پلیز بچو مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں کسی کو بنیادی ضروریات سے محروم نہیں دیکھ سکتی۔ اسے میری کمزوری سمجھ لیجیے گا۔ بس

یہی وجہ ہے کہ میں اس ٹاپک پر بات نہیں کرتی کیونکہ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ آپ کی پریشانی اپنی جگہ لیکن میری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کو میں احسن طریقے سے پورا کرنا چاہتی ہوں مجھے کرنے دیجیے پلیز۔“ وہ بچو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے التجائیہ انداز میں بولی۔

امی اور بچو اس کی باتیں سن کر چپ ہو گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن ان کی پریشانی بھی فطری تھی۔

”اگر بھائی جان نے میرے ساتھ اتنا بردا دھو کہ نہ کیا ہوتا تو آج ہم خالی ہاتھ ہرگز نہ ہوتے۔“ امی آنکھوں کے گوشوں میں پھیلتی نمی کو دپٹے کے پلو سے مٹا کرتے ہوئے بولیں۔ وہ بہت غمزہ دکھائی دے رہی تھیں۔

”ان لوگوں کی وجہ سے ہی تو ہم پر یہ دلی آئے ہیں امی۔“ اس نے امی کے گرتے آنسوؤں کو دیکھ کر تنفر سے کہا۔

”بس امی اب اس بات کو جانے دیں۔ بار بار یاد کر کے اپنا دل دکھانے سے کیا فائدہ۔ ایسا ہونا ہماری قسمت میں تھا اسی لیے یہ تمام مشکلات ہمیں برداشت کرنا پڑیں اس میں کسی اور کا کیا قصور؟“ بچو نے کھلے دل سے ماموں جان کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنی قسمت کو اس کا سبب بنایا۔

”پلیز بچو آپ لوگوں کی گئی زیادتیوں کو قسمت پر ڈال کر مطمئن رہنے کی کوشش مت کیا کریں۔ جو کچھ ماموں جان اور مانی جی نے کیا ہے وہ آپ بھول سکتی ہیں لیکن ہم نہیں۔“ ماموں جان اور مانی جی کا ذکر آتے ہی اس کے پورے جسم میں یونہی کرواہٹ سی گھل جاتی تھی جبکہ بچو اتنے عرصے میں نہ اس کا ان کے لیے غصہ ٹھنڈا کر سکی تھیں اور نہ ہی اس کی سوچ بدلی پائی تھیں۔ وہ اس کی اس شدت پسندی سے گھبرا جاتی تھیں۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ چائے پیو پھر میں کھانا لگاتی ہوں۔“ بچو اسے اس موضوع پر سے ہٹانے کے لیے اس کی توجہ چائے کی جانب مبذول کرانے لگیں تو اس نے بے دلی سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ امی کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے انہوں نے ایک نظر اس کو دیکھا جو بگڑے موڈ کے ساتھ چائے کے سپ لے رہی تھی۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

اپنے آفس سے نکل کر وہ باہر کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس کے کیبن کی لائٹ آن دیکھ کر وہ غیر ارادی طور پر اس طرف چلا آیا اور کیبن ڈور کو ہلکا سا ٹاک کیا۔

وہ جو کمپیوٹر اسکرین پر نظرس جمائے اپنے کام میں مصروف تھی اس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ دروازے میں ایستادہ تھا۔

”تم ابھی تک گھر نہیں گئیں خیریت؟“ اس نے



حیرت سے پوچھا۔

”تھوڑا سا کام رہتا تھا وہ مکمل کر رہی تھی۔“ اسے بتا کر وہ دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”رات کے نو بج رہے ہیں پورا آفس خالی ہو چکا ہے۔ کام صبح بھی مکمل کیا جاسکتا تھا۔“ اس نے باتیں ہاتھ کی کلانی پر بندھی رست وایچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے تشویش سے کہا۔

”چلی جاؤں گی تھوڑی دیر تک۔“ وہ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”کوئی پر اہم ہے کیا؟“ اسے پریشان دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا اور آہستگی سے چلتا ہوا اس کی ٹیبل کے پاس جا کھڑا ہوا اور کمپیوٹر اسکرین کو دیکھنے لگا جہاں فائل Accept نہیں ہو رہی تھی اور وہ غالباً اس کوشش میں غلط تھی۔

”کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟“ اس کا جواب نہ پا کر ایک بار پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اس فائل میں الجھ رہی تھی مگر اتنی کوششوں کے باوجود بھی ناکام تھی اور اب اس کا دل اتنا رہا تھا لیکن صبح پہلی ہی شفٹ میں اسے فائل تو قیر صاحب کو ہینڈ اور کرنی تھی لہذا وہ جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتی تھی اور اسی عجلت میں اسے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور اب امی کی پریشانی کا خیال آتے ہی اسے یکدم فکر ستانے لگی تھی۔

بے اختیار ہی اس نے اپنے باتیں جانب اسے دیکھا جو منتظر نظروں سے اسے تنگ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں کنفیوز ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی موجودگی اسے بری طرح نروس کر رہی تھی۔ کی بورڈ پر چلتی اس کی انگلیوں میں واضح ارتعاش پیدا ہو چکا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر وہ جھنجھلا سی گئی۔ اگر اسے ذرہ برابر بھی علم ہوتا کہ وہ بھی آفس میں موجود ہے تو وہ کسی بھی فائل کی پروا کیے بغیر اس وقت گھر میں ہوتی لیکن۔۔۔ واہ رے بے خبری۔

وہ جوں کاتوں کھڑا تھا۔

اب وہ کیسے اسے اپنا مسئلہ بتائے؟ وہ سوچوں کا تانا بانا بن رہی تھی جب اس کی آواز سنائی دی۔

”میں دیکھتا ہوں کیا پر اہم ہے؟“ ہمیشہ کی طرح اس کے کہے بغیر وہ آج بھی اس کے دل کی بات جان چکا تھا۔ بل بھر کو وہ بالکل ساکت ہو گئی لیکن جلد ہی نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

اس نے کچھ سوچ کر کی بورڈ پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ جو یقیناً اس کی طرف سے ملنے والی اجازت تھی وہ فوراً ٹیبل پر جھک گیا۔

”تم بیٹھو میں ٹھیک ہوں۔“ اسے جگہ دینے کے لیے وہ اٹھنے لگی تھی جب اس کے کہنے پر بلا ارادہ وہیں بیٹھ رہ گئی۔

وہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس نے بھی اپنی نظریں اسکرین پر جمادیں تب ہی بالکل اچانک اس نے ایک اچھٹی سی نگاہ اس پر دوڑائی۔

اسکا لی بلیو شرٹ پر ڈارک نیوی بلیو اور بلیک کامبینیشن کلر کی ٹائی جو اب ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں گلے میں پڑی تھی، کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی آستینیں مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر متحرک تھیں جبکہ چہرے پر پھیلی سنجیدگی و متانت اس کے وقار کو مزید بڑھا رہی تھی۔

وہ اس سے محض بالشت بھر کے فاصلے پر تھا یکدم گھبرا کر وہ چیئر کی پشت سے چپک گئی تھی۔ وہ اٹھنا چاہ رہی تھی مگر۔

”اس ڈن۔“ وہ کہتا ہوا سیدھا ہو گیا۔ اس کی آواز پر وہ فوراً کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گئی۔

وہ کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے کیبن سے باہر نکل چکا تھا۔

”آئندہ سات بجے تک گھر چلی جایا کرو۔“ وہ اپنا پرس سنبھالے کیبن کی لائٹ آف کر کے باہر نکل رہی تھی جب اس کی بات سن کر وہ لمحہ بھر کو رک کر پھر اس کی جانب دیکھے بغیر خاموشی سے آگے کی جانب چل پڑی۔

”ماہی کم از کم تم مجھ سے بات تو کیا کرو۔ تمہاری

خاموشی سے میں یہ کیسے جان سکتا ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لیے کیا ہے؟“ وہ اس سے ذرا فاصلے پر قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”تمہیں اب تک میرے رویے سے پتا نہیں چلا کہ میرے دل میں تمہارے لیے کیا ہے؟“ جواباً اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”جانتا ہوں تمہارے دل میں میرے لیے غصہ ہے کیونکہ میں تمہیں انفارم کیے بغیر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔“ وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”نفرت بھی ہو سکتی ہے۔“ اس نے بے دروی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا پھر دوبارہ آگے کی جانب بڑھ گئی تو وہ اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

”اتنی تکلیف وہ باتیں مت کیا کرو ماہی پلیز۔“ اس کا لہجہ ملجی تھا جسے وہ مکمل نظر انداز کر کے لفٹ کی طرف مڑ گئی تو وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

”لفٹ خراب ہے سیڑھیوں سے جانا پڑے گا۔“ وہ ابھی لفٹ کے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ اس کی آواز پر وہیں رک گئی پھر لیٹ کر پچھلی منزل کی جانب اترتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تو وہ بھی اس کی تقلید میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

ابھی وہ دوسری منزل پر ہی پہنچے تھے کہ اچانک لائٹ چلی گئی جس کے باعث سیڑھیوں میں مکمل اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے فوراً ”موباائل ٹا برج آن کر لی تھی۔ اس وقت وہ اس سے آگے سیڑھیاں اتر رہا تھا جب اچانک اس کا پاؤں اگلی سیڑھی کے کنارے پر رکھے جانے کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اسی لمحہ اس نے فوراً ریڈنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

وہ گرتے گرتے بچ گئی تھی۔

اس کی لڑکھڑاہٹ پر اس نے فوراً ”پلٹ کر اسے دیکھا۔

”تم ٹھیک تو ہونا؟“ اس کے لیے سے چھلکتی تشویش کو وہ واضح طور پر محسوس کر سکتی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہاتھ دو۔“ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے اس کی کھلی چوڑی ہتھیلی کو نظر انداز کر دیا اور مزید ایک سیڑھی نیچے اتر آئی۔

”میں نے کہا ہاتھ دو۔“ اب کی بار اس نے درشتگی سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ اس وقت وہ غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا جواب بھی اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ تب ہی فون بجنے پر اس نے وائیں ہاتھ میں پکڑا سیل کان سے لگا لیا۔

”ہیلو۔“ وہ فون پہ باتیں کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

وہ خاموشی سے اس کی پیروی میں سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ جب آخری منزل کی آخری سیڑھی پر پہنچے ہی اس نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا جو بڑے مگن سے انداز میں ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامے اور دوسرے ہاتھ سے فون کان پر لگائے باتوں میں محو بلڈنگ سے باہر نکل رہا تھا اور وہ میکا کی انداز میں اس سے دو قدم کے فاصلے پر چل رہی تھی۔

بدستور باتیں کرتے کرتے وہ پارکنگ ایریا تک آ پہنچا اور اب رک کر دوسری طرف موجود شخص کی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ اس نے تپ کر ایک نظر اسے اور دوسری نظر اس کے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کو دیکھا جس کو اس نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی سعی کرنے لگی مگر نڈارو۔

”چلیں ٹھیک ہے اجمل صاحب پھر کل آپ سے آپ کے آفس میں ملاقات ہوگی ان شاء اللہ اوکے اللہ حافظ۔“

مسکرا کر فون آف کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اسے دیکھا جو اپنے غصے کو بمشکل دبائے اس کے ساتھ کھڑی تھی۔



”کیا ہوا؟“ پتا نہیں وہ واقعی اس کے غصہ کی وجہ نہیں جانتا تھا یا انجان بن رہا تھا لیکن کچھ بھی تھا اس وقت وہ اپنے لہجے کی سختی پر قابو نہیں رکھ پائی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ قدرے بلند آواز میں بول پڑی۔

”ہاتھ چھوڑو میرا۔“ اس کے کہنے پر اس نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں موجود اس کے نرم ہاتھ کو دیکھا اور دوسری نظر اس کے تنے چہرے پر ڈالتے ہوئے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر فوراً پلٹ کر ہاتھ میں موجود چابی سے پاس کھڑی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولنے لگا۔

اسی دوران وہ دوسری جانب مڑ چکی تھی۔ اسے پلٹتے دیکھ کر وہ فوراً اس کی جانب بڑھا اور اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اس کے سوال پر وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی پھر اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

”گھر جا رہی ہوں اور کہاں؟“

”گاڑی میں بیٹھو میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

”تھینکس میں چلی جاؤں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ آگے کی جانب بڑھ گئی۔ لیکن وہ اس کے بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔

”رات کے دس بجنے والے ہیں اس وقت تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟“

اس کے لہجے میں پریشانی واضح تھی۔

”تمہیں میری فکر کب سے ہونے لگی؟“ جواباً اس نے طنز بھرا پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

”جو شخص رات کے دس بجے سنسان اور ویران سڑک پر تنہا چھوڑ کر چلا جائے اسے آج میری فکر کیسے لاحق ہو گئی؟“ اس نے بدستور اسی انداز میں کہا تو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدرے دھیمے مگر سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

”تمہاری بات سن کر میری جو حالت ہوئی تھی اس کے بعد مجھے کچھ بھی بھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا

کروں؟ مجھے کم از کم تم سے ایسی توقع نہیں تھی کہ تم مجھ سے ایسی بات کرو گی۔“

”کیا بات کی تھی میں نے؟“ وہ اس کی پوری بات سے بغیر ترخ کر بولی۔

”دبی جو سب کہہ رہے تھے اگر میں نے کہہ دیا تھا تو کون سا برا کر دیتا تھا۔“

”تم نے برا نہیں مایا بلکہ بہت برا کیا تھا میرے ساتھ۔ کیونکہ دوسرا کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں یا نہیں لیکن تم تم تو جانتی تھیں تاکہ میں تمہارے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور تم ہی مجھے مشورہ دے رہی تھیں کہ میں زریں سے شادی کر لوں جبکہ ایسا کرنا تو دور سوچنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا اسی لیے تمہاری بات سن کر دکھ کے ساتھ ساتھ مجھے غصہ بھی آگیا تھا اور میں نے۔“

”اپنی گاڑی سے اتر جانے کو کہہ دیا تھا۔ ہے نا؟“ اس نے تاسف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔

”سوری فار دسٹ مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

اس کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ جس کا اس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ سر جھٹکتی وہاں سے ہٹ گئی۔

”ہے مہین۔“ وہ اس کی طرف بڑھنا ہی چاہ رہا تھا کہ پارکنگ ایریا کے بائیں جانب سے ان کی طرف آتی گاڑی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی جس کو سویرا ڈرائیو کر رہی تھی۔ سویرا کی آواز پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور پھر تیزی سے اس کی جانب بڑھ گئی۔

”تم آفس سے اب فری ہوئی ہو؟“ سویرا نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے مہین سے پوچھا جو یاسیت سے اپنی گاڑی کی طرف پلٹ رہا تھا۔

”تھینکس تم آگسٹس درنہ میں بہت پریشان ہو رہی تھی کہ اتنی رات کو کیسے گھر جاؤں گی؟“ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے تشکر آمیز نظروں سے سویرا کو دیکھ

کر کہا پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”تمہیں عدید مہران کے ہوتے ہوئے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی میری جان؟“ سویرا معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولی پھر گاڑی کو آگے بڑھانے لگی۔

”وہاٹ ڈو یو مین؟“ اس نے سویرا کو گھورا۔ جو بڑے مزے سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

”ویسے مہین ایک بات ہے۔“ تھوڑی دیر بعد سویرا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”عدید مہران اچھا انسان ہے اور وہ تمہارے ساتھ بہت جتنا بھی ہے اس کے علاوہ وہ تمہارے ساتھ بہت مخلص بھی ہے۔ اسے انور مت کرو پلینز۔“ سویرا نے ناصحانہ انداز میں سنجیدگی سے کہا۔

”لیواٹ یہ بتاؤ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں۔“ اس موضوع پر بات کرنے سے بچنے کی خاطر اس نے اس کا دھیان دوسری طرف کرنا چاہا۔

”آفس کی طرف سے آئی تھی۔ کچھ ضروری کام تھا۔“ سویرا نے بتایا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے میں مگن ہو چکی تھیں۔



”ایکسکیوز می سیر۔“ آج اس نے ایک امپورٹنٹ میٹنگ کال کی تھی اور اب جب وہ میٹنگ اوور کر کے اپنی چیئر سے اٹھنے ہی لگا تھا تو طوبی کی آواز پر وہ فوراً اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”یس۔“

”سر آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ طوبی نے اجازت طلب کی۔ جبکہ ٹیبل کے گرد چیئر پر بیٹھے تمام ایسپلائز بھی طوبی کو دیکھنے لگے۔

”جی کیسے۔“

”ایک چھوٹا سہم سب نے ڈیسیڈ کیا ہے کہ اس دفعہ اینول آفس ٹرپ پر آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

”سوری مس طوبی آپ سب تو جانتے ہی ہیں میں ٹریس ہیکنکس وغیرہ پر نہیں جایا کرتا، آپ لوگ جائیں اور انجوائے کریں پلینز۔“ اس نے ٹالنا چاہا۔

”لیکن سر ہم سب کی خواہش ہے کہ اس سال ہم آپ کے ساتھ ٹرپ پر جائیں اور آپ کے ساتھ انجوائے کریں سو پلینز سر انکار مت کیجیے۔“ جبران نے بھی طوبی کی تائید کی۔

”یس سر ہم سب چاہتے ہیں کہ آسٹریلیا کے پروجیکٹ پر کام کر کے جو کامیابی ہمیں ملی ہے وہ ہم آپ کے ساتھ شیئر کریں۔“

اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر یکے بعد دیگرے سب اس کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

”اس سال پہلی دفعہ آفس ٹرپ شہر سے باہر جا رہا ہے آپ ہمارے ساتھ ہوں گے تو ہمیں بہت حوصلہ ملے گا۔ پلینز سر مان جائیے۔“ میٹنگ روم میں بیٹھے تمام افراد کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا وہ چیئر کی بیک سے ٹیک لگائے خاموشی سے باری باری سب کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ پھر قدرے توقف کے بعد گویا ہوا۔

”ان فیکٹ میں اپنی فیملی کے بغیر کسی طرح بھی تفریحی غرض سے کہیں گیا نہیں اس لیے میرا جانا بہت مشکل ہے۔ آپ سے ریکوسٹ ہے کہ آپ سب لوگ ٹرپ پر جائیں اور خوب انجوائے کریں اگر ممکن ہو تو اگلی بار ان شاء اللہ میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا۔“ اس کے انکار پر اسٹاف تقریباً ”مایوس ہونے کو تھا کہ توقیر صاحب کی آواز پر سب ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”سب لوگ اتنا زور دے رہے ہیں تو پلینز چلیے سر۔“

”آپ نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا تو توقیر صاحب۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”یس سر کیونکہ سب یہی چاہتے ہیں۔ کیوں مس مہین۔ پلینز آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیں تاکہ ایک ووٹ بھی سر کے حق میں نہ جائے۔“

صنذر نے مہین کو مخاطب کر کے کہا تو وہ جوار گرد



سے بے نیاز سر جھکائے ٹیبل پر نظریں مرکوز کیے بیٹھی تھی، چونک کر بے ساختہ اسے دیکھنے لگی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اپنی اس بے ساختگی پر وہ خود کو دل ہی دل میں سرزنش کرنے لگی۔

”ماہین تم بھی بولونا کچھ کہ سر کو بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیے یا نہیں؟“ ناویہ نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”آں ہاں۔۔۔ بالکل۔“

وہ اپنے چہرے پر اس کی نظروں کی تپش کو با آسانی محسوس کر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس وقت اس کی نظروں کو خود پر بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت اس کو ہرگز نہیں دیکھ رہا ہو گا۔ کچھ بھی تھا وہ اسٹاف کی موجودگی کا ہر صورت خیال رکھتا تھا اور بلا ضرورت اسے کسی بات میں نہیں گھسیٹتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے انتہائی قابل اطمینان تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سب کی موجودگی میں کافی حد تک ایزی میل کرتی تھی لیکن اب اچانک اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا کچھ گھبراہٹ گئی تھی۔

اتنا کہ اس نے دوبارہ سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔

”پلیز سر اب تو چلیے نا ہمارے ساتھ اب ایک ووٹ بھی آپ کے حق میں نہیں ہے۔“ نصیر نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہ ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش رہ گیا پھر قدرے توقف کے بعد گویا ہوا۔

”چلیے ٹھیک ہے اگر آپ سب کی یہی مرضی ہے تو مجھے بھی آپ کی بات ماننی پڑے گی۔“

اس کا جواب سن کر وہاں پر موجود تمام افراد کے چہرے کھل اٹھے جس کی وجہ اس کا اسٹاف کے ساتھ بہترین رویہ تھا۔ وہ اپنے تمام اسٹاف ممبرز کے ساتھ انتہائی نرمی اور محبت سے پیش آتا تھا۔ بلا وجہ کا سخت رویہ اسے شدید ناپسند تھا اسی لیے اسے خواہ مخواہ کا پریشاں ڈالنا ہرگز گوارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے ہر ایمپلائی کے ہر مسئلے سے بخوبی واقف رہتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ ہر شخص اسے خود سے قریب سمجھتا تھا اور اس سے اپنا ہر

پر اہم با آسانی ڈسکس کر لیتا تھا۔ جبکہ وہ ان کی ہر ممکن مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ ان سب کے باوجود اس کی شخصیت میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ اس سے بات کرنے سے پہلے مخاطب ایک بار سوچنا نہ بھولتا تھا۔ وہ اپنی حد میں رہتا اور دوسروں کو ان کی حدوں میں رکھنے کا فن بخوبی جانتا تھا۔ اگر وہ سب کے قریب تھا تو ایک نہ محسوس ہونے والا نااصلہ بھی اس نے قائم رکھا ہوا تھا۔ اس کی شخصیت کا وقار لمبے کی متانت اور بات کرنے کا انداز اسے دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔

”ایم ریڈی بٹ ایک شرط ہے۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔

”پورا اسٹاف اس ٹرپ پر چلے گا کوئی Absent نہیں ہو گا۔ اگر آپ سب ایگری ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ۔۔۔ سوری۔“

اس نے ایک سرسری سی نظر اس کے جھکے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”نہیں سر ہم سب تیار ہیں۔ آپ فکر مت کریں تو قیر صاحب نے یقین دلایا۔“

”سر مقام بھی آپ ڈیسیڈ کیجیے پلیز۔“ زارا نے تجویز دی۔

”یہ تو بہت مشکل کام ہے مس زارا۔“ اس نے تھوڑا پس و پیش سے کام لیا۔

”آپ سب مل کر کوئی بھی اچھی سی جگہ سوچ لیجیے وہیں چل پڑیں گے۔“

”نو سر ہم سب آپ کے فیورٹ مقام پر جائیں گے ہم نے یہی ڈیسیڈ کیا ہے۔“ ظفر کے کہنے پر وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد گویا ہوا۔

”پھر ایسا کرتے ہیں ہم لوگ کاغان چلتے ہیں آپ اپنی تیاریاں مکمل کر لیں۔“ وہ اتنا کہہ کر مزید کچھ کہنے بغیر آخری نظر اس پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا تو سب لوگ اس کی تقلید میں اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے روم سے نکلتے ہی وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو چکے تھے جبکہ وہ بالکل خاموش تھی۔ اس نے ایک طائرانہ سی نظر سب

پر دوڑائی ہر شخص اپنی جگہ پر بے حد خوش و مسرور دکھائی دے رہا تھا۔

وہ سب مختلف باتوں اور پلانز میں مگن تھے جب وہ غیر محسوس طریقے سے وہاں سے چلی آئی اور اپنے کیبن میں آ بیٹھی یکدم دل کچھ بو جھل بو جھل سا ہونے لگا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں بندھی نازک سی رسٹ وائچر نگاہ دوڑائی۔

شام کے پانچ بجے تھے۔ آفس ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کام نبھایا اور پرس سنبھالے بلڈنگ سے باہر نکل آئی۔

\*\*\*

”ماہین۔“ وہ صحن میں رکھی چیر پر پاؤں اوپر کی آرام دہ انداز میں ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ جب بجو کی آواز پر ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”میں نے تمہارے کپڑے پریس کر کے بیگ میں رکھ دیے ہیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی رکھ دی ہیں تم ایک دفعہ بیگ چیک کر لینا کچھ کم ہو تو بتا دینا۔“ بجو اس کے قریب رکھی چیر پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ جواباً وہ خاموش تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ اسے مسلسل چپ دیکھ کر بجو پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں بجو بس ویسے ہی۔“ اس نے ٹالنا چاہا۔

”دور جانے کے خیال سے پریشان ہو؟“ بجو نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں کہیں نہیں جا رہی۔“ اس کی بات پر وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”کیوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بس ویسے ہی بجو میرا ٹرپ پر جانے کو بالکل دل نہیں کر رہا۔“ اس نے مجھے مجھے دل سے کہا۔

”لیکن کیوں؟ ابھی کل ہی تو تم اتنی ایکسیٹنڈ تھیں اب اچانک کیا ہوا ہے؟“

ان کے سوال پر وہ چند لمحوں کے لیے بالکل چپ ہو گئی۔

اب وہ انہیں کیا بتانی کہ کل تک اسے یہی پتا تھا کہ آفس ٹرپ پر عدید مہران نہیں جایا کرتا جبکہ اس دفعہ وہ بھی ٹرپ جوائن کر رہا ہے اور نا صرف یہ بلکہ۔۔۔ کاغان۔

اس کا دل یاسیت سے پر ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جو اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟

”تم نے بتایا نہیں کیا بات ہے ماہین؟“ بجو نے دوبارہ استفسار کیا تو وہ چونک سی گئی۔

”بجو ٹرپ کاغان جا رہا ہے اور آپ کو پتا تو ہے میں کاغان پہلے بھی جا چکی ہوں بس اس لیے میرا دل نہیں کر رہا۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

”ارے واہ تمہارا ٹرپ کاغان جا رہا ہے اتنی خوب صورت جگہ پر اور تم انکار کر رہی ہو یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہے جب ہم سب لوگ کاغان گئے تھے تو کتنا مزا آیا تھا وہاں پر۔“ اس نے گردن کو ہلکا سا موڑ کر بجو کو دیکھا جو کاغان کا نام سنتے ہی برجوش دکھائی دینے لگی تھیں ان کا چہرہ پرانی یادوں کو یاد کر کے جگمگانے لگا تھا۔

”سچ ماہین وہ دن بہت خوب صورت اور یادگار تھے جب ہم سب ساتھ رہتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا ہم کاغان عدید کی ضد پر گئے تھے۔ اسے بہت شوق ہوا کرتا تھا برف پوش پہاڑیاں دیکھنے کا جبکہ ماموں جان سخت خفا ہوئے تھے اس کی اس ضد پر۔ لیکن وہ بھی عدید مہران ہی کیا جو اپنی بات سے ایک انچ پیچھے ہٹ جائے۔“ بجو گزرے دنوں کو بڑے پر لطف انداز میں یاد کر رہی تھیں۔ وہ محض ان کو دیکھتی رہی۔

”مجھے ماموں کا گھر اور عدید بہت یاد آتے ہیں ماہین۔ کتنی اپنائیت اور کتنی محبت ہوتی تھی نا ہم سب کے درمیان پھرتا نہیں کس کی نظر لگ گئی۔“ ذکر کرتے کرتے بجو افسردہ سی ہو گئی تھیں۔ جبکہ اس کا ذہن ان کی پہلی بات میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ بجو کی بات ختم ہوتے ہی وہ ان کی طرف مڑ گئی۔



”بجودہ صرف ماموں کا گھر نہیں تھا وہ ہمارا بھی تھا آپ یہ بات کیوں بھول جاتی ہیں؟“ وہ نرج سی ہو گئی تھی بجو کی فراخ دلی سے۔

”ماہین پلینز چھوڑ دو یہ سب تم آخر وہ سب بھلا کیوں نہیں دیتیں؟“ بجو نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں کبھی بھی نہیں بھلا سکتی بجو جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ آخر ہمارا قصور کیا تھا جس کے نتیجے میں انہوں نے ہمیں یوں درد برد کر دیا۔ ماموں نے دھوکے سے ہمارا حصہ اپنے نام کر لیا آخر کیوں کیا انہوں نے ہمارے ساتھ ایسا؟“ وہ تقریباً رو دینے کو تھی۔ بجو نے ایک نظر اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے پیار سے چمکانے لگیں۔ وہ بس ایسی ہی تھی روپوں اور بھول کو شدت سے محسوس کرنے والی اور اس کی یہ شدت اب غصہ میں بدل گئی تھی۔ وہ جو بڑی سے بڑی بات کو آسانی سے نظر انداز کر دیا کرتی تھی اس بار اتنا سمجھانے کے باوجود وہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھی۔ اس سے زیادہ انہوں نے اس سے کوئی بات نہ کی مبادا اس کا موڈ مزید خراب نہ ہو جائے۔ ”اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تم آفس ٹرپ پر جا رہی ہو یا نہیں؟“ انہوں نے اس کا سراپر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”میرا مشورہ ہے ماہین تم چلی جاؤ۔ اچھا ہے تھوڑی ہوا تبدیل ہو جائے گی جو تمہارا ذہن کو بالکل فریش کر دے گی۔“ بجو نے مشورہ دیا۔ لیکن جواباً وہ کچھ نہ بولی اور پھر جلد ہی اپنا موڈ درست کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بجو سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی اور جلد ہی بجو بھی سب بھول بھال کر اس سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

\*\*\*

”آئی تھنک ماہین تمہیں چلے جانا چاہیے۔“ وہ آج کئی دنوں بعد سویرا سے ملنے اس کے گھر آئی تھی جب اس نے باتوں کے دوران آفس ٹرپ کا ذکر اس

سے کیا تھا جواباً ”سویرا اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”تم بطور ایمپلائے ٹرپ پر جاؤ اس میں اتنا سوچنے یا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں اپنی جاب سے غرض ہونی چاہیے اور بس۔“

سویرا نے چائے کا گم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا جو اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

”کوئی براہم ہے کیا؟“ سویرا نے مستقل اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کروں؟“ وہ کچھ الجھی الجھی سی تھی۔

”کیا مطلب؟“ سویرا نے پوچھا۔

”میں کلنٹن جانا نہیں چاہتی سویرا! اس جگہ کا نام سنتے ہی مجھے گزرا ہوا وہ وقت یاد آنے لگتا ہے جو سب سے حسین اور خوب صورت تھا جس کا ایک ایک پل میرے ذہن میں محفوظ ہے اور میں وہاں جا کر کسی کمزور لمحے کی گرفت میں نہیں آنا چاہتی سویرا! میں نے خود کو مشکل سے اس وقت سے نکالا ہے جب عدید سمیت ماموں اور ممالی کی محبت میرے پورے وجود میں سرائیت کرتی تھی جب میری پوری زندگی کا محور ان سب کی محبت تھی۔ لیکن جب اعتبار ٹوٹا ہے نا تو پلٹ کر دوبارہ وہیں جانا مشکل ہو جاتا ہے اور میں پلٹنا نہیں چاہتی کیونکہ میرے دل سے ان سب کی محبت ختم ہو چکی ہے میں کبھی ان سے ملنا نہیں چاہتی۔“ کافی عرصے بعد وہ سویرا سے اس سے متعلق بات کر رہی تھی وگرنہ وہ اس موضوع پر نہ کوئی بات سننے کو تیار ہوتی تھی اور نہ دوسرے کو کرنے دیتی تھی۔ سویرا اسے ٹوکے بغیر سنتی رہی اور وہ بولتی چلی گئی۔

”میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ اگر میں اس ٹرپ پر نہیں جاتی تو مجھے علم ہے کہ وہ یہ ٹرپ کینسل کر دے گا اور میں نہیں چاہتی کہ آفس کے باقی لوگ محض میری وجہ سے اس ٹرپ سے محروم ہو جائیں۔ وہ سب تو مجھے ہی قصور دار سمجھیں گے نا اب مجھے کچھ سمجھ

نہیں آ رہا کہ میں اسے کس طرح کنوینس کروں۔“

”ماہین تم خواہ مخواہ اس کو ایڈجسٹ کر رہی ہو۔“ سویرا اس کی پریشانی کے خیال سے اس کی پوری بات سننے بغیر بول اٹھی۔

”تم وہاں جاب کرتی ہو اور تمہیں وہی سب کرنا پڑے گا جو وہاں پر موجود دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ تم بالکل پریشان مت ہو۔ ہاں وہاں پہنچ کر اگر کوئی خوشگوار سا خیال دل کو ستانے لگے تو ایک نظر عدید پر ڈال لینا۔ یہ میرا مشورہ ہے تمہیں۔“

سویرا نے آخری بات شرارتی انداز میں مسکراہٹ دیا کر کہہ ڈالی مبادا وہ اکھڑ نہ جائے۔ جبکہ سویرا کی اس بات پر وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی پھر کم میں موجود چائے کے سبب لینے لگی۔ تو سویرا دل ہی دل میں اس کے لیے ڈھیروں دعائیں کرنے لگی جس کی حساسیت حد درجہ شدت اختیار کر چکی تھی۔

\*\*\*

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ مضطربانہ انداز میں کبھی بائیں ہاتھ پر بندھی رسٹ وائچ کو اور کبھی دندو سے نظر آنے والے اس راستے کو تک رہا تھا۔ جہاں سے اس کی آمد متوقع تھی۔

”پتا نہیں وہ آئے گی یا نہیں؟“ یہ سوچ اسے پریشان کیے ہوئے تھی۔ اس کا سب نہیں چل رہا تھا کہ وہ سڑک کے کنارے کھڑی اس لکڑی دین سے نیچے اتر کر بے قراری سے ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے اس کی راہ دیکھے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹاف کی موجودگی کا خیال بہر حال ساتھ رہتا تھا۔

وہ بے چینی کے عالم میں کئی بار پہلو بدل چکا تھا۔ غالباً سب ہی منتظر نظروں سے دین سے باہر دیکھنے میں مصروف تھے۔

”زارا تم ماہین کا نمبر توڑائی کرو پلینز۔“ طوبی نے زارا کو مشورہ دیا کیونکہ پورے اسٹاف میں زارا ہی اس کے بہت کلوز تھی۔

”وہ سیل نہیں رکھتی یار۔“ زارا کی حالت بھی طوبی

سے مختلف نہیں تھی۔

”ہو سکتا ہے ماہین کا ارادہ بدل گیا ہو۔“ کرن نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو وہ جو غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سن رہا تھا بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

”اللہ نہ کرے کرن اگر ماہین کا ارادہ بدلا تو عدید سر کا ارادہ بدلنے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔“ طوبی نے کرن کو دھیمی آواز میں کہا تو کرن مزید کچھ کہنے سے باز رہی۔

”اوہ تھینک گاڈ۔“ زارا کی خوشی سے بھرپور آواز پر سب ہی نے اس کا ساتھ دیا اور اسے دین کی طرف بڑھتا دیکھ کر بے اختیار ان سب نے سکون کا سانس بھرا۔

اسے دین میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے طمانیت سے اپنا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔ تمام بے چینی اور بے قراری وجود سے گویا نیکم رفع ہو چکی تھی۔

اپنا پرس سنبھالتی وہ آہستگی سے چلتی ہوئی زارا کے پاس جا پہنچی جس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ زارا کو بہت سردی لگتی تھی۔ اس لیے اس کے کہنے پر وہ دندو والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”چلو نواز۔“ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ سر پر دوپٹہ جمانے میں مصروف تھی جب قریب سے آتی اس کی آواز پر چونک کر اس نے اگلی سیٹ پر اسے بیٹھا دیکھا تو بل بھر کے لیے اس کے ہاتھ سر پر ہی رک گئے تھے۔ وہ فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا اور وہ اس کے بالکل پیچھے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

دین میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے گرد و پیش سے قطعی بے خبر تھی جی غور نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کہاں بیٹھا ہے؟ گویا اب تمام سفر وہ عجیب سی کیفیت میں ہی گھری رہے گی۔

بہر حال وہ سارے خیالات جھٹک کر آنکھیں بند کیے زیر لب قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔

”میں کیا مانگوں یار مجھے تو دعاؤں میں صرف تمہیں مانگنا آتا ہے اور دیے بھی تم ہونا میرے لیے دعائیں



مانگنے کے لیے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ یہ جو تم اتنی ساری سورتیں آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں پڑھ رہی ہو تا یہ صرف میری حفاظت کے لیے پڑھ رہی ہو کیونکہ میں تمہارے لیے اس پوری کائنات میں سب سے زیادہ اہم ہوں۔

دل ہی دل میں مختلف آیتوں کا ورد کر کے وہ اب دعا مانگ رہی تھی کہ اچانک اسے اپنے بہت قریب اس کی مدہم آواز سنائی دی۔ وہی انداز وہی لب و لہجہ وہی اپنائیت۔

جب وہ سب کاغان جا رہے تھے اور وہ شہزینہ آپلی کو زبردستی اس کے پاس سے اٹھا کر خود اس کے قریب والی سیٹ پر جا بیٹھا تھا اور پھر تمام راستے مسلسل اسے تنگ کرتا رہا تھا۔

اسے لگا اس وقت بھی وہ اس کے بالکل قریب بیٹھا ہے اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور گردن موڑ کر اپنے ساتھ والی سیٹ پر دیکھنے لگی جہاں زارا کانوں پر ہیڈ فون لگائے آنکھیں بند کیے انگلش گانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

تب ہی اسے اپنے چہرے پر اس کی نظروں کی تپش محسوس ہوئی بلا ارادہ اس نے ویو بیک مرر کی جانب دیکھا جہاں نہایت سنجیدگی سے بھرپور دو آنکھیں پورے استحقاق کے ساتھ اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ دیر ان آنکھوں کو نہ دیکھ سکی اور کھڑکی کی طرف رخ کر گئی۔

دشوار گزار مگر حسین سفر خوب صورت راستوں کی بھول بھلیوں میں کھو کر کئی گھنٹوں کے بعد اب بالا خر کھل ہو چکا تھا۔

وین سے اترتے ہی سب کو اپنے قدم گویا فرش جنت پر محسوس ہوئے تھے۔ فضا میں پھیلی ٹھنڈک اور بھینی بھینی خوشبو سے سب ہی لطف اٹھا رہے تھے۔ جبکہ سامان ہوٹل میں شفٹ کیا جا رہا تھا۔

شدید سردی کے باعث دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کرتی وہ سائیڈ پر کھڑی تھی۔ ایک سرسری سی نظر اس نے اپنے اطراف میں

دوڑائی ہر منظر بہت شناسا سا تھا وہی برف سے ڈھکی بلند پہاڑیاں وہی نیلگوں بہت پانی وہی آسمان سے اترتے تھے تھے برف کے ذرے وہی سرسراہتی گنگناتی ہوا وہی خوشبوؤں میں بسی معطر فضا۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا کچھ بھی نہیں بدلا تھا لیکن اگر کچھ بدلا تھا تو وہ وقت تھا۔ ایک عرصے میں جو اس کے دل میں محض پل بھر کے لیے اٹھی تھی اور وہ سب کر رہ گئی تھی۔ درد کے باعث آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب تو قیر صاحب سے بات کرتے کرتے اچانک اس کی نظر درخت کے ساتھ ٹیک لگائے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے کنارے صاف کرتی ماہی پر جا پڑی تھی۔ اسے یوں دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھا تھا اس نے ارد گرد ایک طائرانہ سی نظر دوڑائی جہاں سب ایک دوسرے کے ساتھ گروپس کی صورت میں کھڑے ماحول سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گپوں میں مگن تھے۔

بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاس جائے اور اپنی انگلیوں کی پوروں میں اس کے تمام آنسوؤں کو جذب کر لے اور اس کے تمام دکھوں کو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں قید کر لے تاکہ وہ پرسکون ہو جائے بالکل ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح غیر ارادی طور پر اس نے دو قدم اس کی جانب بڑھا دیے لیکن تیسرا قدم اٹھانے سے پہلے ہی وہ اپنی جگہ پر رک گیا۔

طوبی اور زارا اس کے پاس جا پہنچی تھیں اور اب اس کا ہاتھ پکڑ کر سفیدے کے درخت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ وہیں سے واپس پلٹ آیا تھا۔



انہیں یہاں آئے تین دن گزر چکے تھے۔ وہ سب صبح ہی صبح سیر کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور پھر شام ڈھلنے پر ہی لوٹتے تھے۔ پورا اسٹاف اس سفر سے خوب لطف اٹھا رہا تھا۔ ہر چہرہ کھلا کھلا اور ہر آنکھ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سب کتنے مطمئن اور مسرور تھے۔ اس نے ایک نظر سب پر دوڑائی اور ایک گہری

سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے اپنے اندر اور باہر تو بس اداسی ہی اداسی تھی جس کو یہ خوب صورت جگہ بھی دور نہیں کر سکتی تھی بلکہ یہاں آ کر تو وہ مزید خود کو اکیلا اور مضطرب سا محسوس کرنے لگی تھی۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں آ کر اس نے خود کو بے حد خوش اور خوش نصیب تصور کیا تھا شاید یہ اس شخص کی ہمراہی کا اعزاز تھا جو اسے چاہنے کا دعوہ کرتا تھا ہی تو اس کی چاہت میں وہ پور پور ڈوب چکی تھی اور پھر اس نے اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیا جب وہ اس کے بغیر ایک لمحہ سانس لینے کی بھی متحمل نہیں تھی۔ اسے بتائے بغیر کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے اتنی دور چلا گیا کہ کتنی دیر تک اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ عدید میران اسے چھوڑ بھی سکتا ہے جس کے لفظ لفظ سے یقین چھلکتا تھا جس کے حرف حرف میں سچائی گندھی محسوس ہوتی تھی وہ اسے چھوڑ کر محض اپنے برائے فیوچر کی خاطر اس کا اعتماد بھروسہ اور مان سب کچھ توڑ کر خاموشی سے چلا گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے خود کو کس طرح سنبھالا تھا کیسے اپنے ٹوٹے وجود کو بکھرنے سے بچایا تھا کیا کیا جتن نہیں کیے تھے اس نے اپنے دل سے اس کی یاد کے ہر نقش کو مٹانے کے لیے لیکن جب وہ اس کوشش میں کامیاب ہونے لگتی تھی یونہی بالکل اچانک اس کی بات اس کا انداز یا اس کا دھیمالاب و لہجہ اسے کمزور کرنے لگتا تھا اور وہ خود کو مضبوط بنانے کی خاطر اپنے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھنے کی ہرگز روا دار نہیں تھی۔

اس وقت بھی اس کا دل یونہی بھر آیا تھا نہ جانے کون سا احساس تھا جو اس کی آنکھوں کو بھگودیا کرتا تھا کہ ہر منظر دھندلا دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک کر آنکھوں میں تیرتی نمی کو اندر دھکیلتے ہوئے اپنے اطراف میں دیکھا۔

ہر نظارہ نہایت دلکش تھا۔ بدن میں جھڑ جھڑ پیدا کرتی نرم ہوا، فضا میں محور قص تجھے نما بادل، نیلے کنچوں جیسا شفاف پانی، ماحول کو پاکیزہ بناتی پوزے

چاند کی سفید شعاعیں اور اطراف میں پھیلا گہرا سکوت ماحول کو حسین بنا رہے تھے لیکن اسے کسی بھی منظر میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہر شے میں افسردگی اور یاسیت کا عنصر بے طرح نمایاں ہو رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے ماہی، میں تمہیں بالکل اداس یا پریشان نہیں دیکھ سکتا بلکہ مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا کہ تمہارے ارد گرد ایسا ماحول ہو جو تمہاری آنکھوں کو افسردہ کر دے۔“ وہ بہت نرمی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولا تھا۔

وہ جواب فضا میں پھیلی معطر اور بھینی خوشبو کو آنکھیں بند کیے اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اپنے قریب سے آئی اس کی آواز پر جھٹکے سے آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔

وہ کہیں بھی نہیں تھا۔

وہ محض ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

کے بعد دیگرے ذہن پر جھلملانے والی اس کی باتیں اسے اضطراب میں مبتلا کر رہی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر کھڑکی بند کر کے اپنے بیڈ کی طرف بڑھ گئی اور ایک نظر قریب ہی دو سرے بیڈ پر سوئی زارا پر ڈالی جو پرسکون سو رہی تھی۔ وہ حسرت سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بھی تو اسی طرح ہر شے سے بے خبر طمانیت پھری نیند سونا چاہتی تھی لیکن وہ جب سے یہاں آئی تھی ایک لمحہ کے لیے بھی اطمینان سے نہیں سو سکی تھی۔

وہ اب مزید یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا۔ اگر وہ کچھ دن اور یہاں رہی تو اپنی اپنی خودداری سب کچھ ختم کر ڈالے گی۔ وہ ایسے کسی کمزور لمحے کی زد میں آنا نہیں چاہتی تھی جو اسے خود سے دور کر دے اور اس کی شناخت کھو دے۔ وہ بہت مشکل سے خود کو سنبھال پائی تھی اب اتنی آسانی سے اپنی ذات کے غرور کو زمین بوس ہونے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سوچتے سوچتے اسے شدید گھبراہٹ ہونے لگی۔ خود کو ریٹیکس کرنے کی خاطر سونے کی کوشش کرنے لگی اور پھر جلد ہی وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔



”سر ہماری واپسی کب تک ہے؟“ ایک تفریحی مقام پر وہ سب کھانا کھانے میں مصروف تھے جب زارا نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔

”خیریت مس زارا! اتنی جلدی گھبرا گئیں آپ؟“ جواباً اس نے قدرے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”نو سر ایم آل رائٹ بٹ ماہین کچھ گھبرائی ہوئی ہیں رات بھی ٹھیک طرح نہیں سو پاتیں اور پریشان سی رہتی ہیں غالباً“ یہ گھروالوں کو بہت مس کر رہی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار جلدی واپس چلنے کو کہا تو میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں تاکہ یہ ریلیکس ہو جائیں۔“

اس کے سوال کے جواب میں زارا نے تفصیل سے جواب دیا جس کو سن کر وہ اس کے جھکے سر کو دیکھنے لگا جو زارا کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

”آریو شیور کہ آپ گھروالوں کو مس کر رہی ہیں۔“ اس نے لفظ ”گھروالوں“ پر زور دیتے ہوئے پوچھا تو مجبوراً اسے سر اٹھا کر اسے دیکھنا پڑا۔ جو سوالیہ انداز میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں اس کی مسکراتی آنکھوں میں ایسا کیا تھا کہ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور دوبارہ سر جھکا گئی۔

وہ بھی کھانے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ نیبل پر مکمل خاموشی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس نے جواب دینے پر زور نہیں دیا تھا ورنہ نہ پتا نہیں وہ کیا کہہ دیتی؟ اور پھر شاید وہ اس اندرونی کیفیت کو ہمیشہ کی طرح بھانپ گیا تھا جیسا اگلے دن اس نے ایک امپورٹنٹ ڈیلی کیشن سے ملنے کا بہانہ بنا کر سب کو پکنگ مکمل کرنے کا آرڈر دے ڈالا تھا۔

وہ اپنی تمام تیاری مکمل کر کے ہوٹل کے پچھلے حصے میں جہاں ایک چھوٹی جھیل بنی تھی وہاں چلی آئی۔ اسے یہ جگہ شروع سے ہی بے حد پسند تھی وہ الوداعی نظروں سے اس جھیل میں تیرنے والی بطخوں کو تک رہی تھی جب وہ غیر محسوس طریقے سے اس کے

قریب آکھڑا ہوا اور اس کی تقلید میں سفید بطخوں کو دیکھنے لگا۔

”تمہیں یاد ہے جب ہم پہلے آئے تھے تو اس جھیل میں صرف چار بطخیں تھیں اور اب تیرہ ہو چکی ہیں۔“

اس نے چونک کر اپنے بائیں جانب دیکھا جو بطخوں پر سے نظر ہٹا کر اب اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ وہ یہاں کب آیا اسے پتا ہی نہیں چلا، کس قدر گرم ہو گئی تھی وہ گزرے وقتوں کی خوب صورتی میں کہ اس کی آمد سے بے خبر ہی رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں تم کچھ بھی نہیں بھولیں اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم یہاں آکر ان لحوں کو یاد کر کے افسردہ ہو جاؤ جب ہم۔“

اس کی بات مکمل سے بغیر وہ تیزی سے مڑی اور ہوٹل کی طرف چل پڑی۔

اس کے اس طرح کرنے پر وہ خاموشی سے اسے جاتا دیکھتا رہا جو اس سے بات کرنا تو دور بات سننا گوارہ نہیں کر رہی تھی۔ یہاں آکر بھی اس نے کتنی ہی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اسے اس طرح نظر انداز کر دیتی تھی کہ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ہونے لگتا تھا۔

کاش وہ ایک بار اس کی بات سن لے۔ لیکن وہ تو اسے دیکھتے ہی بے زار نظر آنے لگتی تھی۔

کچھ بھی تھا یہاں آنے کے بعد وہ یہ تو جان گیا تھا کہ بظاہر وہ جو بھی کرے اپنے اندر اس کے لیے بے چینی ضرور محسوس کرتی ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ قدرے مطمئن ہو گیا اور ایک گہرا سانس بھرتا ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

”سنائے کیسا ٹرپ رہا جناب کا؟“ احسن پچھلے کئی دنوں سے شہر سے باہر تھا اور اب کراچی پہنچتے ہی وہ اس سے ملنے اس کے آس پاس پہنچا تھا۔ اس سے مصافحہ کے بعد چیئر پر بیٹھتے ہوئے احسن نے خوشدلی سے پوچھا۔

”اچھا تھا۔“ اس نے مختصر جواب دیا تو احسن نے بغور اس کی جانب دیکھا جو کچھ اپ سیٹ دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا مطلب تمہارا صرف اچھا تھا؟“ احسن نے کرید۔ وہ کچھ سیڑیوں ساتھ۔

”کچھ نہیں یار۔ عموماً جس طرح کے ٹرپ ہوتے ہیں یہ بھی ویسا ہی تھا۔“ انٹرکام پر چائے کا آرڈر دیتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کچھ بات نہیں بنی۔“ احسن نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میں وہاں بات بنانے گیا تھا؟“ اس نے گھور کر احسن کو دیکھا۔

”پھر کس لیے گئے تھے؟“ احسن پتا نہیں کیا سننا چاہ رہا تھا وہ ایک نظر اسے دیکھ کر گویا ہوا۔

”جانا تو ضروری تھا یار اور اس جگہ اس لیے گیا تھا تاکہ اس کے ساتھ اس خوب صورت وقت کو یاد کروں جب وہ صرف مجھے سوچتی تھی مجھے دیکھتی تھی۔ میں بس اتنا چاہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح وہاں صرف میری ہو کر رہے لیکن۔“ وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا سو خاموش ہو گیا۔ احسن نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت لفعل۔ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا بات ہے عدید کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو۔“ احسن پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”نہیں یار ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے احسن کو ٹالنا چاہا مگر وہ بضد تھا۔

”کیا بتاؤں یار مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟“ بالآخر وہ بول ہی پڑا تھا مگر کچھ الجھا الجھا سا تھا۔

”میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں اسے منانا چاہتا ہوں اس سب کے لیے جو میں نے اس کے ساتھ کیا جو میرے گھروالوں نے کیا لیکن وہ میری ایک بات بھی سننا پسند نہیں کرتی میں کس طرح اسے کنوینس کروں یار میں بہت الجھن میں ہوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا ہر

وقت ایک عجیب سی بے زاریت سوار رہتی ہے۔ میں آگیا ہوں اس ساری پچویشن سے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے مجھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ میں اتنا غلط نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتی ہے یار میرا خیال تھا وہاں جا کر اس کے رویے میں کچھ تبدیلی آئے گی لیکن۔“ اس کے کبجے سے بے بسی چمک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر احسن خاموش ہو گیا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دے؟ جبکہ اب وہ پہلے کی نسبت مزید حساس ہو گیا تھا اور ماہین کو لے کر انتہائی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے کچھ بھی کہنا یا سمجھانا بے معنی تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد احسن جا چکا تھا اس کے جاتے ہی اس نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک پر گرا دیا اور اسے سوچنے لگا جسے اس کے احساسات کی قطعاً پروانہ تھی۔ وہ خود کو عجیب کیفیت میں گہرا محسوس کر رہا تھا بہت مجبور اور بے بس۔ ایک کوفت سی تھی جو اس کے اعصاب پر سوار اس کے حواس کھور ہی تھی۔

اس نے دیکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور مسئلے کا حل سوچنے لگا مگر اسے کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا تب ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور کان سے لگایا اور کرن کو میسج دینے کے بعد سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی سیٹ کی پچھلی جانب قد آدم گلاس وینڈوسے باہر نظر آنے والی لمبی کشادہ اور پر رونق سڑک پر تیزی سے چلتی ٹریفک پر نظریں جما دیں۔

”مے آئی کم ان؟“ دروازہ کو ہلکا سا ناک کر کے اس نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو پہلے دن کی طرح آج بھی اس کے دل میں بڑے کروفٹ سے براجمان تھی اور ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی بے اعتنائی اور حد درجہ بے رخی کے باوجود وہ اس کا اسی شدت سے طلب گار تھا جس طرح پہلے تھا۔

کاش وہ اپنا دل اس کی طرف سے بالکل صاف

وقت ایک عجیب سی بے زاریت سوار رہتی ہے۔ میں آگیا ہوں اس ساری پچویشن سے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے مجھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ میں اتنا غلط نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتی ہے یار میرا خیال تھا وہاں جا کر اس کے رویے میں کچھ تبدیلی آئے گی لیکن۔“ اس کے کبجے سے بے بسی چمک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر احسن خاموش ہو گیا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دے؟ جبکہ اب وہ پہلے کی نسبت مزید حساس ہو گیا تھا اور ماہین کو لے کر انتہائی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے کچھ بھی کہنا یا سمجھانا بے معنی تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد احسن جا چکا تھا اس کے جاتے ہی اس نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک پر گرا دیا اور اسے سوچنے لگا جسے اس کے احساسات کی قطعاً پروانہ تھی۔ وہ خود کو عجیب کیفیت میں گہرا محسوس کر رہا تھا بہت مجبور اور بے بس۔ ایک کوفت سی تھی جو اس کے اعصاب پر سوار اس کے حواس کھور ہی تھی۔

اس نے دیکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور مسئلے کا حل سوچنے لگا مگر اسے کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا تب ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور کان سے لگایا اور کرن کو میسج دینے کے بعد سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی سیٹ کی پچھلی جانب قد آدم گلاس وینڈوسے باہر نظر آنے والی لمبی کشادہ اور پر رونق سڑک پر تیزی سے چلتی ٹریفک پر نظریں جما دیں۔

”مے آئی کم ان؟“ دروازہ کو ہلکا سا ناک کر کے اس نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو پہلے دن کی طرح آج بھی اس کے دل میں بڑے کروفٹ سے براجمان تھی اور ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی بے اعتنائی اور حد درجہ بے رخی کے باوجود وہ اس کا اسی شدت سے طلب گار تھا جس طرح پہلے تھا۔

کاش وہ اپنا دل اس کی طرف سے بالکل صاف

وقت ایک عجیب سی بے زاریت سوار رہتی ہے۔ میں آگیا ہوں اس ساری پچویشن سے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے مجھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ میں اتنا غلط نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتی ہے یار میرا خیال تھا وہاں جا کر اس کے رویے میں کچھ تبدیلی آئے گی لیکن۔“ اس کے کبجے سے بے بسی چمک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر احسن خاموش ہو گیا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دے؟ جبکہ اب وہ پہلے کی نسبت مزید حساس ہو گیا تھا اور ماہین کو لے کر انتہائی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے کچھ بھی کہنا یا سمجھانا بے معنی تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد احسن جا چکا تھا اس کے جاتے ہی اس نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک پر گرا دیا اور اسے سوچنے لگا جسے اس کے احساسات کی قطعاً پروانہ تھی۔ وہ خود کو عجیب کیفیت میں گہرا محسوس کر رہا تھا بہت مجبور اور بے بس۔ ایک کوفت سی تھی جو اس کے اعصاب پر سوار اس کے حواس کھور ہی تھی۔

اس نے دیکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور مسئلے کا حل سوچنے لگا مگر اسے کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا تب ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور کان سے لگایا اور کرن کو میسج دینے کے بعد سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی سیٹ کی پچھلی جانب قد آدم گلاس وینڈوسے باہر نظر آنے والی لمبی کشادہ اور پر رونق سڑک پر تیزی سے چلتی ٹریفک پر نظریں جما دیں۔

”مے آئی کم ان؟“ دروازہ کو ہلکا سا ناک کر کے اس نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو پہلے دن کی طرح آج بھی اس کے دل میں بڑے کروفٹ سے براجمان تھی اور ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی بے اعتنائی اور حد درجہ بے رخی کے باوجود وہ اس کا اسی شدت سے طلب گار تھا جس طرح پہلے تھا۔

کاش وہ اپنا دل اس کی طرف سے بالکل صاف

وقت ایک عجیب سی بے زاریت سوار رہتی ہے۔ میں آگیا ہوں اس ساری پچویشن سے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے مجھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ میں اتنا غلط نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتی ہے یار میرا خیال تھا وہاں جا کر اس کے رویے میں کچھ تبدیلی آئے گی لیکن۔“ اس کے کبجے سے بے بسی چمک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر احسن خاموش ہو گیا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دے؟ جبکہ اب وہ پہلے کی نسبت مزید حساس ہو گیا تھا اور ماہین کو لے کر انتہائی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے کچھ بھی کہنا یا سمجھانا بے معنی تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد احسن جا چکا تھا اس کے جاتے ہی اس نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک پر گرا دیا اور اسے سوچنے لگا جسے اس کے احساسات کی قطعاً پروانہ تھی۔ وہ خود کو عجیب کیفیت میں گہرا محسوس کر رہا تھا بہت مجبور اور بے بس۔ ایک کوفت سی تھی جو اس کے اعصاب پر سوار اس کے حواس کھور ہی تھی۔

اس نے دیکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور مسئلے کا حل سوچنے لگا مگر اسے کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا تب ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور کان سے لگایا اور کرن کو میسج دینے کے بعد سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی سیٹ کی پچھلی جانب قد آدم گلاس وینڈوسے باہر نظر آنے والی لمبی کشادہ اور پر رونق سڑک پر تیزی سے چلتی ٹریفک پر نظریں جما دیں۔

”مے آئی کم ان؟“ دروازہ کو ہلکا سا ناک کر کے اس نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو پہلے دن کی طرح آج بھی اس کے دل میں بڑے کروفٹ سے براجمان تھی اور ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی بے اعتنائی اور حد درجہ بے رخی کے باوجود وہ اس کا اسی شدت سے طلب گار تھا جس طرح پہلے تھا۔

کاش وہ اپنا دل اس کی طرف سے بالکل صاف

وقت ایک عجیب سی بے زاریت سوار رہتی ہے۔ میں آگیا ہوں اس ساری پچویشن سے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے مجھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ میں اتنا غلط نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتی ہے یار میرا خیال تھا وہاں جا کر اس کے رویے میں کچھ تبدیلی آئے گی لیکن۔“ اس کے کبجے سے بے بسی چمک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر احسن خاموش ہو گیا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دے؟ جبکہ اب وہ پہلے کی نسبت مزید حساس ہو گیا تھا اور ماہین کو لے کر انتہائی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے کچھ بھی کہنا یا سمجھانا بے معنی تھا۔



کر لے تو وہ خود کو کتنا ہلکا سا محسوس کرے گا۔ اپنے دل اور کندھوں پر نظر نہ آنے والے بوجھ کو اتر جانے سے وہ اپنی نظروں میں کتنا معتبر ہو جائے گا لیکن

”مجھے بلایا تھا؟“ اسے اپنی طرف مسلسل دیکھتا ہوا اس نے آگے بڑھے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اسے بھی اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا اور فوراً بول پڑا۔

”ہاں بیٹھو۔“ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ٹیبل کی پاس آ کر کھڑا ہوا اور چیر کی طرف اشارہ کیا مگر وہ بدستور کھڑی رہی تو اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

”ماہی تم جانتی ہو نا میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ کچھ ہی فاصلے پر کھڑا وہ استفسار نہ انداز میں بولا تو اس کی بات پر اس نے تیز نظروں سے اسے دیکھا جو خطرناک حد تک سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ پل بھر کے لیے وہ کچھ بھی نہ بول سکی اور خاموش ہی رہی جبکہ وہ سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمائے جوں کا توں کھڑا تھا۔ وہ اپنے اندر موجود ساری ہمت کو جمع کر کے مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔

”میں تم سے یہاں اس قسم کی باتیں کرنے نہیں آئی اور اگر تم نے مجھے یہاں اس مقصد کے لیے بلایا ہے تو میں۔۔۔“

”ہاں میں نے اسی مقصد کے لیے بلایا ہے تمہیں یہاں اور تمہیں بھی مجھ سے آج بات کرنی ہوگی ماہی۔“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

اس کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے لہذا اس نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور پلٹ کر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے لیکن اسی لمحے اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اپنے سامنے لاکھڑا کیا۔

اس کی اس حرکت پر وہ شدید ہراس مانی اور کتنی ہی دیر تک حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس نے پہلے کبھی اس کا اس طرح ہاتھ نہیں پکڑا تھا بلکہ وہ تو ہمیشہ اس سے ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر بات کرتا تھا

جبکہ آج وہ اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے مخاطب تھا۔

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے کیوں مجھ سے بات نہیں کرتیں تم۔ تمہیں شکایت ہے نا مجھ سے تو کرو ماہی۔ لیکن میرے ساتھ اس طرح جی ہو مت کرو میں مزید تمہارا اس طرح کا رویہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے یاسیت سے کہا۔

”تم سے کس نے کہا کہ مجھے تم سے شکایت ہے؟“ اس کے ہاتھ اپنے بازوؤں پر سے ہٹاتے ہوئے اس نے ترخ کر مزید کہا۔

”اور اگر تمہیں میرا اس طرح کا رویہ برداشت نہیں ہے تو میں تمہیں مزید اس مشکل میں نہیں ڈالوں گی کہ تمہیں مجھے برداشت کرنا پڑے۔“ وہ اتنا کہہ کر تنہائی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی مبادا وہ دوبارہ اس کے سامنے نہ آکھڑا ہو۔

اس کا چہرہ ہوا انداز سے تشویش اور الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اضطرابی کیفیت میں ادھر سے ادھر ٹھٹھا رہا۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس سے بات کرے اور کس طرح اس کے اندر موجود کڑواہٹ کو شیرینی میں تبدیل کرے؟ وہ تو اس کی کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔

وہ متفکر سا چیر کر آبیٹھا اور خالی خالی نظروں سے لپ ٹاپ کو تنگنے لگا۔ اس کا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ٹیبل پر فائلز کا ڈھیر دیکھ کر مجبوراً وہ ہر خیال کو ذہن سے جھٹک کر خود کو فائل میں گم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

\*\*\*

وہ جس وقت گھر پہنچی اس کی اندرونی حالت بہت بری تھی۔ عدید مہران کے ہاتھوں کا لمس اسے اب بھی اپنے بازوؤں پر محسوس ہو رہا تھا اس کی اس حرکت نے اسے اندر تک ہلا ڈالا تھا اور شاید وہ یہی چاہتا تھا تاکہ وہ

ٹوٹ جائے اور پھر اس کے آگے بکھر کر اپنی انا کھو دے، اپنی ذات کے غرور کو فنا کر دے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی تھی اس نے بہت مشکل سے اپنا آپ بجا کر رکھا تھا۔ خود کو کس طرح اس تکلیف سے نکالا تھا جو اس کے رویے نے اسے پہنچائی تھی یہ وہی جانتی تھی۔ اور اب وہ ایسے کسی لمحے کی زد میں آنا نہیں چاہتی تھی جو اسے خود سے اس حد تک بے گانہ کر دے کہ وہ اس اذیت کو بھلا دے جو اس نے اسے دی تھی۔

وہ کچھ بھی کھائے پیے بغیر اپنے کمرے میں جا چکی اور خود کو ریلیکس کرنے کی سعی کرنے لگی۔ اسی کوشش میں اس کی آنکھیں بھگ گئی تھیں پھر یکدم وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

وہ اس کے سامنے خود کو جتنا مضبوط ظاہر کرتی تھی اندر سے اتنی ہی کمزور ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اپنا بھرم اس کے سامنے ہرگز کھونا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اس سے بات کرنے سے حتی الامکان گریز کرتی ورنہ وہ بھر بھری مٹی کی طرح بکھرتی چلی جاتی اور وہ اسے روندنا آگے بڑھ جاتا۔ پتا نہیں کیوں اب وہ اس پر اعتبار کرتے ہوئے ڈرنے لگی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو ایک بار پھر وہ اس کے بھروسے کو توڑنا آگے نکل پڑے اور وہ دوبارہ شاید اٹھ بھی نہ سکے اور پھر خود کو کہیں دفن ہی نہ کر ڈالے جبکہ ماہین عزیز کی ذات اور اس کا وجود اتنا ارزاں نہیں تھا کہ وہ جب مرضی اس کو تھیک کا نشانہ بنا کر پلٹ جاتا۔

شاید یہی وہ خوف تھا جو اسے اس کے سامنے مضبوط بنائے رکھتا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے پر سوچ نظروں سے چھت کو تنگنے لگی۔

\*\*\*

اگلے دن وہ مقررہ وقت پر اپنے آفس میں داخل ہوا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی معمول کے مطابق ای میلز

چیک کر رہا تھا جب اس کی نظر ایک ٹائپ شدہ ریزنگنیشن لیٹر پر جا پڑی۔

اس نے یکے بعد دیگرے تین بار اس لیٹر کو پڑھا جو ماہین عزیز کی طرف سے تھا۔ اس کا دل غ بھگ سے اڑ گیا تھا اور اعصاب مکمل طور پر تن گئے۔ غصے سے اس وقت اس کا برا حال تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کاغذ کو گھورتا رہا پھر زور سے چیخ پیچھے کی جانب دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ میں کچھ پیپرز پکڑے تیزی سے باہر نکل گیا۔

”ایکسکیوزی اساف۔“ تمام ایمپلائز سر جھکائے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے جب اچانک اس کی کرخت آواز اور سخت لہجے پر سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے اور یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کیا سمجھتے ہیں آپ لوگ، یہ کمپنی آپ کے بغیر نہیں چل سکتی یا میں نہیں چل سکتا؟“ وہ باری باری سب پر نظر ڈالتے ہوئے درشتگی سے مزید بولا۔

”جس کا جب دل چاہتا ہے وہ لیو (چھٹی) پر چلا جاتا ہے اور جب دل چاہتا ہے وہ آفس چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے دیتا ہے کیوں؟“ اس کا انداز سوالیہ جبکہ لہجہ وہی تھا۔

”جواب کرنے کے کچھ روز ہوتے ہیں کچھ ریگولیشنز ہوتی ہیں جن کے مطابق چلنا آپ کا فرض بنتا ہے کمپنی کے ساتھ کیے گئے ایگریمنٹس کی خلاف ورزی کی صورت میں آپ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں لہذا احتاط رہیے گا اور ایک بات جو میں آپ سب کو بتا رہا ہوں کہ آپ کے اپنے ذاتی مسائل جتنے بھی ہوں ان کا اثر آپ کے کام یا آپ کی جاب پر نہ پڑے تو بہت بہتر ہو گا ورنہ جو چھوڑ کر جانا چاہتا ہے جائے۔“

آخری بات کہتے وقت اس نے محض ایک نظر اس پر ڈالی تھی پھر ہاتھ میں پکڑے پیپرز قریب رکھے کاؤنٹر پر پٹختے والے انداز میں رکھتا واپس پلٹ گیا۔

اس کے جاتے ہی پورے اساف میں چہ گوئیاں



شروع ہو گئی تھیں۔ سب لوگ اس کے رویے کو لے کر بات کر رہے تھے۔ کیونکہ اب سے پہلے اس نے کبھی ان سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ آفس میں موجود ہر شخص ہی حیران ہو رہا تھا اور وہ بظاہر کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے خاموشی سے اپنا کام کرنے میں توجہ ہو چکی تھی۔ لیکن ذہن اس کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ شدید غصے میں اپنے روم سے باہر نکلا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا آفس چھوڑ آیا۔ اس کا دماغ بری طرح گھوم رہا تھا سو یہی بہتر تھا کہ وہ آفس سے ہی نکل آئے ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے اس طرح کرنے پر وہ اس کی طبیعت ہی صاف کر دے۔ لیکن وہ آفس میں کسی قسم کا تماشہ افروز نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس وقت خود کو ریلیکس کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا سولانگ ڈرائیو پر نکل کھڑا ہوا۔ اس دوران وہ مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تب ہی یکدم ذہن میں در آنے والے ایک خیال نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

”اگر واقعی وہ کل نہ آئی تو اسے کہاں ڈھونڈے گا؟“ نہ تو اسے اس کا ایڈریس معلوم ہے اور نہ کوئی فون نمبر۔ یہ بات پہلے اس کے ذہن میں ہی نہیں آئی اس نے جھٹکے سے گاڑی ایک سائیڈ پر روکی۔ اس کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ وہ تو بے وقوفی کر رہی تھی لیکن اسے تو دانش مندی سے کام لینا چاہیے تھا۔ اس نے باتیں ہاتھ کی کلانی پر بندھی رسٹ ورائج کی جانب دیکھا۔ شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ آفس ٹائم بھی ختم ہونے کو تھا۔ یقیناً ”بہت سے ایسپلائز آفس سے نکل چکے ہوں گے کچھ سوچتے ہوئے اس نے آفس کا نمبر ملایا۔“

دوسری طرف کرن موجود تھی۔ وہ اس سے آفس سے متعلق دو تین باتیں پوچھ کر اصل مقصد کی طرف آگیا۔

”مس کرن مجھے یہ بتائیے کہ آفس میں موجود تمام

ایسپلائز کے ایڈریسز اور فون نمبرز فیڈ کیے ہوئے ہیں آپ نے؟“ اس نے اپنے اندر کی گھبراہٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

”میں سر سب کچھ فیڈ ہے۔“ کرن نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

”اوکے تھینکس۔“ وہ سکون کا سانس بھر کر رہ گیا۔ پھر دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھالے گیا۔ پتا نہیں وہ کل آفس آئے گی یا نہیں؟ یہی سوچ اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

ہر روز اسے دیکھ کر اس کی آواز سن کر اسے جو اطمینان اور سکون ملتا تھا وہ کسی طور اسے کھونے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے یقین تھا وہ یونہی کسی دن اسے ضرور منالے گا لیکن اس کے جاب چھوڑنے کا سن کر تو اس کے حواس ہی گم ہونے کو تھے۔

اسے کل صبح کا بے چینی سے انتظار تھا، معلوم نہیں وہ آئے گی یا نہیں؟

\*\*\*

”آئی ریٹلی ڈونٹ نو ماہین کہ تم چاہتی کیا ہو؟“ سویرا قدرے تعجب اور پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مریم کے سرال والے کسی بھی وقت شادی کی ڈیٹ فکس کرنے پر زور دے سکتے ہیں پھر ایسے میں تم اتنی بڑی حماقت کیسے کر سکتی ہو؟ مجھے واقعی تم سے ایسی امید نہیں تھی ماہین اور تمہیں پتا ہے آج صبح ہی مریم کے سرال والے آئے تھے، مجھے فاطمہ بچو نے بتایا ہے۔“ وہ چپ چاپ سویرا کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ یوں اچانک مریم کے سرال والے اگلے دو ہفتوں تک شادی کرنے کا عندیہ دے سکتے ہیں اور ایسے میں وہ یہ جاب بھی چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے گی تو اتنا انتظام کیسے ہو سکے گا۔

اپنی جلد بازی پر وہ خود بھی پچھتا رہی تھی کیا تھا اگر کچھ عرصہ مزید وہ عدید مہران کو برداشت کر لیتی؟ کم از کم

اتنی بڑی پریشانی کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔

”تم نے یہی سوچا تھا کہ تم مریم کی شادی سے پہلے کمپنی سے لون لوگی پھر تم نے یہ اسٹیپ لینے سے پہلے کیوں نہیں سوچا کہ جاب چھوڑ کر کروگی کیا؟“ سویرا کو اس پر حقیقتاً ”بہت غصہ آ رہا تھا اور وہ غصے میں بولے جارہی تھی اور وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنے جارہی تھی کہ وہ کچھ ہی تو کہہ رہی تھی۔

”بائے واوے ماہین یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تم اب بھی عدید کو پسند کرتی ہو اسے چاہتی ہو اور جو کچھ بھی اس نے کیا یا ہوا وہ اس سب کے لیے تم سے سو رہی بھی کر چکا پھر تمہاری ضد کیا معنی رکھتی ہے میں سمجھ نہیں سکی۔ عدید مہران جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں ماہین ورنہ پانچ سال کا عرصہ انگلش کنٹری میں گزارنے کے بعد کون واپسی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کون اپنی محبت کو یاد رکھتا ہے لیکن تم ہو کہ فضول سی ضد میں خود بھی تکلیف میں رہتی ہو اور اسے بھی۔“

”میں کسی تکلیف میں نہیں رہتی سویرا! کیونکہ مجھے جتنی تکلیف ہوتی تھی وہ بہت پہلے ہی سہہ چکی ہوں۔“ وہ سویرا کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔

”اوکے“ اوکے پلیز ریلیکس چھوڑو اس بات کو اور اب یہ سوچو تم نے کرنا کیا ہے۔“ سویرا جانتی تھی وہ اس موضوع پر اس سے ٹھنڈے دل سے کبھی بات نہیں کرے گی اور اب بھی اصل بات اس کے مزاج کی نذر ہو جاتی سو اس نے بات ہی بدل دی سویرا کی بات پر وہ ایک بار پھر چپ ہو گئی تھی۔ اسے تو خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

”غلطی تو تم سے ہو گئی ماہین اور اس کا ازالہ بھی تم ہی نے کرنا ہے۔ اور ویسے بھی کمپنی نے تو تمہیں انکڑٹ نہیں کیا تھا نا، تم خود ہی چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن اب دوبارہ جوائن کرنا چاہتی ہو اس کمپل اور ٹھینک گاڈ کہ تم نے آفس میں کسی کو اپنے ریزنگیشن کا نہیں بتایا اور یہ بات صرف عدید تک

ہی محدود تھی تو تمہارے حق میں ہے یہ سب ورنہ دوسری صورت میں تمہیں سب کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے۔ بہر حال فیصلہ تم نے کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا پلیز۔ میں چلتی ہوں اب کل آؤں گی اوکے۔“

سویرا اس کی اسکول فرینڈ تھی اور اس کی بہت خبر خواہ بھی سوچ بھی موقع ملتا اسے سمجھانے لگتی تھی اور وہ اس کی ہر بات خاموشی سے سن لیتی تھی لیکن عدید مہران کے نام پر وہ بل بھر میں بھڑک اٹھتی تھی۔ اسی لیے سویرا بہت سنبھل کر اس کا ذکر کرتی تھی۔ اس نے سویرا کو گیٹ تک چھوڑا پھر دوبارہ اپنے کمرے میں آگئی۔

اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ اس وقت خود کو عجیب سچویشن میں گھرا محسوس کر رہی تھی۔ جس کا کوئی حل اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت اسے بس مریم کی فکر ستائے جارہی تھی۔ کاش ماموں ان کا تھوڑا سا تو خیال کرتے، ان کا حق انہیں دیتے تو آج اتنی پریشانی تو اٹھانی نہ پڑتی۔

ایک بار پھر اس کی ذہنی رو بھٹک گئی تھی اور اس کے دل میں ماموں کی فیملی کے خلاف عناد بھر آیا تھا۔ جس کے ہر فرد نے مل کر انہیں مجبور و بے بس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

دوسری طرف ایسے امی سمیت فاطمہ بچو اور مریم کی فکر ستائے جارہی تھی جن کو اس نے مکمل اطمینان دلایا ہوا تھا کہ اس کی کمپنی اسے لون دے گی تو وہ آرام سے مریم کی شادی کر سکیں گے لیکن اب۔۔۔ اب کیا جواب دے گی وہ انہیں؟ اسے شدید گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

\*\*\*

وہ بڑی بے چینی سے آفس کی طرف بڑھ رہا تھا چند لمحوں کا فاصلہ اسے برسوں پر محیط لگ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہونی جارہی تھیں۔ وہ جلد سے جلد آفس پہنچنا چاہتا تھا۔



کاش ایسا ہو کہ وہ آفس میں قدم رکھتے ہی اسے نظر آجائے۔  
لفٹ کا بٹن پریس کرتے ہوئے بے اختیار اس نے دعا مانگی پھر باہر نکل کر تیزی سے اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

گلاس ڈور دھکیل کر جس وقت وہ اندر داخل ہوا حسب معمول تمام ورکرز اٹھ کھڑے ہوئے اور گڈ مارنگ دس کرنے لگے مگر وہ غائب دماغی سے چلتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور پھر غیر ارادی طور پر دائیں جانب بنے کیبن کی طرف لمحہ بھر کو نظر اٹھا کر دیکھا وہ بھی حسب معمول کھڑی اس پر ایک نظر ڈال کر سر جھکا گئی تھی۔ طمانیت بھرا سانس اپنے اندر اتار تا وہ مطمئن سا اپنے روم میں چلا آیا اور پرسکون انداز میں سیٹ پر جا بیٹھا۔

طبیعت میں جو بوجھل پن تھا وہ اب یکسر غائب ہو چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور پھر جس وقت اس نے لیپ ٹاپ آف کیا شام کے چار بجے تھے۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور آفس سے باہر نکل آیا تقریباً آدھا گھنٹہ بعد وہ تسمینہ پھپھو کے گھر پر موجود تھا۔

”عید تم۔“ دستک کے جواب میں دروازہ فاطمہ بھو نے کھولا تھا اور دروازہ کے دوسری طرف اسے دیکھ کر خوشی اور حیرت کے طے جلے تاثرات سمیت وہ غم آنکھوں سے کتنی دیر تک اسے دیکھتی چلی گئی تھیں۔ ”السلام علیکم بھو۔“ اس کے سلام کرنے پر انہوں نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اسے لیے اندر چلی آئیں اور امی کو آواز دے کر بلانے لگیں۔ تسمینہ پھوپھو کا حال بھی بھو سے کچھ مختلف نہ تھا بلکہ وہ تو اسے گلے لگا کر باقاعدہ روی پڑی تھیں۔

”ترس گئی تھی میں تو اپنوں کو دیکھنے کو تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آئی ہے بیٹا۔ بس اب اس طرح دور مت جانا۔“ اور پھر باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور پھر اتنا اس وقت چلا جب وہ شام سات بجے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

نہ جانے کون کون سے راز و نیاز ہو رہے تھے کہ اسے دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ یوں اچانک اسے یہاں پا کر وہ بوکھلا سی گئی تھی مگر جلد ہی اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے امی اور بھو کو سلام کر کے جھٹ کمرے سے باہر نکل آئی۔

پتا نہیں کیوں اسے دیکھتے ہی اس کا گلا خشک پڑ گیا تھا۔ وہ سیدھی کچن میں چلی آئی اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی اندیلنے لگی۔

”ماہین تم نے عید کو نہ سلام کیا اور نہ دو گھڑی اس کے پاس بیٹھیں یہ کیا طریقہ ہے۔ وہ کتنے برسوں یہاں آیا ہے اور نہ جانے کس طرح ہم تک پہنچا ہے؟ لیکن تم ہو کہ۔۔۔“

”جانتی ہوں میں وہ کس طرح یہاں تک پہنچا ہے۔“ وہ محض سوچ کر ہی رہ گئی۔ پھر مزید ان کی کوئی بات سننے بغیر کچن سے باہر نکل گئی۔

اس کے اس رویے پر فاطمہ بھو محض تاسف سے سر ہلا کر اسے دیکھتی رہیں جو اپنے کمرے میں جا کھسی تھی اور پھر اس کے جانے تک وہ کمرے میں بند ہی رہی۔ اس نے باہر آنے کی تکلیف کی تھی اور نہ کسی نے اسے بلانے کی۔

”آئی کھانا کھا بیچے۔“ وہ یقیناً ”جا چکا تھا تب ہی مریم کھانے کی ٹرے سجائے کمرے میں داخل ہوئی تھی وگرنہ جب سے وہ آیا تھا مریم نے بھی اس کے پاس آنے کی زحمت کی تھی۔

پتا نہیں کون کون سے راز و نیاز ہو رہے تھے کہ کوئی بھی اس کے پاس سے ملنے کو تیار ہی نہ ہو رہا تھا۔ کچن سے آئی مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے اسے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ وہ رات کا کھانا کھا کر ہی جائے گا۔

”آپ کو پتا ہے آپ عید بھائی ہم سب کے لیے گفتش لائے ہیں اور انہیں کھانا بھی بہت پسند آیا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ وہ ان کھانوں کو ترس ہی گئے تھے۔“

مریم اس کی پلیٹ میں بریانی نکالتے ہوئے بڑے شوق سے اس کی باتیں بتا رہی تھی جن کو وہ بے دلی سے سنتی رہی پھر کھانے میں مصروف ہو گئی۔

اس کی عدم دلچسپی کے باعث مریم جلد ہی اس کے پاس سے اٹھ گئی جبکہ وہ کھانے سے فارغ ہو کر بلا ارادہ اسے سوچنے لگی جو اسے بتائے بغیر گھر تک آپہنچا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی وجہ سے وہ آج امی سے ٹھیک طرح مل بھی نہیں سکی تھی۔

امی کا چہرہ خوشی اور مسرت سے جگمگا رہا تھا۔ کتنے ہی عرصہ کے بعد وہ ان کو اس طرح خوش دیکھ رہی تھی لہذا اس کے متعلق کچھ بھی غلط کہنے سے باز ہی رہی اور چپ چاپ ان کی سننے لگی۔ جن کی زبان پر ماموں جان اور مائی جی کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ نہ کوئی شکوہ نہ کوئی شکایت۔ وہ حیرت سے ان کے کھلتے چہرے اور مسکراتی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی اور اس کا یا پلٹ پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔



اگلے ہفتہ مریم کا نکاح طے پا گیا تھا اور اب تیاریوں میں محض نو دن باقی تھے۔ وہ بوکھلا گئی تھی کہ اتنے کم دنوں میں کس طرح تمام تیاریاں مکمل ہوں گی۔ جبکہ کمپنی نے بھی لون رجیسٹر کر دیا تھا۔

”کمپنی ایسا کیسے کر سکتی ہے؟“ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے تو قیر صاحب سے لون رجیسٹر ہونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا س ماہین یہ سب تو سر ڈیپارٹمنٹ کرتے ہیں کہ کس کو لون دینا ہے اور کب دینا ہے؟ انہوں نے اگر رجیسٹر کیا ہے تو یقیناً کوئی وجہ ہوگی بہتر ہے آپ ایک دفعہ ان سے خود بات کر لیں اور اپنی مجبوری ان کو بتائیں ہو سکتا ہے وہ یہ لون پاس کر دیں یہ تو آپ کا حق ہے۔“

تو قیر صاحب نے بروڈیشنل طریقے سے اسے مشورہ دیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔ لون کے لیے اس کے پاس جانا اس کے لیے سوہان روح ہی تو تھا وہ مزید بل کر رہ گئی

”تو قیر صاحب آپ ان سے بات کر لیجیے پلیز۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہیں وہ بھی انکار نہ کر دیں۔

”میں کوشش کروں گا“ آپ فکر نہ کریں اوکے؟“ اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر تو قیر صاحب نے تسلی دینے والے انداز میں کہا تو وہ ان کا شکر ادا کرتی پڑمروہ قدموں سے چلتی ہوئی اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔

”ماہین تمہیں عید سراسر اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔“ زارا نے گزرتے ہوئے اسے پیغام دیا تو ناچار اسے اٹھ کر جانا پڑا۔

اجازت طلب کر کے وہ اس وقت اس کے بالکل سامنے چیئر کے پاس جا کھڑی ہوئی جبکہ وہ یونہی سر جھکائے فائل میں گم تھا۔ اس نے غور کیا اب وہ پہلے کی طرح اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا اور نہ اسے بات کرنے پر فورس کرتا تھا۔ اس کا رویہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا اس کے ساتھ اب بھی اس نے ایک بار بھی اسے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا جس طرح وہ پہلے کہا کرتا تھا اور نہ ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

پتا نہیں کیوں وہ اس کے اندر آئی ان تبدیلیوں کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”تو قیر صاحب نے تمہارے لیے لون کی سفارش کی تھی مجھ سے۔“ وہ بدستور فائل پر سر جھکائے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ جواباً ”کیا کہے سو خاموش ہی رہی۔“

”اگر تمہیں یہ لون نہیں ملتا تو؟“ اب کی بار وہ سر اٹھا کر اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا تو اس نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا جس نے اسے اس لیے اپنے آفس میں بلایا کہ وہ اس کے جذبات سے کھیلے اس کی مجبوریوں کا مذاق اڑائے اور وہ۔ وہ اس سے گڑگڑا کر بددماغی۔ لیکن چہ افسوس کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خود پر ضبط کیے بمشکل اس کے سامنے کھڑی تھی



”مریم میری بھی بہن ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے“ خاص طور پر تمہیں۔“

اس کا ہاتھ ہنڈل پر دھرا تھا جب اسے اپنی پشت پر اس کی مضبوط کبجے میں کسی بات سنائی دی۔ وہ اسی خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور وہ بند دروازے کو کتنی ہی دیر تک تکتا رہا۔



”اللہ تیرا شکر ہے۔ تو نے میرے لیے عید کو فرشتہ بنا کر اتارا اور نہ میرے اندر اتنی سکت کہاں تھی؟“

مریم بخیر و خوبی اپنے گھر رخصت ہو چکی تھی اور امی اٹھتے بیٹھتے عید کے لیے دعا گو تھیں جس نے اخراجات کے علاوہ تمام انتظامات احسن طریقے سے سنبھالے ہوئے تھے اس دوران وہ خاموش ہی رہی تھی کیونکہ کچھ کام ایسے تھے جن کو واقعی وہ کرنے کی اہل ہرگز نہیں تھی اور ایسے میں کسی مرد کی ضرورت لازمی تھی۔

امی کی زبان پر اسی کے گن تھے جس نے اس مشکل وقت میں ان کا ہر طرح سے ساتھ دیا اور بیٹا ہونے کا فرض نبھایا۔ بلکہ تا صرف وہ اس کے اب تو ماموں جان اور مائی جی سے ملنے کو بھی بے تاب نظر آتی تھیں۔

وہ حیرت سے امی کو دیکھتی جنہوں نے اتنی آسانی سے وہ سب کچھ کیسے بھلا دیا جس کو یاد کر کر کے وہ رویا کرتی تھیں۔

اسے امی پر غصہ آتا تھا جس کا اظہار وہ دے دے لفظوں میں کر جاتی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے ملاحظہ کریں)



مگر مزید کھڑے رہنا نہیں چاہتی تھی۔

”تو اس اوکے۔“ وہ کچھ بھی کہنا یا سننا نہیں چاہتی تھی سوائے کہہ کر ہٹ گئی اور ابھی وہ دو قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ وہ تیزی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے چیخ کر بولا۔

”کیا سمجھتی ہو تم خود کو ہاں؟“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ غرا کر اس سے مخاطب تھا۔

”پچھلے تین دنوں سے میں تم سے تمہاری ریزنگنیشن والی حرکت پر ناراض ہوں اور تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ میں خود روٹھتا ہوں خود مان جاتا ہوں تمہیں احساس ہی نہیں ہو پاتا۔ تم اتنا نہیں سمجھتیں کہ خود میں نے نہیں عید مہران پر کتنا حق دیا ہوا ہے کہ جب چاہو اور جتنا چاہو اسے استعمال کر سکتی ہو لیکن تم تم نے تو بے حسی کی انتہا کر دی ہے مای۔ تم تو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ میں نے لون رہا جیکٹ کیا ہے تو کیوں؟“ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

”کیونکہ میں چاہتا تھا تم خود مجھ سے مریم کی شادی کا ذکر کرو ماکہ مجھے بھی یہ احساس ہو کہ میرا بھی تم پر کچھ حق ہے لیکن۔۔۔ تم نہیں جانتیں یہ احساس میرے لیے کس قدر قیمتی ہوتا اگر تم مجھ پر واضح کرنے کی کوشش کرتیں۔“ اسے اپنے بازوؤں میں اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی سختی بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔

”تم نے لون کے لیے اپلائی کیا تھا تو تمہیں لگا میں تمہیں لون دوں گا۔“ اس کے کبجے سے افسوس چھلک رہا تھا۔

”بہت دکھ کی بات ہے مای کہ تم نے مجھے اتنا گرا ہوا سمجھا۔ میرے نزدیک میرا سب کچھ صرف تمہارا ہے اور میں تمہیں لون دوں گا یہ میرے لیے باعث شرم ہے۔“

وہ بہت آزرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس اپنے اندر اتارا پھر آہستگی سے اس کے بازوؤں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے تو وہ کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔



# دستِ گداز

زویہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی، جبکہ زویہ ان سے بات کر کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوئی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زویہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔ وہ روح کو بلائے کی کوشش کرتی ہے۔

رہ میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لچ کی دعوت دیتی ہے۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے اور انہیں بچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زویہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔

۲۶  
چھٹی سیریا قسط ۱





”کیا بات ہے مس زوسہ! کیا میں نے کوئی نامناسب بات کہہ دی ہے جو آپ اس طرح خاموش ہو گئی ہیں۔“  
 خرم نے ٹوکتے ہوئے کہا تو زوسہ چونک اٹھی۔  
 ”نہ نہ نہیں میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں کیسے آؤں گی۔ میرا مطلب ہے۔“  
 ”میں آپ کو آپ کے گھر سے پک کر لیتا ہوں اور پھر میں خود ہی ڈراپ بھی کر دوں گا۔“ خرم نے فوراً مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن۔۔۔ اس طرح تو میرے گھر والوں کو پتا چل جائے گا۔“ زوسہ پریشانی سے بولی۔  
 ”کیسے پتا چل جائے گا۔ آپ صبح کے ٹائم پر کہیں تو جاتی ہوں گی۔ میرا مطلب ہے آپ کیا کرتی ہیں۔ پڑھائی یا جاب؟ اگر گھر سے نکلنا مشکل ہے تو میں آپ کو آپ کے کالج یا آفس سے پک کر لیتا ہوں۔“ خرم کے سکون سے کہنے پر زوسہ جھل ہو کر رہ گئی۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اس سے کیسے کہے کہ وہ تو اپنی پڑھائی وغیرہ چھوڑ کر گھر میں بڑی ہوئی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی مقصد ہے نہ اس کے وجود کا کوئی مصرف وہ تو بس صبح کو شام اور شام کو صبح کر کے اپنی زندگی کا وقت پورا کر رہی ہے۔

”ہیلو مس زوسہ آپ سن رہی ہیں نا۔“ خرم نے اپنے لہجے کے چڑچڑے پن کو چھپاتے ہوئے بظاہر سمانیت سے پوچھا اور نہ دل تو چاہ رہا تھا صاف ٹوک دے۔

”کہاں کھو جاتی ہو بار بار۔ ذرا دماغ کو حاضر رکھ کر بات کرو۔“  
 ”ایک چولی میں فی الحال گھر رہی ہوتی ہوں ابھی آگے کچھ پڑھنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔“ زوسہ یہ ذکر گول کر گئی کہ وہ کون سا امتحان دے کر فارغ ہوئی ہے۔

اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خرم نے اسے کریدنے کی بجائے اپنے ہی موضوع پر بات جاری رکھی یعنی اسے زوسہ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ صرف اسے کسی اور مقصد سے بلارہا تھا۔

”اگر آپ آج کل فارغ ہیں تو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے اپنے پیرینٹس سے کہیں میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے سبجیکٹس وغیرہ کا سر دے کرنے یونیورسٹی جانا چاہتی ہوں۔“

پھر تو مجھے پک بھی نہیں کرنا پڑے گا اور آپ کے قادر خود آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔“ خرم کو امید تھی اس مشورے پر وہ ضرور سوچ میں پڑ جائے گی اور دوسری طرف پھیلی خاموشی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس کی امیدوں پر پوری اتر رہی ہے۔

اپنا تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ ابھرنے لگی مگر زوسہ کے سوال نے اسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب کر دیا۔

”آپ مجھے یونیورسٹی میں کیا دکھانا چاہتے ہیں۔“ خرم کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیا جواب دے بات کوئی ایسی معقول ہونی چاہیے تھی جسے ہی زوسہ آنے کے لیے نا صرف تیار ہو جائے بلکہ تڑپ اٹھے۔  
 ”مجھے جو دکھانا ہے وہ تو بعد کی بات ہے۔“ خرم کو سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا یہی بات گھاتے ہوئے بولا۔

”پہلے آپ یہ بتائیں کہ یہ آپ کی شائستہ خالہ کون تھیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“  
 ”جی۔“ زوسہ حیران ہوئی۔  
 ”جی، میرا یہ سب جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ مجھے لگتا ہے شائستہ خالہ کی روح بہت بے چین ہے وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہے اور ہمیں کچھ سمجھانا چاہتی ہے۔“ خرم کا ذہن پھر کی طرح چلنے لگا۔

ڈراؤنی فلمیں دیکھنے کا شوق اسے بچپن سے تھا ساری فلمیں کم و بیش ایک ہی فلسفے پر مبنی تھیں ایک بھٹکتی ہوئی روح اس لیے بے چین ہوتی ہے کہ یا تو کسی نے اسے قتل کر دیا ہو نا ہے یا خود کسی پر مجبور کر دیا ہو نا ہے۔  
 دونوں صورتوں میں صورت حال ایک ہی ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے ایک مسکین کے اوپر ظلم کی بارش اور پھر اسی مظلوم کے دل میں اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کا جذبہ جو اسے مرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیتا اور دنیا میں واپس بلا لیتا ہے۔

ایسے ہی موضوع پر مبنی ان ایک فلموں میں سے کسی ایک کا مرکزی خیال چراتے ہوئے خرم نے اپنا لہجہ سنسنی خیز بنالیا۔

”مجھے یقین ہے ان کے ساتھ کوئی انصافی ہوئی ہے جو وہ ہمیں بتانا چاہتی ہیں ماکہ ہم انہیں انصاف دلائیں ان پر ہوئے ظلم کا انتقام لیں۔“ خرم کتا چلا گیا۔

زوسہ سانس روکے اسے سن رہی تھی اسے اکثر یہی لگتا تھا کہ شائستہ خالہ اسے کچھ سمجھانا چاہ رہی ہیں مگر وہ سمجھ نہیں پا رہی۔ تبھی وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا تھا ان کے ساتھ اور اب ہم ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“ اس کے سوال پر جوش سے بولتے خرم نے اپنے لہجے میں سارے جہاں کی تھکن سموتے ہوئے کہنے کی کوشش کر کے کہا۔

”یہ تو میں بھی نہیں جانتا اگر جانتا ہوتا تو اب تک ان کی روح کو اس کرب سے نکال چکا ہوتا لیکن تمہاری تو وہ خالہ تھیں تمہیں تو پتا ہو گا ان کے ساتھ کیا ہوا تھا آئی مین! ان کی ڈیٹھ کیسے ہوئی تھی؟“ خرم ایک دم چونک کر بولا

آخر کو کوئی بھی کہانی گھڑنے سے پہلے تھوڑا بہت سیاق و سباق معلوم کر لینا اشد ضروری تھا مگر اس بار زوسہ کے جواب نے اسے ناچاہتے ہوئے بھی حیران ہونے پر مجبور کر دیا۔

”میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی میں نے تو انہیں کبھی دیکھا بھی نہیں۔“  
 ”دیکھا نہیں، لیکن سنا تو ہو گا اپنی مدر سے تم ان کے بارے میں پوچھ سکتی ہو۔“ خرم کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”بہت بار پوچھ چکی ہوں مگر ماما کچھ نہیں بتاتیں وہ کیسی تھیں؟ ان کی موت کیسے ہوئی تھی؟ ماما اس ٹاپک پر بات ہی نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ تو یہاں تک کہتی ہیں کہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں ہے۔“ زوسہ کی آواز میں محسوس کی جانے والی بے بسی تھی خرم چند لمحوں کے لیے اداکاری بھلا کر بڑی بکھیرتا سے کہنے لگا۔

”آپ کی ماں اپنی بہن کے وجود سے ہی انکار کر دیتی ہیں پھر تو معاملہ واقعی بہت سیریس ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟“ زوسہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی پر ٹھٹھک گئی۔

”مطلب ان کے ساتھ جو ہوا تھا وہ تمہاری ماں کے لیے اتنا باعث شرمندگی ہے کہ وہ اسے بیان کرنے سے بچنے کے لیے یہاں تک کہہ دیتی ہیں کہ میری کوئی بہن ہی نہیں تھی۔“ خرم فکر مند نہیں ہوا تھا البتہ متحسّس ضرور ہو گیا تھا۔

اسے روح بد روح پر تو یقین نہیں تھا لیکن اسے شائستہ خالہ کے ساتھ ہوئے سانحہ کی تفصیل جاننے میں دلچسپی ہو گئی تھی مگر زوسہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو خرم کی بات سن کر خجالت محسوس کر رہی تھی تبھی گم سم سی ہو گئی۔

خرم اس کی خاموشی پر رور ہو کر اپنے موضوع پر واپس آ گیا اور بہت سوچتے ہوئے بولا۔

”مجھے کئی بار ایسا لگا ہے کہ شائستہ خالہ کی روح یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ کے ارد گرد موجود ہوتی ہے ایک بار



میں نے انہیں فلو کرنے کی کوشش کی تو وہ ایک کمرے کے سامنے آکر رک گئیں اور اچانک غائب ہو گئیں۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کیا کروں آخر میں نے اس کمرے میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ ”خرم پوہ لے بولتے رک گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب آگے کیا کہے۔“

”پھر؟ پھر کیا ہوا؟“ زبیرہ کے بے چینی سے پوچھنے پر اسے تھوڑا سا سکون ہوا کہ وہ اس کا تجسس جگانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

لیکن اس وقت خوش ہونے کا ٹائم نہیں تھا وہ فوراً ہی ذہن کو حرکت میں لاتے ہوئے کہنے لگا۔

”وہ کمرہ نہیں اسٹور روم تھا اس میں یونیورسٹی کا پرانا کاتھ کبار بھرا تھا وہ کمرہ ہمیشہ بند رہتا تھا اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ لیکن میں ایک روشن دان کے ذریعے اس میں داخل ہو گیا وہاں۔ اس کمرے میں ایک تصویر لگی ہے وہ تصویر وہاں سے نکالی نہیں جاسکتی اسی لیے مجھے نہیں لے جا کر وہ تصویر دکھانی ہے۔“ آخر کار خرم بات بنانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

”کیسی تصویر؟ کون ہے اس تصویر میں؟“ زبیرہ کی آواز تک فکر سے چور تھی اس کے چہرے کا اس وقت کیا عالم ہو گا وہ خرم دیکھے بغیر بھی آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا۔

”ایک تو شائستہ خالہ ہی ہیں لیکن ان کے ساتھ تصویر میں جو وہ سراسر شخص کھڑا ہے مجھے لگتا ہے ان کی موت میں اس شخص کا ہاتھ ہے۔“ زبیرہ کے روکنے کھڑے ہو گئے۔

شائستہ خالہ کا عکس اس نے ہمیشہ بہت غیر واضح سادہ کھاتھا جب کبھی شکل واضح طور پر نظر آئی اس وقت زبیرہ پر خوف اتنا طاری ہو جاتا تھا کہ وہ ان کے چہرے کے خدو خال پر کبھی غور نہ کر سکی۔

کیونکہ شائستہ خالہ کا چہرہ بہت زخمی حالت میں نظر آتا تھا ایسا لگتا تھا ان کے چہرے کو کسی نے ناخنوں سے نوچ ڈالا ہو رخصت پر ماتھے پر گردن پر غرض یہ کہ ہر جگہ خراشوں کے ساتھ خون کی باریک لکیریں انہیں اتنا بھیا نک بنا دیتیں کہ زبیرہ کی چیخیں نکل جاتیں۔

وہ تو اگر شائستہ خالہ کی تصویر دیکھ لیتی تو پہچان بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شائستہ خالہ ہیں جبکہ خرم دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا یعنی اس نے شائستہ خالہ کا چہرہ واضح طور پر دیکھا ہے۔

زبیرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی اور اسی وقت یونیورسٹی کے اسٹور روم میں پہنچ جائے مگر پھر بھی وہ ضبط کرتے ہوئے تامل سے بولی۔

”لیکن آپ تو کہہ رہے ہیں وہ اسٹور روم لاک رہتا ہے۔ میں بھلا روشن دان سے کیسے داخل ہو سکوں گی اور وہ تصویر باہر آ نہیں سکتی۔“

”آپ کو روشن دان سے اندر جانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میری یونیورسٹی میں بازار لگنے والا ہے مختلف اسٹالز کی ڈیکوریشن کے لیے اسٹور رومز سے پرانی ٹیبلز وغیرہ نکلائی جاتی ہیں۔ اس دن اسٹور روم کا دروازہ کھلا رہے گا۔ آپ اسی دن آجلیئے گا۔ اس دن یونیورسٹی میں اتنی چل پھل ہوتی ہے کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ آپ اسٹور روم میں گئی ہیں۔“ خرم نے پورا پلان ترتیب دیتے ہوئے ساری راہیں ہموار کر لیں۔

عام دنوں میں سب اپنی اپنی کلاسز میں ہوتے ہیں وہ اگر زبیرہ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اسے گھنٹوں وہاں روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا جبکہ اسے اپنی اور نمل کی پوری کلاس کے تمام طالب علموں سے لے کر سمیر کے پورے گروپ کو زبیرہ کی آمد سے باخبر کرنا تھا جس کے لیے پڑھائی سے ہٹ کر کسی دن کا انتخاب کرنا سخت ضروری تھا۔

وہ زبیرہ کو اسٹور روم میں لے جانے کے بہانے پہلے پورا بازار گھماتا اور یہی کہتا کہ اسٹور روم کا دروازہ ابھی بند

ہے میں لوگوں سے کہہ کر کھلوں گا ہوں اس طرح دوڑھائی گھنٹے آرام سے گزر جاتے۔

جس کے بعد خرم کسی بھی کبار والے اسٹور روم میں زبیرہ کو لے جاتا اور جا کر اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے صدمے اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہہ دیتا کہ وہ تصویر یہاں سے غائب ہو گئی۔

یہ سب سن کر زبیرہ کو بورت تو ہوتی مگر وہ بے وقوف سی لڑکی یہ نہ سمجھتی کہ خرم نے اسے الو بتایا ہے اور بالفرض اگر سمجھ بھی جاتی تو خرم کو کون سا اس کے ساتھ بہت لمبا فلرٹ کرنا تھا۔

ایک بار اسے یونیورسٹی کے لوگوں سے ملوایا اس کے بعد وہ بھلے ہی خرم سے کنارہ کشی اختیار کر لے خرم کی بلا سے۔

”اس دن اگر اسٹور روم کا دروازہ کھلا رہے گا تو آپ تصویر باہر نکال لائیے گا۔ مجھے یونیورسٹی آنے کی کیا ضرورت ہے۔“ خرم اس کی بات پر ٹھنک گیا۔

وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی جتنا خرم سمجھ رہا تھا۔

کچھ لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا وہ کیا جواب دے لیکن ایک بار پھر اس کے دماغ نے بڑی تیزی سے کام کیا اور وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”وہ تصویر فریم میں لگی ہے اور خاصی بڑی ہے میں لے کر باہر نکلوں گا تو سب چونک اٹھیں گے۔ خیر میں اگر یہ رسک لے بھی لوں تو وہ فریم میں آپ کو دکھاؤں گا کہاں؟ کیا آپ کے گھر لے کر آ جاؤں یا آپ میرے گھر آ جائیں گی۔“ خرم کا لہجہ ہلکا سا طنزیہ ہو گیا زبیرہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

وہ بھلا کیا کہتی خرم نے دونوں ہی باتیں ناقابل قبول کی تھیں چنانچہ اسے ایک ہی سوال کرنا تھا۔

”آپ کی یونیورسٹی میں فیسٹیول کب لگ رہا ہے؟“ اس کے ٹھکے ہوئے کجے میں بالکل ہار مان لینے والا تاثر تھا خرم کو اپنے اندر ایک نئی تقویت کا احساس ہوا۔



رومیلہ کی شادی کے ہنگامے کیا ٹھنڈے پڑے نمل اور سنبل کو سب کچھ ایک دم خالی خالی لگنے لگا حالانکہ وہ اس کی شادی کے فنکشنز کو انجوائے نہیں کر رہی تھیں بلکہ بھگتا رہی تھیں زیادہ تر وقت ان دونوں کا رومیلہ کے لیے پریشان رہ کر ہی گزرتا تھا رشیدہ کے بات کرنے پر رومیلہ کو ایک دن کے لیے الیان کی وادی نے گھر بھیج دیا تھا مگر رومیلہ، نمل کے گھر آنے کی بجائے اپنے گھر جانا چاہتی تھی تاکہ اپنا تمام اہم سامان رکھ سکے اور معمولی معمولی چیزوں کے لیے اسے ماسیوں کے سامنے اپنی حاجت بیان نہ کرنی پڑے ویسے بھی اگلے دن وہ ان سب کے ساتھ الیان کی ٹائی کے گھر جا رہی تھی وہاں وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا نا چاہتی تھی۔

سنبل اور نمل کو جب پتا چلا کہ وہ اپنے ہی گھر آ رہی ہے تو وہ بھی اس سے ملنے وہیں پہنچ گئیں۔ رومیلہ نے انہیں جو کچھ بھی بتایا اسے سن کر انہیں دکھ تو ہوا مگر وہ اس پر ظاہر کرنے کی بجائے اسے تسلی دیتی رہیں۔

اب اچھی امید رکھنے کے سوا ان کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا وہ دونوں دل سے رومیلہ کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھیں۔

رات تک وہ دونوں اپنے اپنے گھر واپس آ گئیں کہ صبح رومیلہ کو اپنی سرال لوٹ جانا تھا وہ پھر تک ان کی روانگی جو تھی۔

البتہ رشیدہ کے پوچھنے پر نمل نے زیادہ تفصیل سے الیان کے گھر والوں کے رویے کا ذکر نہیں کیا۔ کیا فائدہ تھا انہیں دکھی کرنے کا نمل نے صرف الیان کی ٹائی اور ماموں وغیرہ کے بہترین اخلاق اور خوش مزاجی کا تذکرہ کر کے



الیان اور اس کے گھر والوں کی سرد مہری کو دو لفظوں میں سمیٹ دیا۔

”وہ سب بھی اچھے تو ہیں مگر وہ میلہ کہہ رہی تھی ذرا کم گو اور لیے دیے رہنے والے ہیں شاید اسی لیے شادی اور ولیمے میں اتنے روڈ لگ رہے تھے۔“

”چلو خیر۔۔۔ رو میلہ خود سمجھ وار ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسئلہ نہیں بنائے گی۔“ رشیدہ قدرے اطمینان سے بولیں تو مکمل بھی بات کھپ جانے پر پرسکون ہو گئی۔

البتہ ایک بات اسے بہت کھٹک رہی تھی جس کا تذکرہ اس نے سنبل تک سے نہیں کیا تھا اور وہ تھا سمیر کو رو میلہ کی شادی میں بلائے کی حرکت پر پچھتاوا۔

اول تو اس کا رویہ رشیدہ کے ساتھ مکمل کو سخت ناگوار گزرا تھا اس کے لیے پوری دنیا میں سب سے اہم اپنی ماں کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور جس طرح سمیر نے اس کی ماں کی معذوری پر رد عمل کا اظہار کیا تھا وہ عمل کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

حالانکہ یہ سب وہ بچپن سے دیکھتی آرہی تھی ہر تقریب میں اس کی ماں کو پہلی بار دیکھنے والے لوگ کم بیش اسی رد عمل کا مظاہرہ کرتے تھے بلکہ کچھ لوگ تو عجیب و غریب سوال جواب کر کے رشیدہ سمیت مکمل تک کا دل چیر کر رکھ دیا کرتے تھے۔

لیکن سمیر کا انداز اسے سر تا پا سلگا گیا تھا یہ بات نہیں تھی کہ وہ سمیر سے بہت متاثر تھی یا رشیدہ کے ساتھ اس کے رویے نے مکمل کو شک پہنچا دیا تھا۔ بلکہ اس کی اس حرکت نے مکمل کو سمیر سے بے زار کر دیا تھا وہ خرم کو جلانے کے لیے محض اس کا استعمال کر رہی تھی مگر اتنے ہلکے انسان کو وہ اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

لیکن مجبوری تھی سمیر کے علاوہ کسی اور کو خرم کے مد مقابل لانا اتنا آسان نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کی لڑکی تھی کہ جس کو چاہتی اپنے دام میں پھانس لیتی۔

اس قسم کی حرکتیں کرنا اس کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا وہ تو خرم نے اسے اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ وہ سمیر کے ساتھ کینٹین میں بیٹھنے پر تیار ہو گئی تھی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ آئے دن ایسی حرکتیں کر سکتی تھی وہ بھی ہر ابرے غیرے کے ساتھ۔

اس لیے جب رشیدہ نے اس سے سمیر کے متعلق پوچھا تو اس نے صاف صاف بتا دیا جسے سن کر رشیدہ بھڑک اٹھیں حالانکہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کی تھیں مگر مکمل کو خود اپنے ہاتھوں اپنا تقدس پامال کرتے اور زندگی کو کھیل بناتے کیسے برداشت کر لیتیں۔

”تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے تم کیا کر رہی ہو۔ اگر سمیر کوئی اچھا انسان ہوتا تب بھی خرم کو اس طرح جلانا خود تمہارے مستقبل کے لیے سخت خطرناک ہے دوسرے مجھے تو سمیر بھی کوئی ٹھیک لڑکا نہیں لگا ہے یہ تو بالکل وہی بات ہوئی نا ایک طرف کنواں دوسرے طرف کھائی۔“

”مت کریں ایسی باتیں۔“ مکمل جھنجھلا گئی۔

”میرا مستقبل کوئی خرم کے ساتھ وابستہ نہیں ہے جو آپ مجھے اس طرح ڈر رہی ہیں اور رہا سوال سمیر کا وہ کس قسم کا لڑکا ہے یہ میں بھی جانتی ہوں وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا آپ بے فکر رہیں۔“

”تمہارے یہ کہہ دینے سے کہ آپ بے فکر رہیں میری فکر دور تو نہیں ہو سکتی اور یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارا مستقبل خرم کے ساتھ وابستہ نہیں ہے تمہارے والد جو ٹھان لیتے ہیں وہ گزرتے ہیں اور ان کی گئی یہ منگنی کسی پتھر کی لکیر سے کم نہیں ہے۔“ رشیدہ کا مقصد صرف اور صرف اسے حقیقت سے روشناس

کرانا تھا اسی لیے ان کا غصہ خود بخود سرد ہو گیا اور وہ رسانیت سے کہنے لگیں۔

”اگر وہ جو ٹھان لیتے ہیں وہ گزرتے ہیں تو میں بھی جو طے کر لیتی ہوں اس پر قائم رہتی ہوں اور میں نے خرم سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اللہ نہ کرے پھر بھی اگر حالات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ میرے پاس خرم سے شادی کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچتا تو میں خود کشی کر لوں گی مگر اس۔۔۔“

”خدا نہ کرے۔“ رشیدہ نے دہل کر اس کی بات کا شادی پھر ڈپٹ کر کہنے لگیں۔

”کچھ ہوش بھی ہے تمہیں کہ کیا کہہ رہی ہو ایک حرام فعل اپناؤ گی تم وہ بھی اتنی معمولی سی بات پر خرم کے ساتھ جن اختلافات کو تم آج بہت بڑا سمجھ رہی ہو مکمل کو تمہیں وہ سب بچکانہ دور کی بے وقوفیاں بھی لگ سکتی ہیں لیکن تمہیں شاید خرم سے اتنی نفرت ہے جتنی مجھ سے محبت بھی نہیں ہے ورنہ ایسی بات تم بھی نہ کہتیں۔“ آخری جملے پر رشیدہ کی آواز بھرا گئی تو مکمل کچھ شرمندہ سی ان کے پاس بیٹھ کر انہیں منانے لگی۔

”سوری امی! میرا یہ مطلب نہیں تھا صرف ایک آپ ہی تو ہیں جن کی مجھے فکر ہے اور جن کی وجہ سے میں نے یہ نام نہاد منگنی کی ہے اگر مجھے آپ سے محبت نہ ہوتی تو میں عین منگنی والے دن بھری محفل میں خرم کے منہ پر انگوٹھی مار کر شادی سے انکار کر دیتی پوری یونیورسٹی کو اس نے انوائیٹ کیا تھا سب کے سامنے اس کا غرور خاک میں مل جاتا جو یہ جانتے ہوئے بھی منگنی کرنے چلا آیا کہ میں اس شادی پر راضی نہیں ہوں۔ یہ دھشانی نہیں ہے تو اور کیا ہے امی۔“ مکمل بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئی اس کے چہرے پر بے بسی پھیلی دیکھ کر رشیدہ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

”میری خاطر تم نے خاموشی سے منگنی کر لی مگر میری پریشانی تو بدستور برقرار ہے بلکہ تم دونوں کے بیچ بڑھتی ناچاتی دیکھ کر تو اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے آخر تم اس لڑائی کو ختم کیوں نہیں کر دیتیں۔“

مکمل نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں جیسے جو وہ کہہ رہی ہیں وہ ناممکن ہو چکی وہ وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”مجھے معلوم ہے وہ تمہیں جان بوجھ کر غصہ دلاتا ہے مگر تم اس کے حریف سے دوستی کرنے اور اسے جلانے کی بجائے اس کی حرکتوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دو بلکہ ایسا کرو یونیورسٹی ہی چھوڑ دو۔“

”کیا بات کر رہی ہیں امی آپ؟“ مکمل نے ایک دم آنکھیں کھولتے ہوئے بدک کر کہا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اللہ کرے تمہاری شادی تمہاری پسند اور مرضی سے ہو اور اگر تم اپنے شریک حیات کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو لیکن اگر خدا ناخواستہ ایسا نہیں ہوتا اور وہی ہوتا ہے جو مجھے لگ رہا ہے تو خرم کے ساتھ ہوئی یہ چھوٹی موٹی جھڑکیاں تمہیں آگے چل کر بہت مہنگی پڑ جائیں گی اس سے دوستی نہیں کر سکتیں تو دشمنی ہی ختم کر دو۔“

”امی مجھ سے وہ بات مت کہیں جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔ آپ کے خدشات اور پریشانیاں میں سب سمجھ رہی ہوں۔ لیکن میں یونیورسٹی نہیں چھوڑ سکتی اور یونیورسٹی میں رہتے ہوئے میں خرم کی کتنی باتوں کو نظر انداز کر سکتی ہوں وہ تو مجھے چڑانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔“ مکمل بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی وہ رشیدہ کو انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اور خرم سے پارمان کر بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

رشیدہ اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں بھی اس کا سر سہلاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”خود کو ہلکان مت کرو۔ میں تو صرف تمہیں بچ کی راہ بتا رہی تھی جو مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور ہمیشہ آگے جا کر فائدہ پہنچاتی ہے لیکن اگر تمہیں اس پر عمل کرنا مشکل لگ رہا ہے تو چھوڑ دو، تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتی مگر میں یہ ضرور کہوں گی تم سمیر کو خرم کے مقابل لا کر بہت غلط کر رہی ہو۔“ کوشش کر کے اس مسئلے کو حل کر لو۔“



نمل ان کی بات کے جواب میں کچھ بولی نہیں لیکن ان کی گفتگو نے اسے ہلکی سی مایوسی میں دھکیل دیا تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ کچھ بھی کر لے آخر میں جیت خرم کی ہی ہونی ہے اور جب اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو اسے اتنا زنج کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ آئندہ پوری زندگی اس ایک غلطی کا خمیازہ بھگتے گزر جائے۔  
وہ عجیب طرح کے ذہنی اضطراب کا شکار تھی جس کے نتیجے کے طور پر وہ غیر شعوری انداز میں سیر سے اجتناب کرنے لگی۔

سیر جب بھی اس کے پاس آتا نمل خود کو مصروف ظاہر کر کے وہاں سے ایسے ہٹ گئی کہ سیر کو محسوس نہ ہو۔ گویا وہ اس دروازے کو بند نہیں کرنا چاہتی تھی بس رشیدہ کی باتوں اور خود سیر کے اپنے رویے نے نمل کو اس سے بے زار کر دیا تھا وہ پہلے ہی اس کی کوئی خاص شیدائی نہیں تھی چنانچہ رشیدہ کے ساتھ اس طرح پیش آکر اس نے اپنے نمبرز خود ہی گھٹا دیے تھے۔

جسے سیر تو محسوس نہیں کر سکا لیکن سنبل نے فوراً "تاڑ لیا اور اس کے پوچھنے پر نمل نے اسے سب سچ سچ بتا بھی دیا تو وہ خود بھی کچھ کم سم سی ہو گئی۔

"میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تم دونوں کے اس رشتے کا انجام کیا ہو گا ایک طرف رومیلا کی شادی ہوئی ہے جو شادی کم اور سمجھوتہ زیادہ لگ رہا ہے۔ دوسری طرف تم سے تو یہ امید بھی نہیں ہے کہ تم رومیلا کی طرح اتنے صبر سے سب برداشت کر لو گی۔" اس کی بات پر نمل بے ساختہ ہنس پڑی جس پر سنبل برا ماننے ہوئے بولی۔  
"دکھو میں تمہیں رومیلا سے کم سیر نہیں کر رہی مگر یہ بھی سچ ہے کہ اگر تم ذرا صبر اور ضبط کا مظاہرہ کرو تو خرم والا معاملہ کسی حد تک سلجھ سکتا ہے میں مانتی ہوں اس کی ساری حرکتیں تمہیں بتانے والی ہوتی ہیں لیکن تم تپنے کی بجائے۔"

"چلو چھوڑو یا رجو تم کہہ رہی ہو وہ میں ماننے والی نہیں ہوں لہذا اس بحث کو ہمیں سمیٹ دیتے ہیں۔

جب سے رومیلا کی شادی ہوئی ہے عجیب بوریت سی ہو رہی ہے لہذا کل یونیورسٹی میں جو فیسٹیول لگ رہا ہے اس میں بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا ہے اور اس بوریت کو دور کرنا ہے اوکے۔" نمل نے کہا تو سنبل بھی تائیدی انداز میں سر ہلانے لگی۔ واقعی وہ دونوں رومیلا کی شادی سے لے کر اب تک مایوس کن باتیں سوچ سوچ کر تھک گئی تھیں۔



خرم نے جب زوسہ کو فون کر کے آنے کا دن اور وقت بتایا تو ایک بل کو اس کا دل چاہا صاف انکار کر دے مگر وہ اس موقع کو گنوا نہیں سکتی تھی اسی لیے بڑی مشکل سے دل کڑا کر کے عائشہ اختر کے پاس اجازت مانگنے چلی آئی۔  
حالانکہ ان کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی مگر اس نے کبھی اس طرح کا کوئی پروگرام بنا کر نہیں جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی چنانچہ عائشہ اختر کا اس فرمائش پر چونکنا یقینی تھا اور اس کے بعد ان کا جواب کیا ہو گا اس بارے میں وہ کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی البتہ امید تھی کہ وہ اپنی عادت کے مطابق اسے کریدیں گی ضرور۔

زوسہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ڈرنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی چہرے کا نرم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ مساج کر رہی تھیں زوسہ کو آئینے کے عکس میں نمودار ہوتا دیکھ کر وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔  
"مما آپ بڑی تو نہیں ہیں نا۔" زوسہ نے جواب جانتے ہوئے بھی محض بات شروع کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"نہیں! کہو کیا بات ہے۔"

"مما۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔ پایا کہہ رہے تھے تاکہ مجھے پڑھائی شروع کرنی چاہیے اور اس کے لیے کہیں ایڈمیشن لے لینا چاہیے۔" زوسہ کہہ کر رک گئی۔

"ہاں تو۔" عائشہ اختر اب بھی اسے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔  
"تو میں یہ سوچ رہی تھی کچھ کالجز اور یونیورسٹیز کا سروے کر کے دیکھوں اگر کسی جگہ کا ماحول مناسب لگتا ہے تو میں وہاں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کروں۔" زوسہ نے سہمے سہمے انداز میں کہا۔

زوسہ کو بھوت بریت سے ہٹ کر کوئی بات کرنا دیکھ کر عائشہ اختر حیرت سے غش کھا کر رہ گئیں۔  
وہ اپنے کیریئر کے متعلق سوچ رہی تھی ایڈمیشن ملنا یا نہ ملنا تو بعد کی بات تھی فی الحال تو انہیں زوسہ کا خود کے لیے سوچنا شدید خوش گوار حیرت میں مبتلا کر گیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں بالکل سروے کرو مگر تم ماحول کا اندازہ کیسے لگاؤ گی۔"  
"مم۔۔۔ ممما۔۔۔ میری کالج کی کچھ لڑکیوں کے بہن بھائی جس یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں وہاں کی میں نے بہت تعریف سنی ہے اور پھر کل وہاں فیسٹیول لگ رہا ہے۔

میں سوچ رہی ہوں ایک دفعہ فیسٹیول کے بہانہ یونیورسٹی کا جائزہ لے کر آؤں کہ آیا میں وہاں ایڈجسٹ ہو سکتی ہوں یا نہیں۔"

عائشہ اختر اسٹول سمیت زوسہ کی طرف گھوم گئیں ان کے چہرے پر دو سوپاؤر کا بلب آن ہو گیا پھر بھی وہ اپنی خوشی چھپاتے ہوئے عام سے انداز میں کہنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے جاؤ جا کر سروے کرو لیکن فیسٹیول میں بھلا تم کیا اندازہ لگا سکو گی۔"  
"مما یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم بس جاؤں گی تو کچھ دیکھ کر اگر سمجھ میں آ گیا یا دل مانا تو ایڈمیشن فارم لے آؤں گی نہیں تو جیسے ابھی گھر میں بیٹھی ہوں ویسے بیٹھی رہوں گی۔"

"نہیں نہیں ایسے کیوں سوچ رہی ہو جب تم وہاں جا کر ان لوگوں کو دیکھو گی تو بس ایک چیز ذہن میں رکھنا کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں جب یہ لوگ یہاں آکر پڑھ سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں بھلا میری بیٹی میں کسی چیز کی کمی تھوڑی ہے بلکہ میری بیٹی جیسی خیرین تو کوئی لڑکی ہے ہی نہیں۔" وہ زوسہ کی بات سن کر اتنی خوش ہوئی تھیں کہ اٹھ کر زوسہ کے قریب آ گئیں اور اسے کندھے سے تھام لیا۔

"میں وہاں کوئی اپنا احسن دکھانے تھوڑی جا رہی ہوں ممما۔" زوسہ کچھ جھینپ کر بولی۔  
"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر مجھے تمہاری عادت کا پتا ہے زیادہ کراؤڈ (رٹش) میں تم لوگوں کو دیکھ کر نروس ہو جاتی ہو حالانکہ تمہارے جیسی خوب صورت لڑکیاں تو بہت خود اعتماد رہتی ہیں کیونکہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ وہ بہت خیرین ہیں مگر تم نے تو اپنی خوبیوں پر کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔" ان کا اتنا خوشگوار موڈ دیکھ کر زوسہ بغور انہیں دیکھنے لگی۔

جب سے خرم کا فون آیا تھا اس کے ذہن میں ایک سوالیہ سراٹھا رہا تھا کہ کیا شائستہ خالہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں مگر یہ سوال لبوں تک لانے کی اس میں ہمت نہیں تھی ایک تو یہ سنتے ہی عائشہ اختر کا مزاج برہم ہو جاتا دوسرے اسے جواب میں یہی سننے کو ملتا کہ۔

"میری کوئی بہن نہیں ہے ہزار بار تو کہہ چکی ہوں آخر تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"  
اس کی سمجھ میں بخوبی آ گیا تھا کہ اس کے ممایا اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے اب جو کچھ کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا اور پھر اب تو خرم کی مدد بھی شامل حال ہو گئی تھی پھر کیا ضرورت تھی عائشہ اختر کو اس وقت ناراض کرنے کی جبکہ



ان کے خوشگوار موڈ کے باعث اسے اپنی ایک بات اور بھی منوانی تھی۔  
 ”تو ماما آپ ڈرائیور سے کہہ دیجیے گا وہ مجھے لے جائے گا میں صبح گیارہ بجے نکل جاؤں گی۔“  
 ”تم اکیلی جاؤ گی۔“ عائشہ اختر نے تعجب سے پوچھا۔

”اک۔۔۔ اکیلی کہاں۔ ڈرائیور کے ساتھ جاؤں گی۔“ زوبیہ نے خود اعتمادی سے کہنے کی کوشش کی جبکہ عائشہ اختر ہنوز اسے حیرانی سے دیکھے گئیں۔

”صبح میں مجھے بھی کوئی کام نہیں ہے میں چل سکتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ ان کی شکل سے صاف ظاہر تھا انہیں زوبیہ کے منہ سے ایسی بات سننے کی قطعاً ”امید نہیں تھی۔“

حالانکہ وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ وہ ان کے ماحول کی دوسری لڑکیوں کی طرح اکیلے آنے جانے کے قابل ہو۔ خود سے اپنی شاپنگ کرنے اور اپنے فیصلے کرنے کی سمجھ رکھتی ہو مگر اس وقت اچانک اس کے مزاج میں یہ تبدیلی انہیں الجھن میں مبتلا کر گئی۔

”آں۔۔۔ نہیں ماما۔۔۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اصل میں میں خود اکیلے جا کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں روز ایسے ماحول اور جگہ میں اکیلی آسکتی ہوں یا نہیں۔“ زوبیہ نے ایک ایسا نکتہ ان کے سامنے رکھا کہ وہ اعتراض نہ کر سکیں۔

ویسے بھی اعتراض انہیں تھا بھی نہیں جو وہ اسے ٹوکتیں انہیں تو صرف حیرت تھی۔ ایک بے یقینی سی کہ زوبیہ میں یہ بدلاؤ کیونکر آیا۔

وہ اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح بالکل سادہ اور معصوم تھا چنانچہ انہوں نے ایک گہرا سانس کھینچتے ہوئے اپنی رضامندی دے دی۔

”ٹھیک ہے کل صبح گیارہ بجے چلی جانا اور اپنا موبائل ضرور لے کر جانا۔“ زوبیہ کا دل چاہا بے اختیار ان کے گلے لگ جائے۔

لیکن اس نے خود کو روک لیا اور نارمل انداز میں ”تھینک یو“ کہتی ان کے کمرے سے نکل گئی۔  
 ان کے بچے ایسی بے تکلفی یا والہانہ محبت تھی ہی نہیں کہ وہ ایسی بے اختیاری دکھاتی پھر دوسرے یہ کہ وہ اتنی خوشی بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ مشکوک ہو جائیں ویسے بھی یہ خوشی کوئی دیرپا نہیں تھی۔  
 اپنے کمرے میں جا کر جہاں ایک مرحلہ خوش اسلوبی سے طے پا جانے پر اسے سکون کا احساس ہوا تھا وہیں دوسرا مرحلہ اس اس سے بھی زیادہ مشکل لگ رہا تھا۔

حالانکہ اسے پونیورسٹی جا کر صرف ایک تصویر ہی تو دیکھنی تھی مگر اس کی گھبراہٹ پورے عروج پر تھی جیسے جانے کل کیا انہونی ہونے والی ہے۔



رومیلا، نمل اور سنبل سے بات کر کے قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی ان دونوں کے ساتھ اپنی اس عجیب و غریب شادی کو ڈسکس کر کے اس نے اپنا بوجھ ہلکا نہیں کیا تھا بلکہ ان سے مشورہ مانگا تھا کہ اسے آئندہ کس طرح اور کیسے رہنا چاہیے۔

جس پر ان دونوں نے اس کی خوب ہمت برہانے کے بعد اسے صبر کی تلقین کی تھی حالانکہ نمل نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

”تم مت سمجھنا کہ تم آج ان کے رویے کو نظر انداز کر کے ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آؤ گی تو وہ لوگ



تمہاری ایک دم سے قدر کرنے لگیں گے اور تمہیں بڑے ارمانوں کے ساتھ لائی بہو کی طرح محبت سے رکھیں گے۔

ہو سکتا ہے وہ ساری زندگی اسی طرح تمہیں ڈی گریڈ کرتے رہیں اور ساری زندگی تمہیں یہ جتانے کی کوشش کرتے رہیں کہ تمہاری بارات لوٹ جانے کے باوجود ہم نے تمہیں اپنا کر تم پر احسان کیا ہے یہ صورت حال اگر ہمیشہ قائم رہی تو تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔ تب اگر تم علیحدگی کا سوچو تو میں تمہیں غلط نہیں کہوں گی۔ لیکن بغیر کوشش کیے اگر تم نے ہار مان لی اپنی ہمت اور قسمت کو آزمائے بغیر، تھکاوٹ ڈال دیے تو یہ واقعی تمہاری بہت بڑی غلطی ہوگی۔" رومیلا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی وہ جانتی تھی نمل یہ سب کیوں کہہ رہی ہے۔

رشیدہ شادی کے بعد معذور ہوئی تھیں اور اس کے بعد انہوں نے ساری زندگی خاموشی سے عظمت خلیل کی خدمت کرتے گزار دی لیکن عظمت خلیل نے کبھی رشیدہ کو اس انتھک محنت کا صلہ نہیں دیا۔

اسی لیے نمل اسے حقیقت پسندی سے میدان میں اترنے کے لیے کہہ رہی تھی یعنی جیت کی امید رکھتے ہوئے کوشش کرو مگر ہارنے کی صورت میں ٹوٹ کر بکھرنے کی بجائے اسے زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کرلو۔ ان کی یہ سب باتیں سن کر وہ واپس تو بڑے بلند حوصلوں کے ساتھ آرہی تھی لیکن پہلی ہی سیڑھی پر وہ جیسے منہ کے بل گری تھی۔

اگلے دن جب اسے واپس آنا تھا تو ناشتے کی میز پر ابرار بھائی نے اس پر نظر پڑتے ہی پوچھا۔  
"الیان کتنے بجے لینے آئے گا تمہیں۔"

"جی۔۔۔ پتا نہیں۔" رومیلا سٹپا گئی ابرار بھائی بھی تو اسے بغور دیکھ رہے تھے جیسے اس کے چہرے سے اس کے ذہن تک رسائی حاصل کر رہے ہوں۔

اس کی جب سے شادی ہوئی تھی ابرار بھائی اسے کریدنے کی کوششیں کرتے عجیب کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے رہتے تھے اس وقت بھی وہ اس کے تاثرات ٹوٹتے ہوئے بولے۔

"الیان سے کوئی بات نہیں ہوئی تمہاری؟"

"نہ۔۔۔ نہیں میں نے ایسا کچھ پوچھا ہی نہیں۔"

"اور جب تک تم پوچھتی نہیں وہ خود سے کوئی بات کرتا نہیں۔" رومیلا حیرانی سے ابرار بھائی کو دیکھنے لگی۔ اتنا صحیح اندازہ انہوں نے کیسے لگا لیا۔

لیکن رومیلا کو فوراً ہی اپنی حیرت پر قابو پانا پڑا کیونکہ وہاں بابا جانی اور بھابھی بھی موجود تھیں اور وہ دونوں ہی ابرار کے سوال پر رومیلا کو جاچتی نظروں سے دیکھنے لگے تھے بھابھی کی آنکھوں میں تجسس بھرا تھا جبکہ بابا جانی فکر مندی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"نہ۔۔۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" رومیلا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔

"چلو خیر۔ تم الیان کو فون کر کے پوچھ لو وہ کب تک آئے گا۔"

"میں۔۔۔" رومیلا بے ساختہ بولی۔

"ہاں تم۔ کیوں کیا ہوا؟" ابرار بھائی کا لہجہ بظاہر عام سا تھا مگر ان کی آنکھوں میں شک و شبہات ابھرے تھے۔

رومیلا ایک بار پھر بے بس ہو گئی۔

"وہ۔۔۔ میرے پاس تو الیان کا نمبر نہیں ہے۔" اسے امید تھی اب بھابھی ضرور بولیں گی مگر حیرت انگیز طور پر وہ بالکل خاموش رہیں۔

رومیلا کی شادی سے لے کر اب تک انہوں نے الیان یا اس کے گھر والوں پر کوئی تبصرہ رومیلا کے سامنے

نہیں کیا تھا جہاں اس بات سے رومیلا کو اطمینان تھا کہ وہ بے سرو پا ہانک نہیں رہیں وہ ان کے تاثرات جاننے کے لیے بے چین بھی تھی۔

"کوئی بات نہیں نمبر میں دے دیتا ہوں تم ابھی بات کرلو۔" انہوں نے صرف کہا نہیں بلکہ اس کا موبائل اٹھا کر اس میں الیان کا نمبر فید کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھا دیا۔

ان کا انداز ایسا تھا لہذا ابھی بات کرو رومیلا الجھن بھری نظروں سے موبائل کو دیکھنے لگی کہ بابا جانی بول پڑے۔

"اسے ناشتا تو کرنے دو۔ رومیلا ناشتے کے بعد بات کر لیتا۔" بابا جانی نے اس کی مشکل آسان کر دی لیکن الیان سے بات کرنے کے خیال سے اس پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی اور اس سے ناشتا ہی نہیں کیا جا رہا تھا آخر وہ صرف چائے پی کر موبائل لیے کمرے میں آگئی۔

ابرار بھائی ہر دس سیکنڈ بعد اس کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "جلدی کرو" آخر رومیلا کو اٹھنا ہی پڑا۔

کمرے میں آکر الیان کو فون کرتے ہوئے اس کی انگلیاں واضح طور پر کانپ رہی تھیں وہ دعا کر رہی تھی الیان کا فون بڑی ہو مگر اس نے دو سری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی تو رومیلا دل موس گرہ گئی اور الیان کے تیسری بار ہیلو کہنے پر دل کڑا کرتے ہوئے بولی۔

"السلام علیکم۔ میں رومیلا بول رہی ہوں۔" دو سری طرف توقع کے عین مطابق خاموشی چھا گئی۔

"الیان۔۔۔ آپ مجھے لینے کب آئیں گے؟" رومیلا نے اس ڈر سے جلدی سے کہہ دیا کہ کہیں وہ خاموشی سے فون بند نہ کر دے پھر اس کے لیے دوبارہ کال کرنا سوہان روح ہو جائے گا دو سری طرف اس کے سوال پر ایسے خاموشی چھائی رہی جیسے الیان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا۔

"ہیل۔۔۔ ہیلو۔ آپ سن رہے ہیں نا۔" رومیلا کو لگا لائن کٹ گئی ہے اور وہ خالی فون کان سے لگائے کھڑی ہے۔ پھر اس نے الیان کو واضح طور پر گہرا سانس خارج کرتے سنا جیسے بڑی مجبوری سے بول رہا ہو۔

"آجاؤں گا دو تین گھنٹے میں۔" الیان نے یہ کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا۔

رومیلا کے سارے ارادے بھر بھری مٹی کی طرح ڈھیر ہونے لگے نمل اور سنبل کی تسلیاں اور حوصلہ بڑھانا سب پر ایک دم مہیا ہو گیا۔

الیان اس کے سامنے نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر کتنی بے زاری ہوگی یہ رومیلا صرف اس کے سانس کھینچنے کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی۔

خود کا اس طرح زبردستی کسی کے سر پر مسلط ہونا اس کے لیے برداشت سے باہر تھا پھر کہاں سے لاتی وہ صبر اور حوصلہ جس کی تلقین نمل اور سنبل کر رہی تھیں۔

دل تو چاہا ابھی الیان کو فون کر کے کہہ دے کوئی ضرورت نہیں ہے آنے کی میں خود ہی آجاؤں گی۔

اس نے دل کی نہ سنتے ہوئے خاموشی سے فون کان سے ہٹا کر ڈرائنگ ٹیبل پر رکھ دیا اسی وقت ابرار بھائی کمرے میں داخل ہو گئے۔

"کیا کہا الیان نے۔" رومیلا چونک کر انہیں دیکھنے لگی اسے شک سا گزرا جیسے ابرار بھائی دروازے سے لگے اس کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے رومیلا کے فون رکھتے ہی وہ کمرے میں آگئے۔

"وہ۔۔۔ انہوں نے کہا ہے دو تین گھنٹے میں آجائیں گے۔" رومیلا کے کہنے پر ابرار بھائی ایسے کھڑے رہے جیسے مزید کچھ سننا چاہ رہے ہوں۔

"کیا بات ہے بھائی؟" رومیلا کی سمجھ میں نہ آیا وہ ان سے کیسے پوچھے کہ کیا آپ میری بات سن رہے تھے۔



”الیان کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ۔“ انہوں نے بڑی صاف گوئی سے پوچھا۔  
 ”کیا ہو گیا ہے بھائی بار بار ایک ہی سوال کیوں پوچھتے جا رہے ہیں۔“ رویلہ حقیقتاً ”چڑگئی تھی۔“  
 ”کیونکہ تم مجھے صحیح طریقے سے بتا نہیں رہیں۔“

”کیا بتاؤں۔ کیا سننا چاہتے ہیں آپ۔ ابھی میری شادی کو ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔“ رویلہ برہمی سے بولی۔  
 ”ٹائم کی ضرورت ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے پڑتی ہے جبکہ رویہ کا اکھڑ پن پانچ منٹ کی گفتگو میں ہی سمجھ میں آ جاتا ہے۔“ ابراہار بھائی نے بڑے بڑے تپتے انداز میں کہا۔

رویملہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گئی اسے خاموش دیکھ کر ابراہار بھائی تھوڑے تیز لہجے میں بولے۔  
 ”دیکھو تمہارے ساتھ اس گھر میں جو بھی ہو مجھے فوراً بتا دینا آج کل وہ زمانہ نہیں ہے جہاں عورت اپنی خدمت سے لوگوں کے دل جیت لیا کرتی تھی۔ آج کل لوگوں کو سیدھا رکھنے کے لیے خدمت کی نہیں دھونس کی ضرورت ہوتی ہے فلموں اور افسانوں کی ہیروئن کی طرح زیادہ تپتی ورتا بننے کی ضرورت نہیں ہے صاف صاف بتاؤ وہاں سب تمہارے ساتھ ٹھیک تو نہیں نا۔“ رویملہ بری طرح زچ ہو گئی ان کی باتوں پر۔

”میں کوئی ہیروئن نہیں بن رہی ہوں۔ اگر کوئی بات ہوگی تو میں آپ کو بتا دوں گی لگتا تو نہیں کہ آپ کو میری اتنی فکر ہے لیکن اگر آپ یہ سب میری خاطر کر رہے ہیں تو بھی میری باتیں چھپ کر سننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ رویملہ غصے میں کہہ تو گئی مگر ابراہار کو چونکاتا دیکھ کر اسے احساس ہوا اسے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔  
 ”الیان دو تین گھنٹے میں آجائیں گے میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ رویملہ نے صرف اور صرف انہیں یہاں سے ہٹانے کے لیے کہا تو وہ بھی بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئے۔

البتہ رویملہ ان کے پیچھے دروازے کو ایسے دیکھتی رہی جیسے ان کے رویے تو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔  
 ”آج کل لوگوں کو سیدھا رکھنے کے لیے خدمت کی نہیں دھونس کی ضرورت ہوتی ہے۔“ ابراہار بھائی کی کئی بات کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجنے لگی تو اس کا ذہن جانے کس ادھیڑ میں لگ گیا مگر کوئی سراہا تھ نہ آنے پر صرف ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔

”کہیں اس شادی کے لیے ابراہار بھائی نے کوئی دھونس پر مبنی ہتھکنڈا تو نہیں اپنایا؟“  
 اس سوال کا جواب تو اسے نہیں ملا البتہ دو گھنٹے بعد جب الیان اسے لینے آیا تو وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ کزنز جو کہ بریرہ کے سرانی بھی تھے وہ بھی تشریف لائے تھے۔

حالانکہ رویملہ سوچ رہی تھی کہ الیان اکیلا آئے گا تو وہ اس کے اور ابراہار بھائی کے بیچ ہونے والی گفتگو سے ان کے تعلقات کو پرکھنے کی کوشش کرے گی مگر شاید اور نوید کی موجودگی میں ایسی نوبت ہی نہیں آئی کہ الیان یا ابراہار کو ایک دوسرے سے بات کرنی پڑتی۔

پھر وہ سب بیٹھے بھی بہت مختصر سے وقت کے لیے تھے شاید اور نوید کو کچھ شاپنگ کرنی تھی شام تک وہ سب گاؤں کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔  
 الیان ان کے ساتھ ہی کہیں سے آ رہا تھا کہ راستے سے رویملہ لے کر گھر پر ڈراپ کرے گا اور ایک بار پھر ان لوگوں کے ساتھ نکل جائے گا۔

اب یہ سب سچائی تھی یا وہ واقعی کتنا زیادہ دیر یہاں رکھنے سے رویملہ سمجھ نہ سکی۔  
 البتہ بابا جانی ضرور سمجھ گئے تھے۔ کیونکہ آج الیان نے انہیں سلام کرنے کے بعد بڑے ہی رسمی سے انداز میں ان کی خیریت بھی پوچھی تھی لیکن کیونکہ بابا جانی اتنی بھی امید نہیں کر رہے تھے اس لیے وہ سمجھ گئے کہ ابراہار نے انہیں دم کا پیا ہے جو یہ تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے ورنہ شادی اور ولیہے والے دن تو الیان نے اتنی بھی بات

نہیں کی تھی البتہ جب ابراہار ریاض غفار کے ساتھ کھڑا کچھ گفتگو کرتا نظر آیا اس کے بعد ریاض غفار خاص طور پر ان کے پاس آ کر ان کی خیریت پوچھنے لگے تھے اور یہ اچانک ان کے رویے میں اتنا تغیر دیکھ کر وہ اسی وقت مشکوک نظروں سے ابراہار کو دیکھنے لگے تھے جانے اب اس نے کیا کہہ کر ان لوگوں کو پریشان کیا ہوگا۔  
 بابا جانی تو مارے شرمندگی کے سر نہیں اٹھا پا رہے تھے اسی لیے انہوں نے الیان یا اس کے کزنز کو چائے پر روکنے کے لیے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا اور ایک ہی دفعہ اجازت مانگنے پر الوداع کر دیا۔

البتہ رویملہ کو انہوں نے سینے سے لگا کر ہمیشہ خوش رہنے کی دعائیں دی تھیں رویملہ ان کا یکسر ہلا انداز دیکھ کر یہی سمجھی تھی کہ وہ بریرہ کے ولیہے میں شرکت کرنے اتنی دور جا رہی ہے اسی لیے وہ جذباتی ہو رہے ہیں۔  
 حالانکہ وہ تو اس کی اس شادی کو لے کر فکر مند تھے دھمکیوں پر مبنی یہ زبردستی کا رشتہ کب تک چلے گا اور اگر چلے گا بھی تو کیا رویملہ کو خبر نہیں ہوگی کہ اس شادی کے پیچھے کون سے عوامل کار فرما تھے تب اس پر کیا بیٹے گی۔



نوسید نے یونیورسٹی کے گیٹ پر پہنچ کر جیسے ہی خرم کو فون کیا خرم اشال پر ہی آدمی کھائی چاٹ چھوڑ کر اسے لینے چل پڑا۔

ہارون وغیرہ نے پوچھا بھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے مگر خرم نے کچھ بھی نہیں بتایا اور صرف مسکرا کر۔  
 ”دیکھتے جاؤ۔“ کہا اور چلا گیا نوسید کے ڈرائیور کو اپنی رہنمائی میں وہ پارکنگ تک لایا اور گاڑی پارک کرانے کے بعد نوسید اتر کر جانے لگی تو ڈرائیور پوچھنے لگا۔  
 ”کتنا ٹائم لگے گا؟“

”بس آدھا گھنٹہ۔“ نوسید اطمینان سے بولی تو خرم نے ٹوک دیا۔  
 ”نہیں، نہیں آدھا گھنٹہ کہاں۔ دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔“ نوسید نے حیرانی سے خرم کو دیکھا مگر خرم نظر انداز کر گیا۔

”اصل میں گاڑی میں تھوڑا سا کام کرانا ہے اگر دو گھنٹے لگنے ہیں تو میں ابھی کرا لیتا ہوں۔“ ڈرائیور نے کہا۔  
 ”ہاں ہاں جاؤ۔ جا کر آرام سے کرو۔“ نوسید سے پہلے خرم نے فراخ دلی سے اجازت دے دی۔  
 نوسید صرف خرم کو دیکھ کر رہ گئی اب بھلا وہ کیا بولتی وہ تو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جنیں قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



اس طرح جھوٹ بول کر یونیورسٹی آنا پہلے ہی اسے بہت عجیب اور نامناسب لگ رہا تھا اس پر دو گھنٹے بعد واپسی کا سن کر اسے اپنا آنا کچھ غلط لگنے لگا تھا ڈرائیور خرم کی اجازت پر ایسے گاڑی اشارت کر کے نکل گیا جیسے خرم کا ہی ملازم ہو۔

”آؤنا۔“ زوسہ دھول اڑاتی گاڑی کو دیکھ رہی تھی جب خرم نے ٹوکا اور اس کے چہرے پر لکھے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں تمہیں فوراً اسٹور روم میں لے جا کر تصویر دکھا دیتا لیکن کیا کروں اسٹور روم ابھی بند ہے جن اسٹوڈنٹس کو سامان نکالنے کے لیے چابی دی گئی تھی وہ اشال کی کچھ چیزیں وغیرہ لینے گئے ہیں ان کو آنے میں آدھا پون گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔“ زوسہ کے چہرے پر الجھن پھیلتی دیکھ کر خرم نے بظاہر بڑے مودب انداز میں کہا۔

”آپ آدھا پون گھنٹے کے لیے اگر کہیں جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیں اور ڈرائیور کو فون کر کے بلا لیں ورنہ اس سے بہتر آپشن یہ ہے کہ آپ کچھ دیر اشالز وغیرہ گھوم لیں تھوڑا سا وقت بھی گزر جائے گا اور دیکھنے والوں کو یہی لگے گا کہ آپ فیشیول دیکھنے آئی ہیں۔ اصل میں جن اسٹوڈنٹس سے میں چابی لے رہا ہوں انہیں بھی یہ نہیں بتایا کہ میں اندر کیوں جانا چاہتا ہوں ایسی باتوں پر کوئی یقین نہیں کرتا اور الٹا دوسرے کی ذہنی حالت پر شک کرنے لگتے ہیں اس لیے میں کسی کو کچھ بتا ہی نہیں۔“ زوسہ کے چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے خرم نے واضح طور پر دیکھے۔

اس کے چہرے پر پھیلی الجھن میں خاطر خواہ کمی آگئی تھی خرم کو یہ تو علم تھا کہ اس کا نفسیاتی علاج چل رہا ہے یقیناً اس نے ”تم پائل ہو“ اور ”تمہارا دماغ خراب ہے“ جیسے جملے ضرور سنے ہوں گے لہذا اس نے ایسی بات کہی جو سیدھی زوسہ کے دل کو لگی اور واقعی تھوڑی دیر بعد وہ پہلے سے قدر بہتر انداز میں مگر نوز نروس سی خرم کے ساتھ فیشیول میں داخل ہو گئی۔

خرم کو ایک انجان اور ایک بے حد حسین لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ہر نظر جو اس پر اٹھی وہ اس پر ٹک گئی سب کو حیران اور متحس دیکھ کر خرم کے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ ابھرنے لگی۔

وہ اس طرح لڑکیوں کے پیچھے پھرنے والے لڑکوں میں سے نہیں تھا اس کا تاثر کافی مضبوط کردار کے حامل شخص کا تھا یہاں تک کہ نمل سے متعلق ہو جانے کے باوجود وہ اس کے ساتھ بھی لوہڑی طرح نہیں رہا تھا۔

ایسے میں اس کا کسی لڑکی کے ساتھ ہونا ایک الجھنے والی بات تو تھی اور پھر لڑکی بھی وہ جو اس یونیورسٹی میں بھی دیکھی نہیں گئی اور جس کا حسن بھی ایسا ملکوتی کہ دیکھنے والا مجسمہ بن جانے پر مجبور ہو جائے پھر اگر لوگ متوجہ نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔

خرم اسے اشالز دکھا تا بلا آخر وہاں تک پہنچ گیا جہاں نمل اور سنبل کتابوں کے اشال پر کھڑی ورق گردانی کر رہی تھیں۔

”زوسہ تمہیں ریڈنگ کا شوق ہے کیا؟“ خرم ایسے بولا تھا جیسے بہت پرانی بے تکلفی ہو نمل اور سنبل دونوں نے ہی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

سنبل کی تو منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں جبکہ نمل ایک ہی نظر میں خرم کے چہرے پر پھیلے قفاخر کو دیکھ پل میں اپنی حیرت چھپا گئی تھی۔

اسے کون سا شک لگا تھا خرم کو کسی کے ساتھ دیکھ کر جو اسے اپنے تاثرات چھپانے میں دقت ہوتی البتہ اسے حیرت زوسہ کو دیکھ کر ہوئی تھی اگر کوئی اور ہوتی تو یہ ذرا سی حیرانی بھی اس کے حصے میں نہ آتی۔

”نہ۔۔۔ نہیں۔“ زوسہ کا انداز صاف ٹالنے والا تھا وہ خرم کی رہنمائی میں چلی جا رہی تھی خرم کو اشال پر رکتا

دیکھ کر وہ بھی مجبوراً ”ٹھہر گئی تھی۔“ ورنہ اسے تو کچھ لینا تھا نہ ہی دیکھنا تھا بلکہ جس طرح لوگ اسے دیکھ رہے تھے اسے محسوس کر کے اس کی فطری گھبراہٹ ایک بار پھر اس پر حاوی ہونا شروع ہو گئی تھی اس نے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی نمل اور سنبل کی طرف نہیں دیکھا تھا اس کا سر اور نظریں دونوں جھکی ہوئی تھیں۔

مگر تب بھی اسے بخوبی علم تھا کہ سامنے دو لڑکیاں کھڑی ہیں جو پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہیں۔

”ارے دیکھ لو یہاں بہت اچھا اشاک ہے خاص طور پر شاعری کا کلیکشن عین تمہاری پسند کے مطابق ہے۔“ خرم نے کتابوں کے اس جانب آتے ہوئے کہا جہاں نمل کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں ”سختہ ہائے وفا“ دیکھ کر خرم دلچسپی سے مسکرا دیا۔

”اپنے فیورٹ شاعر کی کتاب لیے بغیر اس اشال سے آگے بڑھ جانا تو زیادتی ہوگی یار۔“ خرم نے نمل کے ہاتھ سے کتاب ایسے لے لی جیسے نمل گاہک نہ ہو بلکہ ان کے انتظار میں کتاب لیے کھڑی ہو کہ آئیں اور دیکھیں۔

زوسہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کہے خرم نے اتنے یقین سے اس کے شاعری کے شوقین ہونے کی بات کی تھی کہ وہ بس بولنے والی تھی کہ مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں۔

لیکن نمل پر نظر پڑتے ہی اس کی ساری توجہ اس کی جانب مبذول ہو گئی۔

اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اور نمل ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں وہ تو بس یہ سوچے جا رہی تھی کہ یہ چہرہ اتنا دیکھا ہوا کیوں لگ رہا ہے۔

اصل میں اسکول میں بھی وہ ایسے ہی گم سم اور تنہائی پسند تھی اپنے آپ میں مگن رہنے والی کو بھلا کیا پتا کہ اسکول میں اور کون کون موجود ہے اسے تو شکلیں بھی یاد نہیں رہتی تھیں نام تو پھر بہت دور کی بات تھی۔

نمل، خرم کے اس طرح کتاب لے لینے پر بالکل جامد تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتی رہی جبکہ وہ زوسہ کی طرف پلٹ چکا تھا۔

”میں یہ تمہارے لیے لے رہا ہوں اور اب تم انکار نہیں کرو گی۔“ خرم زوسہ کے تاثرات کی پروا کیے بغیر صرف نمل کو سنانے کے لیے بول رہا تھا اصل میں اسے زوسہ کی فطرت کا اتنا اندازہ تھا کہ وہ اتنی خود اعتماد نہیں کہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 450 روپے

☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 500 روپے

☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین قیمت: 400 روپے

☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 250 روپے

☆ امرنیل، عمیرہ احمد قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

خوبصورت سرورق

خوبصورت چھپائی

شان بگٹے ہیں

مضبوط جلد

آفٹ پیپر

269

ماہنامہ کرن

268

ماہنامہ کرن

www.pdfbooksfree.pk



خرم کو اس اچانک کی بے تکلفی پر جھڑک سکے۔  
پھر وہ جس مقصد کے تحت اسے لایا تھا اگر وہی پورا نہیں ہوتا تو کیا ضرورت تھی اتنی مغز ماری کی۔  
خرم نے اس کتاب کی قیمت ادا کر کے زدبہ کی طرف بڑھادی۔

”میں نے کہا ہے نا تم انکار نہیں کرو گی۔ چلو آؤ دوسرے اساتذہ پر چلتے ہیں یہاں اب اور کچھ بچا نہیں ہے۔“  
خرم نے ایک نظر نمل پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا زدبہ بے بسی سے ہاتھ میں زبردستی تھمائی کتاب کو دیکھنے لگی پھر نمل اور سنبل کی نظریں خود پر جمی دیکھ کر فرار ہونے والے انداز میں خرم کے پیچھے چل پڑی۔  
”یہ خرم کیا کر رہا ہے؟“ سنبل نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

”وہی جو میں نے روپیہ کی شادی میں کیا تھا۔“ نمل نے بالکل بے تاثر لہجے میں کہا البتہ اس کی نظریں ابھی بھی زدبہ کی پشت پر جمی تھیں۔  
”لیکن تمہارے مقابلے میں سیر تھا۔ یہاں زدبہ ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ سنبل نے جرح کی۔

”اس سے خرم کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ نمل اب بھی ساٹ لہجے میں بولی تو سنبل چڑ گئی۔  
”لیکن مجھے پڑنا ہے اور یہ سب تمہاری اسٹوپڈ حرکتوں کی وجہ سے ہو رہا ہے اب تمہیں ہی اس مسئلے کو حل کرنا ہو گا۔“

”حل تو میں نہیں کر سکتی لیکن زدبہ کو ایک بار ضرور سمجھاؤں گی۔ آگے اس کی قسمت۔“ نمل نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

زدبہ خرم کے پیچھے کتابوں والے اسٹال سے باہر تو نکل آئی لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آس پاس موجود زیادہ تر لوگ ان دونوں کی طرف ہی متوجہ ہیں اسی لیے زدبہ کے گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ خرم کے پیچھے بھاگنے والے انداز میں چل رہی تھی۔

وہ خرم سے کہنا چاہتی تھی کہ جلدی سے اسے اسٹور روم دکھا دے وہ اپنے ڈرائیور کو فون کر کے بلا رہی ہے اس وقت وہاں نہیں رک سکتی۔

مگر خرم تو آگے ہی آگے سیٹی پر شوخ سی دھن بجائے ایسے گھوم رہا تھا جیسے جانے کون سا خزانہ مل گیا ہو۔  
اچانک زدبہ کو اس پر شدید غصہ آگیا قریب تھا وہ چیخ کر اسے پکار بیٹھتی کہ اچانک اس کی نظریں سامنے کی جانب اٹھیں اور جامد ہو گئیں۔

اسے عموماً ”شائستہ خالہ کا سایہ اس طرح دن دھاڑے گھر سے باہر کبھی نظر نہیں آیا تھا مگر آج وہ اس سے کافی فاصلے پر اپنی پوری ہیبت کے ساتھ کھڑی تھیں۔

ان کے سوکھے بکھرے بال ہوا کے دوش پر ادھر ادھر اڑ رہے تھے ان کا کٹنا پٹا چہرہ خون خون ہو رہا تھا۔  
زدبہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی اس کا حلق اتنا سوکھ گیا تھا کہ آواز بھی نہیں نکل رہی تھی ورنہ اس کا شدت سے دل چاہا خرم کو پکار کر پوچھے کیا اسے شائستہ خالہ کا سایہ نظر آ رہا ہے مگر وہ کیا پکارتی اس کی تو حالت غیر ہونے لگی تھی۔

کیونکہ شائستہ خالہ ایک لڑکے کے پاس کھڑی اسے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے ابھی اس پر حملہ کر دیں گی اور پھر واقعی شائستہ خالہ نے دونوں ہاتھ اس لڑکے کی گردن کی طرف اٹھادیے۔

اس سے پہلے کہ اس لڑکے کی گردن شائستہ خالہ کی گرفت میں آئی زدبہ پوری قوت سے چیخ پڑی۔  
(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



### جنت کی ضمانت

ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں داخل کر دے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔“

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ۔

”قیامت کے دن میرے زیادہ قریب اور زیادہ محبوب تم میں سے وہ ہوں گے جو اخلاق میں بہتر ہوں گے اور مجھ سے زیادہ دور اور زیادہ ناپسندیدہ ہوں گے جو تم سے اخلاق میں برے ہوں گے۔ جن کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور جو منہ پھلا کر تکلف سے (یعنی متکبرانہ انداز میں) باتیں کرتے ہیں۔“

(صحیح بخاری)

الماس علی۔ کراچی

### ایمان سے خالی دل

ایک یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں آیا اور کہا۔

”ہماری عبادت اللہ کو زیادہ پسند ہے کیونکہ جب ہم عبادت کرتے ہیں تو ہمیں کوئی خیال، دوسوہ نہیں آتا۔ جبکہ میں نے سنا ہے تم لوگ نماز پڑھتے ہو تو بہت سے خیالات تمہارے دل میں آتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس یہودی کی بات کا جواب دینے کا اشارہ کیا۔

آپ رضی اللہ عنہ نے یہودی سے کہا۔  
”دو گھر ہیں ایک خالی ہے دوسرا گھر ہیروں سے بھرا ہے۔ اب بتاؤ چور کس مکان میں جائے گا؟“ یہودی بولا۔

”ہیروں والے مکان میں۔“  
آپ رضی اللہ عنہ نے مسکرا کر جواب دیا۔  
”یہ حال کافراور مسلمان کے دل کا ہے۔ جس کا دل پہلے ہی ایمان سے خالی ہو وہاں شیطان کیا لینے جائے گا؟“

امبر آصف۔ کراچی

### صدقہ

”اگر تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ اور رزق کا کوئی راستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کر لو۔“  
افشاں۔ لاہور

### اقوال زریں

☆ اولاد کے لیے کچھ مت چھوڑو اگر وہ صالحہ ہوگی تو خدا خود کفیل کر دے گا اور اگر بد ہوگی تو گناہوں میں ان کی امداد کا مجرم نہ ہو۔ (عمربن عبدالعزیز)  
☆ ہماری توبہ بھی توبہ کی محتاج ہے کیونکہ اس میں خلوص نہیں ہوتا (راجہ بھری)  
☆ دین کی اصل عقل، عقل کی اصل علم اور علم کی اصل عمل ہے اور بغیر عمل کے بہشت کی طلب کرنا خود ایک گناہ ہے۔  
☆ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ (حدیث)



☆ جو مسکین کی فریاد سن کر کان بند کر لیتا ہے وہ خود بھی فریاد کرے تو اس کی فریاد نہ سنی جائے گی۔  
(حضرت سلیمان علیہ السلام)  
☆ کفار کے ساتھ جہاد کرنا جہاد اصغر ہے اور اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا جہاد اکبر ہے۔ (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ)  
☆ تعجب ہے اس پر جو موت کو برحق جانتا ہے اور پھر بھی ہنستا ہے۔ (حضرت عثمان)  
☆ گناہوں پر نادم ہونا انہیں مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر مغرور ہونا انہیں مٹا دیتا ہے۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

عائشہ مری۔ کوئٹہ

بیٹی

○ جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”اے لڑکی! تو زمین پر اتر میں تیرے باپ کی مدد کروں گا۔“  
○ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ”عورت کے لیے یہ بہت مبارک ہے کہ اس کی پہلی اولاد بیٹی ہو۔“  
○ ”جس شخص کی بیٹیاں ہوں اسے برانہ سمجھو۔ اس لیے کہ میں بھی بیٹیوں کا باپ ہوں۔“  
○ ایک مفکر کا کہنا ہے کہ میرا بیٹا اس وقت تک میرا ہے جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی لیکن میری بیٹی مرتے دم تک میری بیٹی رہتی ہے۔  
ایمن۔ کراچی

عزیز و فکر

زندگی بار بار نہیں آتی۔ صرف ایک بار آتی ہے اور وقت سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی ریت کی طرح ہے تم اس میں سے کتنی مٹھیاں بھر سکتے ہو ایک یا پھر دو۔ وقت تو بس پچاس یا سو برس کا ہے مگر اس سے زیادہ نہیں۔ پھر سوچو تم اس ریت کو کھا نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم اس ریت کو دو سروں کی آنکھوں میں

جھونک سکتے ہو اور بہت سے لوگ اپنی زندگی میں ایسا کرتے ہیں۔ وہ لوگ ظالم ہوتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ جو اس ریت کو دو سروں کی آنکھوں میں ڈالنے کی بجائے اپنی آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ لوگ بزدل اور اذیت پسند ہوتے ہیں۔  
کچھ لوگ اس ریت سے محل بناتے ہیں۔ وہ لوگ احمق ہوتے ہیں کچھ لوگ نہایت احتیاط سے ریت کے ایک ایک ذرے کو گننے لگتے ہیں۔ وہ اس دنیا کے کنجوس ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت کو اپنے سر پر ڈال لیتے ہیں اور ہنسنے لگتے ہیں۔ وہ لوگ اس دنیا کے بچے ہیں اور دنیا کی ساری معصومیت انہی کے نام سے قائم ہے۔

”کچھ بھی ہو۔“ اس نے سوچا۔

”میں بچہ ہی بنوں گا۔“ اور وہ ساحل کی ریت سے

گھر کی طرف چل پڑا

(کرشن چندر کی کتاب ”باون پتے“ سے اقتباس)

رحمانہ۔ کراچی

کچھ لوگ

کسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں

جسم کی ٹھنڈی سی

تاریک سیاح قبر کے اندر

نہ کسی سانس کی آواز نہ سسکی کوئی

نہ کوئی آہ نہ جنبش نہ ہی آہٹ کوئی

ایسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں

ان کو دفنانے کی زحمت بھی اٹھانا نہیں پڑتی

(گلزار)

ارم آفتاب۔ کراچی

سرگوشی

تمہاری آنکھوں کے سن ڈورے

وہ بات کہنے کے منتظر ہیں

جو تمہارے اب تک کہی نہیں ہے

مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے

تمہارا چہرہ اک آئینہ ہے

کہ جس پہ لکھی

تھکست دل کی عبارتوں نے

بہت سی باتوں کو بن کے بھی

ہماری آنکھوں سے کہہ دیا ہے

(خالہ معین)

صدف عبداللہ۔ لاہور

گرفتار عشق

○ بوجھ میں اگر محبت نہ ہو تو وہ بے شک ایک تیکے کا

ہو برداشت نہیں ہوتا۔

○ پہاڑوں کے اندر جاتے ہی انسانی انا سب سے

پہلے دم توڑتی ہے۔ اور انسان قدرت کے آگے لپا جھو

جاتا ہے۔

○ جتنے بھی تلخ ذائقے ہوتے ہیں بے شک کافی ہو

چاکلیٹ یا پھر زندگی ہو ان کے لیے ذوق کی پرورش کرنا

پڑتی ہے۔

○ برے کام اس لیے برے نہیں کہ وہ ممنوع ہیں

بلکہ ممنوع اس لیے ہیں کہ وہ مضر ہیں۔

○ اعتماد پر بت کا پتھر ہے لیکن اگر یہ ایک بار اکھڑ

جائے نیچے ہی آتا ہے۔

فوزیہ ثمری۔ گجرات

خاموشی کی بات

جس سے آپ بہت ہار کرتے ہیں۔ اس سے کم

بات کریں۔ کیونکہ جو آپ کی خاموشی نہیں سمجھ سکتا

وہ گفتگو بھی نہیں سمجھے گا۔

(جان کیشس)

شافعہ اعوان۔ کراچی

کیا معلوم

نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم

بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

ہجوم شوق میں اب کیا کہوں کیا نہ کہوں

مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مدعا معلوم

ثمری۔ گجرات

وصال و ہجر

وصال و ہجر سے وابستہ تہمتیں بھی گئیں

وہ فاصلے بھی گئے، اب وہ قربتیں بھی گئیں

دلوں کا حال تو یہ ہے کہ ربط ہے نہ گریز

محبتیں تو گئی تھیں، عداوتیں بھی گئیں

ذکیہ خان۔ کراچی

دکھ

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے اسے دکھ

کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے

دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دو سروں کے لیے نرم پڑ

جاتا ہے۔

پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور باخوشی سرزد

ہونے لگتے ہیں۔ دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے اس پر

صابر و شاکر ہی چڑھ سکتے ہیں۔

(بانو قدسیہ کی کتاب ”دست بستہ“ سے انتخاب)

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

محبت اور جنگ

ایک دفعہ ایک سپاہی نے ٹیپو سلطان سے کہا۔

”کیا محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔“

ٹیپو سلطان نے تاریخ ساز جواب دیتے ہوئے کہا۔

”یہ انگریزوں کا قول ہے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ محبت

اور جنگ میں جو کچھ ہو وہ جائز ہو۔“

فوزیہ ثمری۔ گجرات

فرمائش

ہوائی جہاز میں پہلی مرتبہ سفر کرنے والے ایک

صاحب کو التیایا آرہی تھیں۔ آخر ایئر ہوسٹس ان

کے قریب آئی اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

”سر آپ کے لیے کچھ لاؤں۔“

”ہاں۔“ ان صاحب نے ہانپتے اور کراہتے ہوئے

جواب دیا۔



”میرے لیے ایک ایئر پورٹ لے آؤ۔“  
ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

### اقوال زریں

- جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے ان کے پاس سوچنے کو بہت کم باتیں ہوتی ہیں۔
- قدرت کو زبان کی سختی پسند نہیں، اس لیے اس میں ہڈی نہیں۔
- سختی کا ہاتھ اسے کبھی نہ کبھی دولت مند بنا دیتا ہے۔
- دلوں کو فتح کرنے کے لیے تلوار کی نہیں عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔
- غموں کو چھپا کے چہرے پر (خوشی) مسکراہٹ سجائے رکھنا عظمت ہے۔
- پاکیزگی انبیاء کی صفات میں سے ہے۔
- مومن زندگی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کافی مختصر سی لذت سے خوش رہتا ہے۔

صفیہ صبا۔۔۔ کراچی

### تین اشعار

کاش آزاد قبیلے کے سخن ور ہوتے  
ہم محاذوں پر نہ جکتے تو سکندر ہوتے  
خود فریبی کے خرابوں میں رہے ہم ورنہ  
اپنی اوقات میں رہتے تو قلندر ہوتے  
موج کوثر کی قسم ہم تھے محبت کے ولی  
خاک کے درپر نہ جھکتے تو سمندر ہوتے  
نوشی۔۔۔ گاؤں بدر مرجان

### یادیں

بس یہی مشکل ہے کہ بھول جانا انسان کے بس میں  
نہیں۔۔۔ جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے وہ یادیں کے بار  
بار گزرتا ہے۔ بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی  
ہے۔ انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے لیکن اس کے

ظلم کو بھول نہیں سکتا۔ بھول جانا انسان کے اختیار میں  
نہیں۔

موسم گزر جاتے ہیں لیکن یاد نہیں گزرتی۔ مرحوم  
زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی۔ پرانے چہرے نئے  
چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پرانے غم نئے  
غم میں شامل نظر آتے ہیں۔

پرانی یاد غنی زندگی کے ساتھ چلتی ہے۔ تہ در تہ یاد  
انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ یاد سے نجات کی  
کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں  
ہو جاتی ہے۔

(واصف علی واصف کی کتاب ”دل دریا سمندر“  
سے اقتباس۔)

فرزانہ مسعود۔۔۔ خوشاب

### خشک چشمے

☆ لوگوں پر جو بھی بلاناظر ہوتی ہے وہ آنکھ کے سبب  
سے ہوتی ہے، نعمت و مصیبت دونوں آنکھ میں رکھ دی  
گئی ہیں۔

☆ جو نیک بخت ہیں وہ ماں کے شکم ہی سے نیک  
بخت پیدا ہوتے ہیں اور جو بد بخت ہیں وہ بھی اس کے  
شکم ہی سے بد بخت نکلتے ہیں۔

☆ شریف پارسا ہو جاتا ہے تو تواضع اختیار کرتا  
ہے۔ کمینہ پارسا ہو جاتا ہے تو تکبر اختیار کرتا ہے۔

☆ دل آنکھ کی تابع ہے، آنکھ کے بگڑنے کے بعد دل  
کی حفاظت مشکل ہے، اور دل کے بگڑنے کے بعد  
شرم گاہ کی حفاظت مشکل تر ہے۔

☆ اگر کسی نے تیرے ایذا کے لیے راہ میں کانٹے  
بکھیر دیے ہیں تو تو اس کے راستے میں انتقاما ”کانٹے نہ  
رکھ“ ورنہ دنیا میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں  
گے۔

☆ اپنی حاجت پر دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھنا ہی  
حقیقی کرم ہے۔

||

### بشرط مجھ



کوئی نا امید نہیں ٹوٹا  
کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا  
میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا  
چہرے پر گدرد ملال لیے  
اک ہر امید خیال لیے  
اک خالی دست سوال لیے  
جب قافلہ اس در پر پہنچا  
میں اس گھر کو پہچان گیا  
پھر خالی ہاتھ ہی لوٹ آیا  
اس در سے مجھے کیا ملنا تھا  
وہ گھر تو میرا ہی اپنا ہے

شہر یا تو، کی ڈائری میں تحریر  
انور شعور کی غزل

بہت دن رہ لیے ناراض اب من جائیں ہم دونوں  
چلو اک بار پھر سے آشنا بن جائیں ہم دونوں

یہاں والوں کی آنکھوں میں جیا ہو یا مروت ہو  
تو آخر کیوں یہ بستی چھوڑ کے بن جائیں ہم دونوں

کسی ہوٹل میں چل کر سوچتے ہیں شام کی بابت  
گزائیں وقت ساحل پر کہ گلشن جائیں ہم دونوں

یہاں ہونا نہیں کافی یہاں بننا ہی پڑتا ہے  
چلو اک دوسرے کے کچھ نہ کچھ بن جائیں ہم دونوں

یہیں کچھ دور واقع ہے ہمارے پیارے کامدن  
اگر دے زندگی فرصت تو مدفن جائیں ہم دونوں

شعور اس بھیڑ میں رستہ طے تو بھیڑ سے باہر  
عجب سا اک نشیمن ہے، نشیمن جائیں ہم دونوں

سدرہ فزیر، کی ڈائری میں تحریر  
سرشار صدیقی کی نظم

### دل دریا،

لوگوں نے کہا  
اس در سے بھی

صدق سلیمان، کی ڈائری میں تحریر  
دفا چشمی کی غزل

جہان لمحہ سر بستر کے حصار میں ہوں  
میں زندگی ہوں مگر بہت مخاہر میں ہوں

خود آگہی کے زمان و مکاں سے گزرا ہوں  
دو در ذات کے دیائے بے کنار میں ہوں

بدن کی راکھ میں پھرا انگلیاں گڑولی میں  
شرار زلیست کو چھوڑنے کے اضطراب میں ہوں

شکستگی کے مسلسل عمل سے ہوں دوچار  
میں ارتقاء کے پس پر وہ آتشا میں ہوں



تلاش میں ہوں کہ بات آئے قدرتِ تسخیر  
حریفِ وقت ہوں اور پسیرِ نزار میں ہوں

ارم آفتاب، کی ڈائری میں تحریر  
خالد معین کی نظم

مکالمہ

تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں  
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو  
کہ جب ہوا میں  
سیرِ دگی سے نہال ہو کر  
تمہارے پہلو میں ڈولتی ہوں  
تمہارے آپٹل سے کھینچتی ہوں  
تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں  
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو  
کہ جب ہوا میں

اُداس لہجے میں تم سے پوچھیں  
تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا  
تمہارے چہرے پہ کیا لکھا ہے  
تمہارے آنکھتے ہوئے قدم پر  
یہ لڑکھڑاہٹ سی کس لیے ہے  
تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں  
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو  
کہ جب ہوا میں

بدلتے موسم کی سازشوں میں شریک ہو کر  
تمہارے جی میں غلط بیانی کا زہر گھولیں  
تمہارے بارے میں جھوٹ بولیں  
سنو اے پیاری سی، سالوٹی سی، جھیلی لڑکی!  
یہی ہوائیں تو آتے جاتے مسافرانِ رہ و فاقہ پر  
ہزار تہمت اچھالتی ہیں  
محببتوں پر یقین نہ ہو تو  
دلوں میں پیہم  
ہزاروں واہوں کو ڈالتی ہیں  
تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں  
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو  
کہ جب ہوا میں ... !

سجائے کتنے ہی آدرش ہو گئے معدوم  
مری بساط ہی کیا ہے میں کس قطار میں ہوں

پس وجود ہوں، نامکشف و فاضح  
کسی نگاہِ تصرف کے انتظار میں ہوں

زمینِ احسنِ رحمان، کی ڈائری میں تحریر  
اجمل سراج کی غزل

اور تو خیر کیا رہ گیا  
ہاں مگر اک غلام رہ گیا  
غم سبھی دل سے رخصت ہوئے  
درد بے انتہا رہ گیا

زخم سب مندمل ہو گئے  
اک درِ پیچہ کھلا رہ گیا

رنگ جانے کہاں اڑ گئے  
صرف اک داغِ سارہ گیا

آندوؤں کا مرکز تھا دل  
حسرتوں سے گھرا رہ گیا

زندگی سے تعلق مرا  
ٹوٹ کر بھی جڑا رہ گیا

کس کو چھوڑا خزاں نے مگر  
زخمِ دل کا ہرا رہ گیا

کامِ اجل بہت تھے ہمیں  
ہاتھ دل پر دھرا رہ گیا



راحمہ کراچی فرح خان کراچی  
اب تو ڈر ہے مجھے کہ غم تیرا  
تجھ سے بھی معتبر نہ ہو جائے

امیر لاہور دو چار سوالات ہیں پھر مجھ کو اجازت  
میں سیر کی خاطر تو فلک پر نہیں آیا

اقطی لاہور یہی کھلا ہے کہ مسافر نے خود کو مار کیا  
تری تلاش کے صحرا کو پار کرتے ہوئے

زمینِ لاہور اس سمت سمیٹوں تو بکھر تاہے ادھر سے  
دکھ دیتے ہوئے یاد نے دامن نہیں دیکھا

راہیہ کراچی آتا ہے کون آنکھ میں آنسو کے روپ میں  
اے میرے لانا دار، کہاں جلتے ہو تم

گوہر پشاور میں راہِ سود و زیاں سے گزرتا جاتا ہوں  
کبھی گریز کبھی اختیار کرتے ہوئے

کنول جہیں میں مر گیا ہوں خود پہ وار کرتے ہوئے  
نہیں گرا مری قاتل انا کا تاج محل

کراچی زمیں نے کھینچ کر دل سے لگایا  
اُڑانی آسمان نے خاک میری

ارم ناز لاہور تو جو آئے تو اسے مل کر سمیٹیں دونوں  
مجھ اکیلے سے کہاں ہجر سنہالا جائے

نکاح پھیر کے مجھ کو برہنہ جسم نہ کر  
مرے بدن پہ نظر کا لباس رہنے دے  
میں تیرے وصل کی لذت کا معتبر ہوں مگر  
تو اپنے ہجر میں مجھ کو اداس رہنے دے



فیصل لاہور  
میں اداس کو بھولوں تاہم کسی باتیں کرتے ہو  
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی اچھا لگتا ہے  
اسی جاوید علی پورچہ  
ایک صورت ہے تصور کے نہاں خطنے میں  
اپنی تصویر کوئی بھول گیا ہو جیسے  
فرزادہ کراچی  
یوں تو رہتی ہے تصور میں تمہاری صورت  
پھر بھی مل جاؤ تو تسکین سی ہو جائے  
مہوش یوسف لاہور  
کوئی امید بہ نہیں آتی  
کوئی صورت نظر نہیں آتی  
پہلے آتی تھی ہر اک بات پر ہنسی  
اب کسی بات پر نہیں آتی  
شکیلہ غانیوال  
مگریم ذوق عشق کی صورت یہی تو ہے  
ہنس ہنس کے تیری یاد میں آنسو بہا میں ہم  
نہرہ لطیف آباد  
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم  
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری  
صائمہ سلیم گوجرہ  
سچ کہوں اپنی محبت پہ ندامت ہی ہوئی  
جب بھی دیکھی تری آخری ہوئی صورت میں نے  
ثمرین فضل میرا  
توڑ کر دیکھ لیا آئینہ دل تو نے  
تیری صورت کے سوا اور بتا کیا نکلا  
حنیفہ ایک  
عمر کاٹ دی عہد نبھانے کے لیے  
عہد باندھا تھا کسی نے آزمانے کے لیے  
وہ بظاہر ملا تھا اک لمحے کے لیے عذیم  
عمر ساری چاہیے اس کو بھلانے کے لیے  
مہوش انک  
وہ دودھ کیا ہوا کہ مرے پاس آ گیا  
خاوند یہ سانچہ تو مجھے راس آ گیا

انیتا  
وہیں پر موسم پھر کے آ گیا ہوں  
محبت ہے کہ صبح کا سفر ہے  
حنا کنول حویلی لکھا  
کیوں نہ ڈر جاؤں تیری قوت سے  
میں ہوں تنہا، تیری خدائی ہے  
کرن عدنان کراچی  
درد کی خوشبو گئی زخموں کی دغائی گئی  
موسم ہجراں تری اب کے پذیرائی گئی  
کون سی محفل، کہاں کے روز و شب کیسے قیام  
زندگی تو اصل میں اک سانس ہے آئی گئی  
فوزیہ ثمرٹ بکرات  
شب غم کی سحر نہیں ہوتی  
ہو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی  
زندگی تو ہی مختصر ہو جا  
شب غم مختصر نہیں ہوتی  
ریحانہ علی کراچی  
جو ہجر وصال کر دیا ہے  
تو نے کمال کر دیا ہے  
اک لمحہ عشق تھا سو میں نے  
صرف مہ وصال کر دیا ہے  
نا معلوم صفیہ سعدیہ  
ہر زمانے کے لیے زندہ حوالہ ہوں سلیم  
میں چلا جاؤں گا، میرا تذکرہ رہ جائے گا  
شکیلہ شہزادی ملک وال  
مجھے زخم تھا مگر میں بکھر گیا محسن  
وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا  
عائشہ، تحریم گوجرہ  
کرتے ہیں یہ ایسے عیروں کی خامیوں کا تذکرہ  
اپنے عمل میں لوگ فرشتہ ہوں جیسے  
حمیرہ مہتاب کراچی  
گو دیکھی دل کو بہت ہم نے بچایا پھر بھی  
جس جگہ زخم ہوں وہاں پوٹ سدا لگتی ہے



### جملہ حقوق محفوظ

بارش میں بھگتے ہوئے ایک صاحب نے دور  
سے ٹیکسی آتی دیکھی تو لپک کر بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر  
اسے روکا، لیکن اس وقت اس کے غصے کی انتہا نہ رہی  
جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقب سے ایک  
خاتون نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور  
کے برابر بیٹھ گئیں۔  
”یہ تو بڑی ڈھٹائی ہے۔“ وہ صاحب غصے سے  
بولے۔

”ٹیکسی کو میں میں نے روکا تھا۔“  
”ضرور روکا ہوگا۔“ خاتون نے مسکراتے ہوئے  
کہا۔  
”لیکن اس ڈرائیور سے شادی دو سال پہلے میں  
نے کی تھی۔“

خالدہ مصطفیٰ اسلام آباد  
ایک تیر سے....!

عابد نے شبیر سے کہا۔  
”سنا ہے تمہاری متکئی زاہد صاحب کی جڑواں  
بیٹیوں میں سے ایک سے ہو گئی ہے؟“  
”ہاں۔ تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ شبیر نے تصدیق  
کی۔

”لیکن ان دونوں بہنوں کی شکلیں تو ایک جیسی  
ہیں، تمہیں ان میں امتیاز کرنے میں مشکل پیش نہیں  
آتی؟“ عابد نے تجسس سے پوچھا۔  
”میں امتیاز کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔“ شبیر  
نے اطمینان سے جواب دیا۔

آصفہ کراچی

### پسند کی حجامت

فوجی کمانڈر ایک سار جنٹ کے ساتھ نئے بھرتی  
ہونے والے جوانوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی  
تقریر شروع کی۔ چند باتوں کے بعد وہ بالوں کی حجامت  
کے موضوع پر آیا۔

”بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔“ یہ  
سن کر لمبے بالوں والوں نے اطمینان کی سانس لی۔  
کمانڈر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں، مگر ان  
کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ۔“ اس نے اپنے سر  
سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سوکھ کر کٹ کھائی۔  
”اور سار جنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔“ سار جنٹ  
نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی وہ گنجا تھا۔

شافعہ راولپنڈی

### وجہ تسمیہ

ایک صاحب نے دفتر میں اپنے ساتھی کو بتایا۔  
”میرے اور میری بیوی کے درمیان پانچ ماہ بے حد  
خوشیوں بھرے گزرے، مگر آج سے ہمارے درمیان  
زوردار جھگڑے شروع ہو گئے ہیں۔“ دوست نے  
پوچھا۔

”اس تبدیلی کی وجہ؟“ ان صاحب نے جواب  
دیا۔  
”وہ پانچ ماہ کے بعد آج ہی اپنے میکے سے واپس آئی  
ہے۔“

روینہ نانہ کراچی

### اعتراف

آمنے سامنے سے آتی ہوئی ایک خاتون اور ایک



صاحب کی گاڑی آپس میں ٹکرائیں۔ خاتون گاڑی سے اتر کر معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔  
”غلطی میری ہے۔“

”نہیں! غلطی میری ہے۔“ وہ صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

”میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ سامنے سے آنے والی کار کو ایک خاتون چلا رہی ہیں، میں چاہتا تو جلدی سے اپنی گاڑی کچے میں اتار کر کسی درخت کے پیچھے پناہ لے سکتا تھا، لیکن میں نے اپنی گاڑی کو سیدھا چلنے دیا اس سے بڑی غلطی بھلا کیا ہو سکتی ہے؟“

اعتبار غزالہ پروین۔ لاہور

ایک صاحب بہت دیر سے اسٹیشنری کی دکان پر مبارک باد کا کارڈ تلاش کر رہے تھے تاکہ شادی کی سالگرہ پر بیوی کو دے سکیں۔ ان کی تلاش جب کافی طول پکڑ گئی تو سیلز مین ان کے قریب آیا اور بولا۔  
”سر! میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

”ہاں! مجھے کوئی ایسا کارڈ دے دو جس کے مضمون پر میری بیوی اعتبار کر سکے۔“ ان صاحب نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

عارفہ۔ کراچی

### احترام

دو دوست سڑک سے ملحقہ میدان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک دوست ہٹ لگانے کو تیار کھڑا تھا کہ سڑک کے سامنے سے جنازے کو آتا دیکھ کر رک گیا۔ اس نے بیٹ زمین پر رکھا اور ہیٹ اتار کر احتراماً سر جھکا دیا۔

جنازہ گزر جانے کے بعد دوسرے دوست نے کہا۔  
”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم جنازے کا بڑا احترام کرتے ہو۔“

”مجھے اتنا احترام تو کرنا ہی چاہیے تھا۔ آخر مرحومہ نے بیس سال تک بیوی کی خشیت سے میرا ساتھ دیا ہے۔“ پہلے دوست نے وجہ بیان کی۔

حنا سلامت خان۔ کراچی

### غلط علاج

ایک ڈاکٹر اپنے دوست کے ساتھ پارک میں چل قدمی کر رہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک عورت کو دیکھ کر باڑ کے پیچھے چھپنے لگا۔ دوست نے پوچھا۔  
”کیوں بھی کیا ہوا؟“

”میں اس عورت سے بچنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں! ایسی کیا بات ہے؟“

”میں نے اس کے شوہر کا علاج کیا تھا، اس لیے وہ مجھ سے خفا ہے۔“

”تو کیا وہ مر گیا۔“ دوست نے دریافت کیا۔

”نہیں! وہ میرے علاج سے ٹھیک ہو گیا۔“ ڈاکٹر نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

شاہین۔ بکیرا شریف

### گھر کا بھیدی

کنجوس ابا جان نے پانچ روپے کا سکہ نکالتے ہوئے اپنے بچوں سے کہا۔ ”یہ میں تیزاب سے بھرے ہوئے جار میں ڈال رہا ہوں، کیا یہ اس میں حل ہو جائے گا؟“

بڑے بچے نے کہا۔ ”جی نہیں۔“

ابا نے پوچھا۔ ”آپ کو کیسے علم ہوا؟“

”اس لیے کہ اگر یہ حل ہو جاتا تو آپ کبھی اسے تیزاب میں نہ ڈالتے۔“ بچے نے جواب دیا۔

شارقہ۔ راولپنڈی

### دوا ہی کافی ہے

ایک شخص نے شہر سے باہر سنسان سڑک پر ایک شناسا ڈاکٹر کو دیکھا، جو بہت تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا اور کندھے پر بندوق لٹک رہی تھی۔ اس شخص نے ڈاکٹر سے پوچھا۔  
”آپ اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہیں؟“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”قریب کے گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنا ہے۔“

اس شخص نے برکتہ جواب دیا۔  
”مریض کے لیے آپ کی دوا ہی کافی ہے۔ پھر اس بندوق کی کیا ضرورت ہے۔“

رمشا خان۔ چکوال

### تاویل

ایک صاحب بیگم کی فرمائش پر ایک کتا خرید لائے۔ بیگم اس کتے کو سدھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک روز صاحب نے کہا۔  
”بیگم! میرا خیال ہے کہ تم اس کتے کو اس حد تک کبھی نہ سدھا سکو گی کہ تمہارے اشاروں پر چلنے لگے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو ڈیر۔“ بیگم نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”یاد ہے، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو تم خود کتنے اڑیل تھے؟“

شہلا رفیق۔ کھاریاں کینٹ

### وجہ افتخار

اسکول میں یوم وینڈین کی ایک تقریب کے دوران ٹیچر نے ایک خاتون کو بتایا۔  
”ہم سب ٹیچرز آپ کے بچے کو ایک حیرت انگیز بچہ کہتے ہیں۔“ مختصرہ خوشی سے پھولے نہ سائیں۔  
لیکن ظاہر نہ ہونے دیا۔ بظاہر انجان بننے ہوئے بولیں۔  
”ایسی کیا خوبی ہے میرے بچے میں؟“  
”در اصل اسے دیکھ کر ہم سب حیرت سے سوچتے ہیں کہ کیا زندگی میں یہ کبھی کچھ سیکھ سکے گا۔“ ٹیچر نے جواب دیا۔

فائزہ نسیم۔ لطیف آباد

### سپر اشار

ایک ہیرو ٹائپ نوجوان ماہر نفسیات کو تیار ہوا تھا۔  
”میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نہ تو گاسکتا ہوں، نہ ڈانس کر سکتا ہوں، نہ مجھے اداکاری آتی ہے اور نہ ہی میں

فائزہ نسیم۔ لطیف آباد

### سپر اشار

ایک ہیرو ٹائپ نوجوان ماہر نفسیات کو تیار ہوا تھا۔  
”میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نہ تو گاسکتا ہوں، نہ ڈانس کر سکتا ہوں، نہ مجھے اداکاری آتی ہے اور نہ ہی میں

تماشا یوں کو لطفے سا کرہٹا سکتا ہوں۔ مجھے کوئی ساز بھی بجانا نہیں آتا اور سچ تو یہ ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”پھر آپ شو بز چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ ماہر نفسیات نے کہا۔

”میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا جناب۔“ ہیرو نے بے بسی سے جواب دیا۔

”میں اسٹیج کی دنیا کا سپر اشار ہوں۔“

اسماء شبیر۔ جہلم

### حفظانِ صحت

ایک مال دار خاتون اپنے کتے کے ساتھ پھلوں کی خریداری میں مصروف تھیں۔ اس دوران ان کا کتا کچھ پھلوں کو چاٹنے لگا۔ جب اس نے یہ عمل بار بار کیا تو دکان دار سے نہ رہا گیا اور اس نے نرمی سے عورت کی توجہ اس کتے کی طرف کرائی۔ عورت نے کتے سے کہا۔

”ٹوٹی بند کرو یہ حرکت، تمہیں اتنا بھی خیال نہیں کہ یہ پھل دھلے ہوئے نہیں ہیں۔“

صباحہ۔ کراچی

### اتنی ہمت

ایک تاجر کا حوصلہ بندھاتے ہوئے نفسیاتی علاج کے ماہر نے کہا۔  
”ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کیجیے۔ کاروبار اگر آج مندا ہے تو کل ضرور چمکے گا۔ مصیبت سامنے آئے تو ہمت سے اس کا سامنا کیجیے۔ اس کی ہنسی اڑائے۔“ تاجر نے ہنسنے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔ میری بیوی مجھ سے زیادہ لمبی اور ٹکڑی ہے۔“

فوزیہ ثمرت۔ گجرات



# کرن کا دستہ خزان

خالہ جیلانی

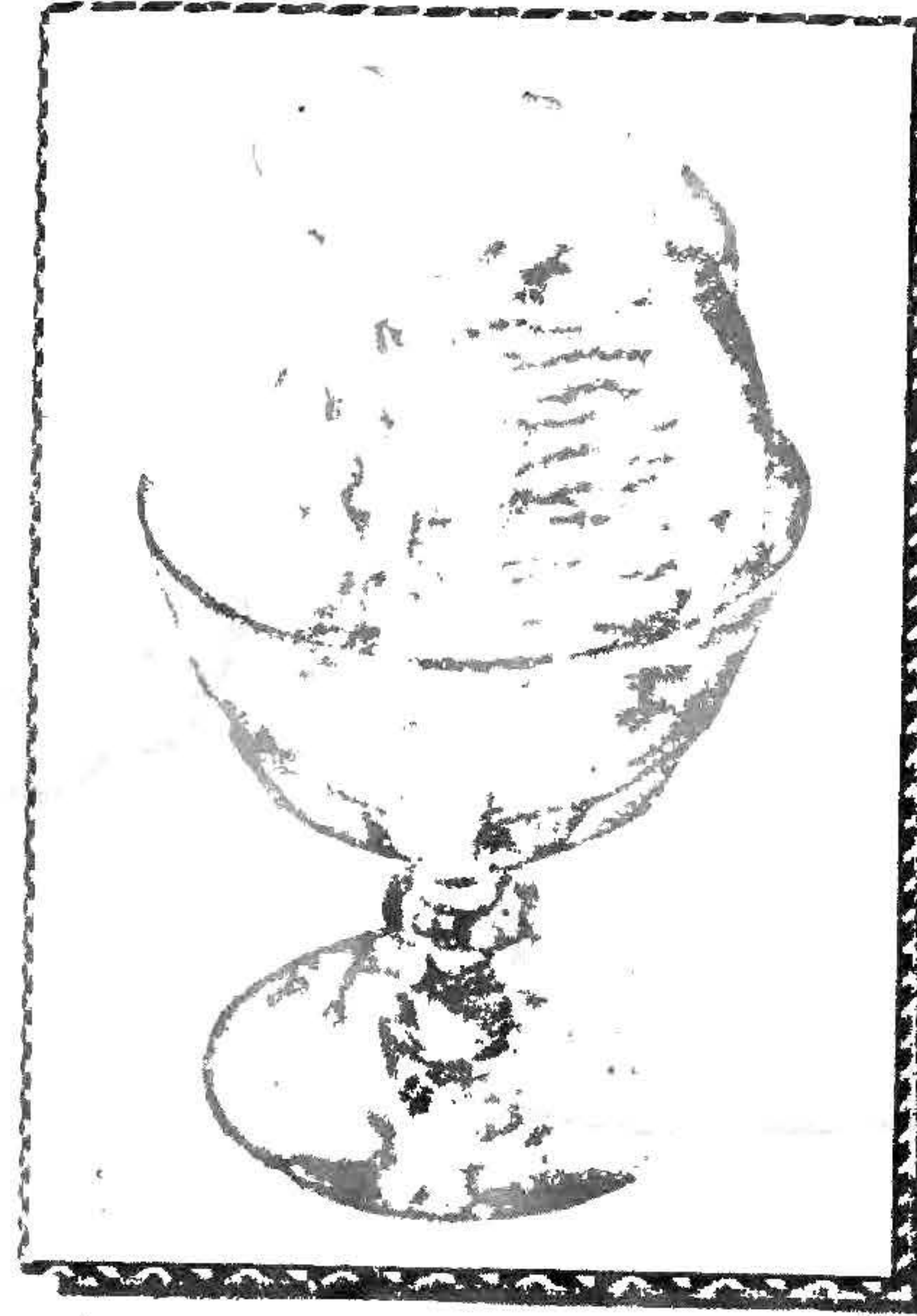
## چاکلیٹ آئس کریم

اجزا :	دودھ
انڈے کی زردیاں	دو عدد
کوکو پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
چینی	آدھا کپ
نمک	ایک چٹکی
کوکنگ چاکلیٹ (چوپ کر لیں)	آدھا کپ
کریم	ایک کپ

سوس پین میں دودھ گرم کریں اور اس میں انڈے کی زردیاں پھینٹ کر ڈالیں چمچے چلاتے رہیں۔ چینی ڈالیں۔ چینی حل ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ اور ٹھنڈا کر لیں ایک ویسپی میں پانی گرم کریں۔ اس پر پالہ رکھیں اس میں چاکلیٹ ڈال کر مبلٹ کریں۔ کریم بھی ڈال دیں۔ کریم چاکلیٹ پھل جائیں تو زردی کے مکسچر میں مکس کر دیں اور کوکوپاؤڈر، نمک بھی مکس کر لیں۔ ٹھنڈا کر کے پھینٹیں۔ فریزر میں دوبارہ رکھیں۔ پھینٹنے کا عمل تین سے چار بار دہرائیں۔ ایرٹائٹ باکس میں رکھ کر دس سے بارہ گھنٹے کے لیے جمائے رکھ دیں۔

## اسٹرابیری آئس کریم

اجزا :	شکر
میدہ	ایک کپ
نمک	دو کھانے کے چمچے
دودھ	ایک چٹکی
انڈے (پھینٹ لیں)	دو عدد
اسٹرابیری پیوری	دو عدد



ڈیلا ایسنس  
آئسنگ شوگر  
کریم  
ڈیرھ چائے کے چمچے  
چوتھالی کپ  
ڈیرھ کپ

ترکیب :  
آئسنگ شوگر، میدے اور نمک کو مکس کر کے ایک بھاری پینڈے کے سوس پین میں ڈالیں۔ اس سوس پین کو ایک بڑے سوس پین میں پانی بھر کر اس کے اوپر رکھ کر گرم کریں۔  
دودھ کی تھوڑا مقدار ڈال کر مکسچر کو گاڑھا کریں جب ہموار پیسٹ تیار ہو جائے تو دودھ کی بقیہ مقدار ڈال کر مکس کریں اور آمیزے کے گاڑھا ہونے تک تقریباً دس منٹ تک پکائیں۔  
سوس پین کو چولہے سے اتار کر اس میں شکر، انڈے، اسٹرابیری پیوری، کریم، ڈیلا ایسنس ڈال کر الیکٹرک ایر سے پھینٹیں، آمیزہ جب ٹھنڈا ہو جائے تو ایرٹائٹ جار میں ڈال کر دس گھنٹوں کے لیے فریزر میں رکھیں۔ مزے دار اسٹرابیری آئس کریم تیار ہے سرد کریں۔

## پستہ قلفی

اجزا :	دودھ
چینی	ایک لیٹر
فلاوڈ	آدھا کپ
کارن فلور	ایک کپ
پستے (چوپ کر لیں)	ایک کھانے کا چمچ
پستہ ایسنس	آدھا کپ
	دو قطرے

دودھ کو پکا کر گاڑھا کر لیں۔ اس میں چینی، کارن فلور علیحدہ دودھ میں مکس کر کے ڈالیں۔ فلاوڈ بھی ڈال دیں۔ اچھی طرح مکس کریں اور چولہا بند کر دیں ٹھنڈا کر لیں۔ پستہ اور پستہ ایسنس بھی ڈال کر قلفی کے سولڈ میں جمادیں۔

## مینگو قلفی

اجزا :	آم کا گودا
دودھ	دو کپ
کنڈینسڈ ملک	ایک لیٹر
کھویا	آدھا کپ

دودھ پکا کر تین پاؤ کر لیں بلینڈر میں دودھ، آم کا گودا، کھویا اور کنڈینسڈ ملک ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کر لیں اور قلفی کے سانچوں میں ڈال کر جمائے رکھ دیں۔ فالوڈ کے ساتھ سرو کریں۔

## فج چاکلیٹ آئس کریم

اجزا :	دودھ
شکر	دودھ
کریم	تین کپ
کنڈینسڈ ملک	آدھا کپ
انڈے (پھینٹ لیں)	دو عدد
کافی	ایک چائے کا چمچ
کوکو پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے

## چاکلیٹ (چوپ کر لیں) ایک کپ

ایک کھانے کا چمچ

دودھ کو پکائیں اور اس میں انڈے ڈالیں متواتر چمچے چلاتے رہیں کہ انڈے کے چمچے نہ بنیں خشک دودھ بھی تھوڑے پانی میں مکس کر کے ڈالیں۔ ابال آنے پر چولہا بند کر دیں۔ کافی اور کوکوپاؤڈر بھی مکس کر دیں۔ ایک ویسپی میں پانی گرم کریں اس پر دوسرا پالہ رکھیں اس میں چاکلیٹ اور مکھن ڈال کر چاکلیٹ ملیٹ کریں۔

چاکلیٹ ملیٹ ہو جائے تو کریم مکس کریں بلینڈر میں دودھ کا مکسچر بلینڈ کریں اور کسی پیالے میں نکال لیں۔ چاکلیٹ کریم، کنڈینسڈ ملک اور دودھ کا مکسچر مکس کر کے فریزر میں آدھا گھنٹہ رکھیں۔ تھوڑی دیر بعد نکال کر پھینٹیں۔ یہ ہی عمل دوبارہ دہرائیں۔ ایرٹائٹ باکس میں ڈال کر جمائے رکھ دیں۔

## پی نٹ آئس کریم

اجزا :	انڈے
شکر	دو عدد
پی نٹ بیٹر	آدھا کپ
کریم	آدھا کپ
دودھ (ابال کر ٹھنڈا کر لیں)	ڈیرھ کپ
ترکیب :	

ایک پیالے میں انڈے اور شکر ڈال کر اتنی دیر تک پھینٹیں کہ خوب جھاگ دار آمیزہ تیار ہو جائے۔ اس میں پی نٹ بیٹر ڈال کر دوبارہ مکس ہو جانے تک پھینٹیں۔ کریم، دودھ ڈال کر بیٹر سے جھاگ دار ہونے تک پھینٹیں۔

فریزر میں دو گھنٹے ایرٹائٹ جار میں ڈھک کر رکھنے کے بعد نکال کر دوبارہ پھینٹیں اور بارہ گھنٹوں کے لیے رکھ دیں۔ جم جائے تو مونگ پھلیوں سے گارنش کر کے سرو کریں۔



عمود بار فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔



ذوالقرنین

شعبہ ادبیات

قتیل سحر... ملتان

س : شب کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی میں؟  
کہ صبح امید نے آ کر مجھے جگایا!  
ج : پھر بھی آپ سوتی رہیں علی الصبح دوپہر تک۔  
شمعونہ رحمن... پیرکوٹ جھنگ

س : ذوالقرنین بھیلہ آئیڈیل اگر چکنا چور ہو جائے تو کیا کیا جائے؟  
ج : یہ تو بعد کی بات ہے ویسے یہ ”آئیڈیل“ ہوتا کیسا ہے اور ہوتا کیا ہے؟  
رضوانہ کلثوم... چیچہ وطنی

س : ذوقی بھیا! یہ بتائیں کہ بیوی اپنی عمر اور میاں اپنی تنخواہ چھپاتے ہیں۔ لیکن بچے کیا چھپاتے ہیں؟  
ج : ان دونوں کے جھوٹ۔

ناصرہ مقصود... کراچی

س : کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی شدہ خود کشتی کیا وجہ ہے؟  
ج : کنواروں کو کچھ نہ کہو، جنہیں تم جیسے لوگوں نے ابھی تک گھر بٹھایا ہوا ہے۔

نازی حنانا... لاہور

س : نین بھیا! کسی نے کہا محبت روگ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا محبت سوگ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا محبت شام ہوتی ہے۔ کسی نے کہا محبت رات ہوتی ہے؟  
آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟  
ج : پتا نہیں آپ ”کسی“ کی باتوں میں کیسے آ گئیں۔ سہراں میں کسی کی باتوں میں نہیں آتا ہوں۔

ناہید عباس... کراچی

س : شعر کا جواب شعر میں دیں؟  
ع  
میں کسی کے دست طلب میں ہوں تو کسی کے حرف دعا میں ہے  
میں نصیب ہوں کسی اور کا مجھے مانگتا کوئی اور ہے!  
ج :

برہائی خوش نصیب ہے تو  
برہائی بد نصیب ہے تو!  
یہ شعر نہیں جواب ہے۔

رخسانہ جمیل... شیخوپورہ

س : وہ دیکھو اک پیڑ پہ تو تاملینا سے کچھ کہتا ہے؟  
ج : تو نے سے دوبارہ کہلو او میں ذرا اسے ٹیپ کر

لوں پھر سن کر جواب دوں گا۔

مس خدیجہ کوثر... کمالیہ

س : عورت کا انتخاب زیادہ مشکل ہے یا خروڑے کا؟

ج : عورت کے بارے میں سوچ سمجھ کر کچھ کہا کرو اور گھٹیا مقابلے سے پرہیز کرو مس۔

فوزیہ نذیر... سوہدرہ

س : ذوالقرنین! آپ سے ایک بہت ضروری بات پوچھنی ہے اور جواب پوری ایمانداری سے دینا ہے۔ آپ کو بہت سے خطوط آتے ہیں جن میں آپ کو اکثر نین بھائی، ذوقی بھائی یا پھر ”فرانی پین“ کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ تو کیا آپ کو غصہ نہیں آتا۔ کیونکہ مردوں کا غصہ تو بہت مشہور ہے کہ ادھر مزاج کے خلاف کوئی بات ہوئی نہیں۔ ابھی ادھر جناب شروع ہو گئے۔ کیوں نہ ہوں جی آخر مرد کی ”انا“ بھی کوئی چیز ہے۔ بتائیے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے جواب دیجئے گا یہ نہ ہو آپ اپنا ہی غصہ نارمل کرنے میں بڑی ہو جائیں؟

ج : یہ کالم انا کا مظاہرہ کرنے کا نہیں اس لیے کوئی پابندی نہیں اگر کوئی اور سوال اخلاقی حد میں کیا جائے تو پھر آپ کو بلا وجہ اشتعال دلانے کی ضرورت نہیں۔ ناکامی ہوگی۔

تمینہ رحمان... پشاور

س : لوگوں کو اپنی اوقات کب یاد آتی ہے بھیا؟  
ج : جب گھڑی دیکھتے ہیں۔

منزہ رشید... فیصل آباد

س : تم اتنا جو مسکرا رہے ہو کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو؟

ج : تمہیں بتا چل گیا۔

طاہرہ نسیم... میانوالی

س : بھائی جی! تاجر بھی خون چوستا ہے اور چھتر بھی

تاجر موٹا ہو جاتا ہے، چھتر موٹا کیوں نہیں ہوتا؟  
ج : چھتر صرف اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ جبکہ تاجر تاجاڑز طور پر خون چوستا ہے۔

انشی حسنا... کمالیہ

س : اگر لڑکی روٹھ کر میکے سے سرال میں آجائے تو؟

ج : سرال والوں کے مزے، بغیر کسی خرچے کے کام ہو جائے گا۔

سیکنہ تبسم... گوجرانوالہ

س : بھیا! پاؤں کی لغزش اور زبان کی لغزش میں کیا فرق ہے؟

ج : زبان کی لغزش دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جبکہ پاؤں کی لغزش سے خود کا نقصان ہوتا ہے۔

عظمیٰ رانی... سیالکوٹ

س : بعض لوگ دھوکا دے کر مسکراتے ہیں۔ بعض دھوکا کھا کر بتائیے جیت کس کی ہوتی ہے؟

ج : ظاہری بات دھوکا کھا کر مسکراتے والے کی کم از کم ہماری نظروں میں۔

وائے خان... موڑا یمن آباد

س : ذوقی بھیا! یہاں تو بہت گرمی ہے۔ کراچی کا موسم کیسا ہے؟

ج : اب تو ہم برسات کا مزالوٹ رہے ہیں۔

رومینہ سراج... کراچی

س : ذوالقرنین بھیا! سنا ہے عش دماغ کا خلل ہے کیا واقعی؟

ج : صرف سنا ہے یا؟

فرزانہ بیگ... راولپنڈی

س : کہتے ہیں کہ دلہن وہی جو پیا من بھلے یہ کیوں؟  
ج : مردوں کا معاشرہ ہے نا؟

☆ ☆



صبا افضل بٹ۔ انیتار خورد

السلام علیکم! خوش رہیں آباد رہیں۔ کرن ڈائجسٹ اسی طرح ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ آمین۔

میں کافی عرصے سے کرن ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور مجھ سے بھی پہلے میری امی اور بہن کرن خواتین اور شعاع پڑھتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی آپ کی بزم میں شرکت نہیں کی اور اب یہ جرات میں نے دکھائی ہے۔ خط لکھنے کا تو کئی بار خیال آیا لیکن اس وجہ سے لکھ نہیں پائی کہ کہیں خط بھیجنے کی تاریخ گزر نہ گئی ہو کیونکہ کرن ڈائجسٹ ہمارے ہاں تقریباً 14 تاریخ سے 18 تاریخ تک آتا ہے اسے پڑھنے میں بھی ایک دو دن لگتے ہیں اسی لیے کبھی ہمت نہیں ہوتی لیکن اب یہ ہمت کر رہی لی سب سے پہلے تو میں یہی پوچھوں گی آپ سے کہ خط بھیجنے کی آخری تاریخ کون سی ہے۔ پلیز ضرور بتائیے گا تاکہ آئندہ بھی میں کرن میں شرکت کر سکوں۔ کرن میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں اس لیے میں بہت خوش اور پر جوش ہوں۔ میرے خیال میں جس طرح آسمان کو خوب صورت اور دلکش بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے چھوٹے بڑے 'مدھم' روشن اور چمکدار ستارے آسمان پر بکھیر دیے ہیں اسی طرح کرن ڈائجسٹ میں بھی نئے اور پرانے اور چمک ڈائجسٹ کی جان رائٹرز بکھرے پڑے ہیں جو ڈائجسٹ کو شاندار بنانے میں معاون ہیں۔

سب سے پہلے تو سرورق بہت ہی خوب صورت لگا بلکہ رنگ سے مزین ماڈل کے کپڑے بہت اچھے لگ رہے تھے اور بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں ہلکے رنگ آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ حمد و نعت ہر لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں یہ ناچیز ان کی کیا تعریف کرے گی۔ انڈیوز اچھے تھے "مجھ سے سیلے" میں کتنی جدون سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بھئی ان کی اور میری ایک قدر مشترک ہے جاگتی آنکھوں سے شیخ چلی والے خواب دیکھنا۔

افسانے بھی اچھے تھے۔ بس "میرے مہراں" میں

مجھے حوریہ پر بہت غصہ آیا، کیا اس کی عقل گھاس چرنے لگی تھی جو علیحدہ کہتی رہی، سو وہ مانتی گئی۔ حوریہ کو تو اس وقت ہی سمجھ جانا چاہیے تھا جب وہ کہتی ہے کہ اتنا مزا آ رہا تھا تم نے بات کیوں نہیں کی "بڑی صاحب" رابعہ افتخار کا یہ ناول بہت ہی شاندار تھا۔ شروع میں تھوڑی سی الجھن ہوئی لیکن جب کہانی آگے بڑھتی گئی ساری الجھن دور ہو گئی۔

"خضر راہ طے کوئی" صاعقہ امین کی اچھی کاوش تھی لیکن مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ نازو، زلفی، سمیرا اور حمیرا ان چار کرداروں نے غلط قدم اٹھائے اور آخر میں ان کے ساتھ سب اچھا کر دیا مگر ایک کردار جس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا وہ خادم حسین تھا۔ اس نے تو نازو کے ساتھ بھلائی کی اسے اپنا لیا لیکن خادم حسین کی بے بسی کی موت سے بہت دکھ ہوا۔ "انیلا کرن" کا مکمل ناول سپر ہٹ رہا۔ حارث کا سارہ کی کیرکٹرنا ڈاکٹر بلال کا اسے زندگی کے مقصد کی طرف دھیان دلانا اور زین العابدین کا اسے ایک مکمل شخصیت بنانا۔ سب بہت شاندار تھا۔ اب ناول کی باری آتی ہے تو "نوزیہ یا سمین" کو ہی کہوں گی کہ ان کا ناول سستی کا شکار ہے۔ نوزیہ کے متعلق تو بہت کم لکھتی ہیں اس ناول کی 25 قسطیں گزر چکی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ کہانی ابھی تک وہیں ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ پلیز ناول کی رفتار تھوڑی سی بڑھا دیں نوزیہ۔

"در دل" بہت اچھی کہانی ہے پچھلی قسط میں دلاور شاہ اور علیزے کے نکاح کا پڑھ کر بے انتہا حیرت ہوئی کہ ایسا کب ہوا لیکن اس قسط میں اس راز سے جس طرح پردہ اٹھایا گیا علیزے سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ دلاور شاہ کوئی اسمارٹ سا بندہ ہو گا اور منصور حسین کوئی ایویں سا بندہ ہو گا لیکن جب اس راز سے پردہ اٹھایا گیا کہ منصور ہی دلاور ہے تو تھوڑا سا عجیب لگا کہ کہانیاں وہ اسمارٹ سا دلاور شاہ اور کہاں صحت مند اور فولادی آدمی منصور دلاور شاہ کا ہر روپ ہی مکمل اور بہت شاندار ہے۔ اب نبیلہ سے گزارش ہے کہ علیزے اور

زری کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا یہ تینوں کردار مجھے بہت پسند ہیں۔ "کرن کرن خوشبو" بہت اچھا سلسلہ ہے جس میں قارئین اتنے اچھے انتخابات بھیجتی ہیں جس سے علم و آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

"حسن و صحت" بہت مفید سلسلہ ہے۔ اسی طرح "یادوں کے درختے" مجھے یہ شعر پسند ہے، "سکراتی کرنیں، کرن کا دسترخوان، نپلے پہ دہلا" اور "نارے میرے نام" یہ سب سلسلے بہت اچھے اور شاندار ہیں۔ یعنی کرن ہر لحاظ سے اچھا اور خوب صورت ہے۔ ناول "اورے پیا" پر تبصرے پڑھ کر بہت اچھا لگا میں بھی تبصرہ بھیجنا چاہتی تھی لیکن وہی بات مجھے تاریخ کا اندازہ نہیں تھا اس لیے نہیں بھیج سکی۔ پلیز میرا خط ضرور شامل کیجیے گا یہ میرا پہلا خط ہے مجھے ناامید نا کیجیے گا۔

نوزیہ منظور۔ بہاول گڑھ کھوڑکا

امید ہے ایمان کی سلامتی کے ساتھ خیریت سے ہوں گی۔

اس ادب کی کہکشاں پر ستاروں کی نعمتاتی روشنی میں آس ویاس کے ہنگاموں پر سوار، کہیں بہت دور سے آنے والی مسافر اس کہکشاں کی سیر کرنے کی اجازت چاہتی ہے۔ اس مسافر کی آنکھوں میں اس کہکشاں کو دیکھنے کا ہلکورے لیتا شوق اور اس کے قدموں سے لپٹی تھکن کا اندازہ کرتے ہوئے مرحبا ضرور کہیں گی۔

پہلی مرتبہ کسی ادب کی کہکشاں پر تبصرہ کر رہی ہوں۔ جس کا خود میرے قلم کو بھی علم نہیں کہ اس نے جو الفاظ صفحات پر بکھیرے ہیں وہ پوسٹ بھی ہو جائیں گے یا نہیں۔

رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلا کام لسٹ دیکھنے کا کرتی ہوں کہ اس مینے کون کون سی مصنفہ جلوہ افروز ہوئی ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلے نوزیہ یا سمین کا "دست کوزہ گر" پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد "در دل" کو کیونکہ ہم سب کو لیگز کے درمیان سب سے زیادہ زیر بحث یہی دو ناول ہوتے ہیں۔ نبیلہ جی! مجھے کبھی بڑی حیرت ہوتی ہے کہ آپ ہر کردار کو کتنے انصاف اور کتنی وضاحت سے سامنے لاتی ہیں۔ ناول میں تیزی آرہی ہے اور اس قسط نے تو حیران کر دیا۔ اسی طرح پر جوش رہیں۔ اسی طرح حوصلہ مند رہیں۔ اپنی آخری سانس تک۔ (آمین) کیونکہ مجھے بخوبی

اندازہ ہے کہ لکھنا کتنا حوصلہ مانگتا ہے۔ "دست کوزہ گر" نے شان دار موڑ لیا ہے۔ لیکن ناچیز کا ایک مشورہ ہے کہ الیان اور رومیلا کی غلط فہمی کو اتنا لمبا بھی مت کیجیے گا۔ جتنی نمل اور خرم کی غلط فہمی، دیوار چین، جتنی ہو چکی ہے۔ پوری دلچسپی سے ناول لکھا جا رہا ہے۔ اسی طرح جاری رکھیے۔ سمیرا عثمان اور صائمہ حیدر غالباً "نئی لکھاری" ہیں۔ بہت سوٹ لکھا۔ آپ کی ذہنی ترقی کے لیے دل سے دعا گو ہوں، ہمت مت ہاریے گا۔

"رابعہ افتخار" مجھے آپ سے صرف ایک بات پوچھنی ہے؟ آپ کے وسیع ذہن نے کتنی آرا جیسا وسیع النظر اور شان دار شاہکار تخلیق کیا ہے تو آپ خود کتنی بااخلاق اور تہذیب سے گندھی ہوئی لڑکی ہوں گی؟ میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ "انیلا کرن" کا مکمل ناول واقعی ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ سارہ کی ذہنی حالت کو مکمل باریکیوں کے ساتھ اجاگر کیا گیا۔ نیلم جیسے کردار مجھے ہمیشہ بور کرتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں تو ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ناول میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔

اب آتی ہوں قلم اٹھائے جانے کی اصل وجہ کی طرف۔ وہ ہیں ضواریہ ساحر صاحبہ۔ "میں انتہائی حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ مجھے بہت سی رائٹرز کے اچھوتے خیال پر مبنی ناولز پسند آتے ہیں۔ لیکن صرف دو ناول مجھے تھوڑی دیر کے لیے ساکت بہت دیر تک حیران کرنے پر مجبور کر گئے۔ ایک نمرو احمد کا ناول "قراقرم کا تاج محل" اور دوسرا ضواریہ کا "مقید خاک" یقین کریں ضواریہ اتنے زبردست اور عام ڈگر سے ہٹ کر لکھے گئے ناول پر میں ایسے خوش ہوئی جیسے یہ میری تخلیق ہو۔ آپ واقعی ساحرہ ہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کا افسانہ "ڈسٹ بن" پڑھا ہے اور تھوڑی دیر بعد لکھنے کی واقعی ہمت بھی کر لی ہے۔ اسی طرح ناولز تخلیق کرتی رہیں۔ بالکل اسی طرح ادبی دنیا میں نا صرف زندہ رہیں بلکہ اس کہکشاں کے روشن ستارہ بن کر چمکتی رہیں ہو سکتا ہے کوئی آپ کی ایمان کی سلامتی کی دعائیں آپ کے خوش رہنے کی دعائیں رات کی تاریکیوں میں کرتا ہو۔

"کرن کرن خوشبو" میرے پورے مینے میں ساتھ دیتا ہے، کیونکہ میں ہر لیکچر میں پہلے پانچ منٹ بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے صرف کرتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے مواد کی کبھی پریشانی نہیں رہتی۔ کیونکہ شعاع محمود



موادی اتنا زبردست یکجا کرتی ہیں۔

”مجھ سے ملیے“ میں اپنی جدوں کے سچائی پر مبنی جوابات پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اپنی جی! بچوں کے لیے اتنی حساس مت ہوا کریں آپ سے بھی سترگنا زیادہ محبت کرنے والی ذات آپ اور آپ کے بچوں سے باخبر ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

تبصرہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے۔ (نمل کی غلط فہمی کی طرح) اگرچہ میں اس رسالے کے کسی صفحے پر تو کیا کسی لائن پر بھی اپنا حق نہیں سمجھتی، لیکن میری خواہش ہے کہ میرا تبصرہ پورا شائع کیا جائے۔

کرن فاطمہ۔ قصور

اس دفعہ کرن کی تشریف آوری بارہ کو ہوئی، شکر ہے اتنا انتظار نہیں کروایا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو دل نے کہا یا ایسا ہی سرورق ہونا چاہیے۔ پیاری ماڈل ٹھنڈے ٹھنڈے گلر کمبینیشن اور پریکٹش بیک گراؤنڈ کے ساتھ اور کرن کتاب بھی کسی تعریف کے محتاج نہیں ہوتی۔ اتنی اچھی انفارمیشن ملتی ہے۔ رسالے کے ساتھ اب آتے ہیں بھرے کی طرف۔

شروعات ”دست کوزہ گر“ اور ”در دل“ سے ہی کروں، کیونکہ باقی میں پڑھ نہیں پاتی۔ دونوں ناولز کے حالات تو بے حد سنگین چل رہے ہیں۔

”دست کوزہ گر“ میں تو رو میلہ بے چاری کے ستارے گردش میں ہیں دل برا ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے بچپن میں ماں کی ٹھنڈی چھانٹ لی اور نہ ہی اب تک اپنے باپ اور بھائی کی شفقت اور توجہ بھائی تو اتنا برا ہے کہ اس کی گندی چال کی بدولت اب اسے سسرال میں جوتی کی نوک پر رکھا جائے گا۔ جس کا آغاز تو اب ہو ہی چکا ہے۔ ابھی تو ان کی کھلی نفرت اور ابرار کی گھٹیا چال سے پردہ فاش ہونا ہے جو اسے ذلت کی اتھاہ گمراہیوں میں دھکیل دے گا۔ بس خدا ہی اسے اپنی پناہ میں لے۔ ادھر نمل اور خرم تیز تلواریں لیے میدان جنگ میں لڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تکرار ہمیشہ سے ہی محفوظ کن ہوتی ہے۔ اب کسر وہ گئی تھی۔ بے چاری زویہ کے ان کے ستم کا نشانہ بننے کی سودہ بھی پوری ہو گئی۔ شائستہ خالہ کی بدروح سے جان چھوٹی تو خرم جن بن کر حاضر ہو گیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ بے چاری کے جذبات کس حد تک

مخروج ہوتے ہیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ یہ کہ اینڈ پر زویہ اور خرم کی اور نمل اور کینڈا والے گلفام سے نمل کی جس سے ملاقات ہوئی تھی، سے کپل بنے گا اور ابھی تک سبیل کا ہیرو دکھائی نہیں دیا۔ خیر آگے چل کر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ اب شائستہ خالہ کا راز کھول دینا چاہیے۔

اب سفر کیا جائے ”در دل“ کی جانب تو یہ سفر بہت تکلیف دہ اور دل خراش تھا۔ اتنا تو لاشعور میں تھا کہ منصور حسین کا کوئی نہ کوئی علیزے پر فارنگ اور اچانک ڈراما بننے تک کوئی بھید ہے پر دل اور کا منصور حسین ہونا غیر متوقع تھا۔ دل اور کا خوب صورت ایچ میری نظروں میں تو تباہ ہو گیا ہے۔ وہ تو شیر کی کھال میں بھیڑیا نکلا؟ چاہے وقار آفندی نے اس کے ساتھ کافی زیادتی اور ظلم کیا ہو، لیکن اس میں معصوم علیزے کی کیا خطا۔ بدلہ لینے والا کبھی اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اگر اللہ انسان کی خطاؤں اور گناہوں کا حساب لینے پر آئے تو بندہ کی ذات کہاں ہے؟ اس کا گزارہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟ اور بدلہ لینے والی اللہ پاک کی ذات ہے۔ انسان کی کیا اوقات کہ وہ کسی سے انتقام لے اور اپنی جھوٹی ضد اور انا کی تسکین کرے؟ اسے بدلہ روز قیامت اللہ کے سپرد کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ دل اور کا شمار اللہ کے پسندیدہ بندوں میں ہوتا۔ اللہ اسے دنیا میں بھی اچھا صلہ دیتا اور آخرت میں بھی بے شمار انعام یہ زندگی یہ دنیا تو فانی ہے یہ ختم ہو جاتی ہے، لیکن اس کے بعد کی زندگی تو فانی ہے تو انسان کو اتنا ضرور سوچنا چاہیے کہ دنیاوی فائدہ زیادہ ہے یا آخرت کا نفع؟ دل اور اک عام اور کمزور انسان ثابت ہوا جو انسانیت کی معراج پر پہنچ نہ سکا۔ علیزے کی طرف سے دل دکھ سے بھرپور ہے۔ دل کانپ اٹھتا ہے کسی کا مقدر اتنا بھیاں نہ ہو کہ پہلے ان گنت خوشیوں کی برسات ہو اور بعد میں طویل غموں کے صحرا! شاید اسے ہی قسمت کہتے ہیں۔ پر اللہ جو بھی کرتا ہے اسی میں انسان کی رضا ہونی چاہیے اور اس میں ہی اس کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ زری کو معلوم نہیں درد کی کتنی مسافتیں طے کرنی پڑیں؟ نبیل کا فیصلہ بہترین تھا۔ مومنہ بی بی کی بھی داستان پہلے کی۔ خیر بہت اچھی امیدیں ہیں ناول کے ساتھ۔ تبصرہ کافی طوالت کا شکار ہو گیا۔ سواب ہم چلتے ہیں کرن اور اس سے وابستہ افراد کے لیے نیک تمنائوں کے ساتھ۔ پلیز قارئین مجھے اپنی سچی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، فی امان

اللہ۔

صفیہ صبا سدرہ سعدیہ۔ قصور

طویل انتظار کے بعد بارہ کو کرن ہاتھ میں آیا ٹائٹل گرل خوب صورت لباس اور انداز میں اچھی لگی۔ ”نامے میرے نام“ میں اپنا نام دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں اپنی بزم میں خوش آمدید کہا اور اب دوسری بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں حب سے پہلے نبیلہ آلی کا ناول ”در دل“ کی بات ہو جائے۔ واہ نبیلہ جی آپ کے قلم نے تو کمال کر دیا۔ اس دفعہ تو بڑی زبردست قسط تھی۔ آذر پر ترس آیا اور دل اور شاہ کو جو کرتا ہے وہ صحیح کرتا ہے اور وقار آفندی جیسے چہرے بہت ملمسار اور ہمدرد نظر آنے والے نہ جانے کتنے خولوں میں بند ہوتے ہیں۔ اس خول کو آخر کار ٹوٹنا ہی تھا اور انسپکٹر شہناز جیسے ایمان دار آفیسر اس دور میں ناپید ہو چکے ہیں۔ نبیل کا فیصلہ بہت پسند آیا۔ اب دیکھیں زری پر کیا ہوتی ہے۔ پلیز آپ ناول کے صفحات کو بڑھا دیں۔ اس کے بعد چھلانگ لگائی ”دست کوزہ گر“ کے پاس الیان کارویہ اور غصہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن شگفتہ غفار کا رویہ اچھا نہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ وہ ماں ہے اور ہر ماں اپنے بچوں کے لیے پریشان ہو جاتی ہے۔ لیکن ضرب المثل ہے کہ مشکل وقت میں گدھے کو بھی باپ کہنا پڑتا ہے۔ خرم کا خاموشی سے آجائو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے اور یہ جو سمیر ہے یہ ہمیں انتہائی زہر لگتا ہے۔

”خضر راہ ملے کوئی“ اچھی کاوش تھی۔ لیکن خادم حسین کا حرام موت مرنے کا دکھ ہوا کہ جس نے اتنے کڑے اور مشکل وقت میں ناز کو اپنایا اور ساری زندگی محنت سے حلال روزی کما کے کھائی اور موت اس کو حرام آئی۔ آپی ہم نے معاشرے کی اصلاح کرنی ہے، خود کشی حرام موت ہے، اگر اس کی بجائے وہ ہارٹ اٹیک سے مر جاتا تو اچھا تھا۔ ارسلان اور لائبہ کی محبت پر رشک آیا کہ انہوں نے ایسے نازک موڑ پر بھی سمیرا کے لیے اپنی محبت قربان کر دی، لیکن اللہ اجر ضرور دیتا ہے۔ اس اجر کے بدلے ان کی محبت ان کی جھولی میں آئی۔

افسانوں میں ”میرے مہمان“ بہت پسند آیا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ”بڑی صاحب“ بھی دل کو چھو گیا۔ یہ بھی اللہ کی نظر کرم ہوتی ہے جو توبہ کی توفیق دیتا ہے، کیتی

کا کردار جان دار تھا۔ آپ انٹرویو میں ”شاہد خان آفریدی“ کو لے کر آئیں اور کیا آپ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کا انٹرویو نہیں شائع کر سکتے۔ ”یادوں کے درختے“ میں حسن نقوی کی نظم اور نوشی گیلائی اور فرحت عباس شاہ کی غزل پسند آئی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس پرچے کو دن و گنی رات چگنی ترقی دے اور جو لوگ اس کے لیے کام کرتے ہیں اللہ ان کو لمبی اور صحت والی زندگی دے۔ (آمین)

عفیہ مظفر آفرام مظفر۔ ضلع گجرات

چند رہ جو کر کرن ہمارے گھر میں جلوہ افروز ہوا۔ لائٹ کلر کی فراک زیب تن کیے ٹائٹل گرل کافی پرکشش لگ رہی تھی۔ حمد و نعمت سے مستفیض ہونے کے بعد جانیجے در دل ”پر۔ دل اور شاہ کا یہ روپ ہمارے لیے ناقابل قبول ہے۔ وقار آفندی کے کیے کی سزا اب علیزے آفندی کو بھگتنی پڑے گی، لیکن ہم علیزے کے ساتھ کوئی بھی نا انصافی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ نبیلہ آلی امید ہے کہ آپ علیزے کے کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کریں گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے زریں ملک کا حویلی والوں سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ مٹی کے کرن میں ”آسیہ آفندی“ زری کے نام پہ ٹھکنی تھیں۔ ان کے اسی رویے سے میں نے یہ اخذ کیا۔ بہر حال ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ ”دست کوزہ گر“ یہ نمل اس طرح کی حرکتیں کر کے خرم سے بدلہ تو لے رہی ہے۔ مگر اس میں اس کی بھی بدنامی ہے۔ سمیر کوئی اچھا لڑکا نہیں۔ یقیناً ”وہ نمل کی توجہ کو مریج سالالگا کے یونیورسٹی میں نشر کرے گا۔ جس سے نمل کا کریکٹر بھی متاثر ہوگا۔ لڑکیوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔ اب دیکھتے ہیں خرم، نمل کے وار کا کیسا جواب دیتا ہے۔ رو میلہ بہت معصوم ہے۔ بے چاری کو اپنے بھائی کے کیے کا بھگتانا بھگتنا پڑے گا۔

نمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ خصوصاً ”خضر راہ ملے کوئی“ دل کو چھو گیا۔ اس سے پہلے مٹی کے شمارے میں ہمارا خط شائع ہوا تھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ ہم نے پہلی دفعہ خط بھیجا اور وہ شائع بھی ہو گیا۔ امیزنگ خوشی اس قدر تھی کہ ابو کو فرانس فون کر ڈالا۔ چمکتے ہوئے انہیں خط کے متعلق آگاہ کیا۔ پڑھ کے خوش ہوئے۔

آج اگر دوبارہ میں خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں تو صرف اور صرف ابو کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے۔ ورنہ تو



میرے اس اقدام پر کچھ خیر خواہوں نے اچھی خاصی چٹکڑیاں چھوڑی تھیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اپنے گاؤں سے واحد میں نے ہی اس ڈائجسٹ میں خط لکھا جو شائع بھی ہو گیا۔ بہت شکریہ کرن ڈائجسٹ۔ میں پارس چوہدری سے متفق ہوں۔ آپ کو اپنے ریڈرز کے خطوط کے جوابات ضرور دینے چاہئیں۔ اس سے واقعی ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اب دیکھیں ایک انسان آپ سے محبت کا اظہار کرتا ہے جواباً آپ خاموش رہتے ہیں۔ کچھ نہیں کہتے۔ اس سے وہ انسان یقیناً ہرٹ ہو گا بے شک آپ اپنے ریڈرز سے محبت کرتے ہیں۔ مگر جب تک اظہار نہیں ہو گا تو یقیناً وہ ایک تشنگی محسوس کریں گے۔ اظہار کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ امید ہے مدیرہ آنٹی آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔ کرن میں میرا خط شائع ہونا کم از کم میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ آخر میں آپ سب کے لیے دعائیں اور پیار۔ (فی امان اللہ)

انیتا اعوان، حنیفہ اعوان، مہوش اعوان۔ اٹک

جون کی پندرہ تاریخ کو گری نے خوب تنگ کیا ہوا تھا۔ جب کرن ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر گھر آیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ شیفون کے ہلکے گلر میں ملبوس ماڈل بہت اچھی لگی۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے دل و روح کو سکون حاصل ہوا۔

”ٹٹا عسکری“ سے ملاقات اچھی رہی۔ ”اعجاز وارث“ اگرچہ ان کی آواز کبھی FM پہ سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی ان کا انٹرویو شوق سے پڑھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ FM-101 اسلام آباد کے آر جے کا انٹرویو شائع کریں۔ خصوصاً ”عدیل شاہد“ رضوان علی احمد، زخرف خان، صدف رانی کا انٹرویو جمع تصویر شامل کریں پلیز۔

نبیلہ آبی ایک دم سارے دھماکے کر رہی ہیں۔ ویلڈن نبیلہ جی۔ آپ کے لکھنے کا انداز ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ جو بھی کریں آپ کی مرضی، لیکن پلیز زری کو دل اور شاہ کا ہی ہونا چاہیے۔ اس بار ہمیں ”درد دل“ کی قسط بہت اچھی لگی۔ نبیلہ جی آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں کہ آپ نے اتنا اچھا ناول ہمارے لیے لکھا۔ کیپ اٹ اپ۔ اس مرتبہ سارے افسانے بیسٹ تھے۔ مگر ہمیں ضواریہ ساحر کا

افسانہ ”ڈسٹ بن“ بہت اچھا لگا۔ انیلا کرن کا مکمل ناول ”کبھی روشنی کبھی تیرگی“ بہت بہت اچھا تھا۔ ویلڈن انیلا جی۔ آپ لکھتی رہا کریں۔ کرن کے توسط سے نایاب آپ کو سلام دینا چاہوں گی۔

نایاب جی آپ کا ناول ”اورے پا“ کبھی نہ بھولنے والے ناولوں میں ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ نے اب گم نہیں ہونا۔ وقتاً فوقتاً ”کرن کو رونق بخشی رہے گا۔ آپ ہماری فیورٹ لکھاریوں میں سے ہیں۔ فوزیہ یا سمین ”دست کوڑہ گر“ کو بہت خوب صورتی سے آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔ لیکن پلیز تھوڑی اسپید بڑھائیں۔

اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف۔ ”کرن کرن خوشبو“ ہمیشہ کی طرح ہمارے ارد گرد خوشبو بکھیر گیا۔ راحیلہ اور فوزیہ شمر کا انتخاب اچھا تھا۔ ”یادوں کے درتچے“ سے ذکیہ خان کی ڈائری میں تحریر ”اعتبار“ ساجد کی غزل پسند آئی اور فوراً ”سے پہلے ڈائری میں محفوظ کر لی۔ مجھے یہ شعر پسند ہے ”میں ہمیشہ کی طرح سارے شعر لاجواب تھے۔“ مسکراتی کر نہیں ”چہرے پر خوب صورت (آہم) مسکراہٹ لے آئیں۔“ ”نامے میرے نام“ میں سارے خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ خاص طور پر پارس چوہدری کا۔

آخر میں سب کو سلام اور خاص طور پر میری دوستوں راشدہ زبیر اور نجمہ زبیر خضرو کو پیار بھرا سلام قبول ہو۔ راشدہ جی آپ صرف کرن میں لکھنے کا سوچتی ہیں سب کبھی حقیقت میں انٹری مارو۔ پلیز آپ ہمارا خط ضرور شامل بیجیے گا اور جواب بھی ضرور دیجیے گا کہ آپ کو ہمارا تبصرہ کیسا لگا۔ آپ کی قیمتی آرا کی منتظر رہیں گے۔ اب اجازت دیں اللہ نگہبان۔

فوزیہ ثمرٹ۔۔۔ گجرات

سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میرے خط کو فہرست میں شامل کیا۔ پندرہ کو کرن ملا۔ ماڈل سے زیادہ اس کا لباس پسند آیا۔

”کبھی روشنی کبھی تیرگی“ اچھی تحریر تھی۔ سارے کردار مظالم۔۔۔ حارث کی موت نے بہت رلایا۔ اتنے اچھے کردار کو مرنا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے تو رائٹرز صاحبہ پہ پہلے ہی شک ہو گیا تھا۔ جب حارث نے کہا تھا زین اور میری پسند ایک ہے۔ مجھے لگا کہ زین ہی کہانی کا اصل ہیرو ہے۔ حارث کی حادثاتی موت کا بہت دکھ ہوا۔